بیسویں صدی
-/8/-

جلد ۲۵
نمبر ۴

سالانہ قیمت
خاص نمبر سمیت
پانچ ۵ روپے

ششماہی قیمت
تین ۳ روپے

ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپیہ سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں، جن کی قیمت ڈیڑھ روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی

سالنامہ "بیسویں صدی" دھلی

سالنامہ "بیسویں صدی" اپنی انفرادی رعنائیوں اور سحر طرازیوں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ملک کے چوٹی کے افسانہ نگاروں کے دامان پر در شاہکار افسانے، بلند پایہ ادباء و شعراء کے گراں قدر مقالے، شگفتہ نظمیں اور پُر کیف غزلیں اس شمارے کی زینت ہوں گی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سالنامہ "بیسویں صدی" اپنے ظاہری و باطنی محاسن کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہوگا۔ کیونکہ "بیسویں صدی" اپنے خاص نمبروں کی بدولت پہلے ہی اردو ادب میں شاندار ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔ "بیسویں صدی" کے عام نمبروں میں بھی اس قدر دلچسپ، پُر مغز اور بلند پایہ مضامین درج ہوتے ہیں کہ دیگر ادبی رسائل انہیں "بیسویں صدی" سے نقل کر کے دوبارہ شائع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ذیل کے سحر طراز ادباء نے کرم فرمائی سے کام لیتے ہوئے سالنامہ کے لئے مضامین ارسال فرمائے ہیں۔ جن قلمی معاونین نے اپنے رشحات گرامی ارسال نہیں فرمائے، اُن سے درخواست ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں مضامین بھیج کر ہمیں زیر بار احسان فرمائیں۔ سالنامہ کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ اسلئے مضامین بھیجنے میں مزید تاخیر سے کام نہ لیں۔

جناب پنڈت ہری چند اختر ایم اے، جناب مولانا سالک بی اے مدیر "انقلاب" لاہور، حضرت ایم۔ ایم اسلم، جناب پروفیسر پرشوتم لال ضیا ایم اے، جناب اصغر ملیح آبادی، جناب سالک الہاشمی بی اے، ایل ایل بی، جناب سہیل عظیم آبادی، جناب سلام مچھلی شہری، پروفیسر مس کرشنا کماری ایم اے، جناب ضیا فتح آبادی ایم اے، جناب محمد یونس احمر، جناب بالمکند عرش ملسیانی بی اے، جناب شمس مظفر پوری، جناب سردار جلیل احمد ایم اے، ایل ایل بی، جناب سعید امرت، جناب آراج کول، جناب نریش کمار شاد، جناب نند لال مظلوم کیتھلوی، جناب رام لال، جناب نازش پرتاب گڑھی، جناب قسمر ہاشمی، جناب برج موہن ناتھ کاچرو، محترمہ تبسم صبحی، جناب ایوب ناشاد ٹانکپوری، جناب ام امام مدیرہ "نئی کرن"، جناب دانش ممتاز کانپوری، جناب گلزار نسیم، جناب مظفر جلیلی۔

تیر و نشتر

از

خوشتر گرامی

انبالہ میں شرنارتھیوں نے مظاہرے کئے اور شکایت کی کہ ہم بھوکوں مر رہے ہیں اور وزیر پارٹیاں اڑا رہے ہیں

مظاہروں کے متعلق تو ہم کچھ نہیں کہتے لیکن یہ پارٹیوں کی شکایت فضول ہے۔ جس کا کام اُسی کو ساجے یا یوں کہو کہ یہ تقسیم کار کا معاملہ ہے آپ بھوک کے مرتے ہیں وہ پارٹیاں اُڑاتے رہیں۔ دونوں کام ایک شخص تو نہیں کر سکتا نا! اور پھر آپ جانئے یہ وزیر لوگ سب کے سب گاندھی بھگت ہیں۔ مہاتما جی نے اپنی زندگی میں اس قدر سخت برت رکھے کہ اب اُن کے بھگتوں کو بھوک کے مرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو جس قدر کھائیں تھوڑا ہے

(۲)

شرنارتھیوں کے محکمہ کے وزیر آنریبل مسٹر سکسینہ صاحب نے بڑے طمطراق سے فرمایا کہ ہند سرکار نے ایک ایک شرنارتھی کو آباد کرنے کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔

حضور وزیر صاحب! یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ آپ نے ذمہ داری لے رکھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا یہ معاملہ لینے تک ہی محدود رہے گا یا آپ اِن خانہ بربادوں کو کبھی کچھ دینے کی ضرورت پر بھی غور فرمائیں گے۔ آپ اور آپ کی ذمہ داری دونوں کی حیثیت بہت بڑی ہے، لیکن یہ حیثیت اور اہمیت ہمارے اوڑھنے بچھانے کے کام نہیں آسکتی۔ یا تو کچھ کیجئے ورنہ صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہمارا کام صرف یہ تھا کہ پہلے بڑے بڑے دعوے کریں کہ پاکستان ہماری لاشوں پر بنے گا۔ اس کے بعد پاکستان قبول کریں۔ اور بعض مصلحتوں کے پیش نظر پرشارتھیوں کو اچھی طرح تباہ کر کے اُن کے ساتھ کتوں کا سا سلوک کریں

(۳)

حکومت ہند کے وزیر خوراک شری یت جے رام داس دولت رام فرماتے ہیں کہ خوراک میں ملاوٹ کے باعث لوگوں کی صحت گر رہی ہے اور جو لوگ خوراک میں ملاوٹ کر کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں، وہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جی ہاں! گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن آپ ایسے گنا ہگاروں کے لئے مناسب قانون بنا کر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ کیا اس لئے کہ ایسے لوگوں کی پُشت پر برلا، ڈالمیا اور اسی قسم کے دیگر سرمایہ دار ہوتے ہیں اور اِس بنا پر اِن کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے خیال ہی سے آپ کی رُوح کانپ جاتی ہے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ کے ان دھارمک لیکچروں سے ملاوٹ بند ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اگر آپ اس سخن طرازی کی داد چاہتے ہیں تو ہم بھی عرض کئے دیتے ہیں کہ واہ پوجیہ پادجی مہاراج! دھنیہ ہو! کیا منوہر گیان دیا ہے آپ نے! ہری اوم تت ست! ہری اوم تت ست!!

(۴)

ایک پنجابی اخبار لکھتا ہے کہ حکومتِ ہند شرنارتھیوں کو بسانے کے دعوے کر رہی ہے اور پنجابی شرنارتھیوں کی ایک بہت بڑی تعداد صرف حکومت کی بے توجہی کی بدولت موت کے گھاٹ اُتر چکی ہے۔

ہماری رائے میں یہ شکایت بے جا ہے۔ حکومت نے صرف بسانے کا وعدہ کیا ہے۔ زندہ یا مردہ کی شرط نہیں لگائی۔ پس جو پنجابی شرنارتھی مر گئے ہیں، اُن کے بارے میں تو حکومت پورے وثوق اور ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتی ہے کہ ہم نے اُن کو آباد کر دیا ہے۔ آخر اُنہیں شمشان بھومی میں جگہ ملی کہ نہیں؟ پھر کیا کوئی اُن کو وہاں سے نکال سکتا ہے؟ وہ تو مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ خواہ مخواہ شور کیوں مچا رہے ہو؟

(۵)

ایک اخباری اطلاع کے مطابق سہارنپور کے حکام نے ڈھنڈورہ پٹوا کر نو وارد شرنارتھیوں کو سہارنپور سے نکل جانے کا حکم دیا ہے اور

ساتھ ہی تنبیہہ بھی کی ہے کہ حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں اِن لوگوں کو گرفتار کر کے قانونی کارروائی کی جائے گی۔

بہت خوب! بہت ہی خوب!! بس اِس کے سوا اور کیا کہا جائے کسی کے حق میں بُرا کلمہ منہ سے نہ نکالنا چاہیئے۔ لیکن یہ پوچھ لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ آیا پنجابی شرنارتھی ایسی سلوک کے مستحق ہیں؟ اگر یو۔پی کے بھیّے، مدراسی دراوڑ یا گجرات کے دھوتی پوش ---- پنجابیوں کی طرح تباہ ہوتے تو کیا اُن کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جاتا؟ لیکن پوچھیں کس سے؟ حکومت تو ہماری اپنی ہے نا! بالکل اپنی!!

(۶)

پٹنہ کے ایک ہندو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو روحانیت کے مروڑے اُٹھ رہے ہیں۔ تازہ ارشاد یہ ہے کہ مہاتما گاندھی، شاہ جارج کی شہزادی الزبتھ کے ہاں جنم لینے والے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کا یہ کشف درست ہو۔ اِس لئے داد کے طور پر ایک مصرع ہم بھی عرض کئے دیتے ہیں۔ سنئے آپ کے والدِ محترم ایک اخلاقی مجرم قیدی عورت کے بطن میں موجود ہیں۔ ہو سکے تو وارنٹ جاری کرا کے اُنہیں گرفتار کر لیجئے۔ ورنہ خاندان کے نام کو بٹہ لگ جائے گا اور اگر آپ کے گھرانے میں پیدا ہونے والوں کے ناکیں بھی ہوتی ہوں تو شاید یہ نیا بچہ نکٹا ہی پیدا ہو۔

(۷)

حکومت ہند کے پریس ایڈوائزر صاحب نے بمبئی میں ایک بیان کے دوران میں فرمایا کہ غیر ملکی نامہ نگار حیدر آباد کے متعلق واقعات کو توڑ موڑ کر غلط پیرایہ میں پیش کر رہے ہیں۔

اجی حضرت! یہ غیر ملکی غیر ملکی کی رٹ کب تک لگی رہے گی۔ آخر آپ کے دماغ سے غلامی کے خیالات نکل کیوں نہیں سکتے؟ قانون موجود ہے۔ اِس قسم کے نامہ نگاروں کو کان پکڑ کر باہر نکال دیجئے اور ساتھ ہی اُن حکومتوں کو، جن کی یہ لوگ خدمت کر رہے ہیں، کھلے الفاظ میں تنبیہہ کر دیجئے۔ تاکہ یہ ناپاک کھیل ختم ہو جائے۔ بہرحال اِن لوگوں کی توجہ سے حیدر آباد کو جو فائدہ پہنچا وہ سب پر روشن ہے،

(۸)

ضلع جالندھر کی اطلاع ہے کہ ایک ہریجن عورت سے اپنے تین بچوں کا بلکنا برداشت نہ ہو سکا اور غریب نے خودکشی کر کے غریبی کے خرخشوں سے نجات حاصل کر لی۔ پنجاب ہندوستان بھر کو غلہ بہم پہنچایا کرتا تھا۔ لیکن ہماری قومی حکومت کے زمانے میں اُسی پنجاب کے لوگ فاقہ کشی سے تنگ آ کر خودکشی پر اُتر آئے ہیں۔ پنجاب کے گاندھی بھگت اور ہریجنوں کے ہمدرد وزیر اعظم کو مبارک ہو۔

(۹)

حضرت جعفر شیرازی کو شکایت ہے کہ اُن کی ایک غزل کے پورے پانچ اشعار مسٹر جوہر چنیوٹی منشی فاضل نے اپنے نام سے "بیسویں صدی" میں شائع کرا دیئے۔ ہمیں اس حادثہ میں اپنے کرم فرما سے دلی ہمدردی ہے لیکن اس کے ساتھ انہیں مبارکباد دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اِس وجہ سے کہ کسی شاعر کے کلام کا چرایا جانا اُس کے مقبول اور دل پسند ہونے کی دلیل ہے اور پیشہ ور چور شاعروں نے ہمیشہ اُنہی شعرا کے کلام کو چرانے کی کامیاب کوشش کی ہے، جن کے اشعار سند مقبولیت عام حاصل کر چکے ہوں۔ جہاں تک "بیسویں صدی" میں مسروقہ اشعار کے شائع ہونے کا تعلق ہے، حضرت جعفر شیرازی خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو اشعار بغرض اشاعت موصول ہوئے ہیں، ان کا اصل مصنف کون ہے؟ بہرحال ہماری دعا ہے کہ جعفر شیرازی صاحب کو اِس غم و غصّہ میں صبر و سکون نصیب ہو۔

غزل

از جناب ام۔ امام مدیر "نئی کرن"

آج کیوں اشک بار ہیں ہم تم؟
کس لئے بے قرار ہیں ہم تم؟

موسمِ گل کی لاج رکھ لیں گے
شکر ہے بادہ خوار ہیں ہم تم

نگہ شوق کہہ گئی کیا راز؟
آج کیوں شرمسار ہیں ہم تم

یہ بھی نذرِ خزاں نہ ہو جائیں
چار دن کی بہار ہیں ہم تم

یاد آیا امام حسن پرست!
ورنہ کیوں سوگوار ہیں ہم تم؟

چھپائے نہ بنے

افسانہ

از
جناب رام لال

اس بات کو ڈاکٹر صاحب بھی نہ سمجھ سکے کہ گلشن یکایک کھڑکی سے ہٹ کر فرش پر بچھے ہوئے قالین پر کیوں جھک گئی۔ لیکن وہ قدرے متعجب ضرور ہوئے کہ اس گھر میں وہ کئی مرتبہ آ ئی تھی اور اس قالین کے ایک ایک تار سے واقف تھی۔ جب انہوں نے قریب آکر غور کیا اور ہنستے ہوئے پوچھا "کیا دیکھ رہی ہو گلشن؟"

گلشن چونک کر سیدھی کھڑی ہوگئی اور بولی "بھائی جان آپ تو ایکسپرٹ ہیں۔ غور سے دیکھئے۔ اس قالین کے تار اصلی تار پورے کے بال ہیں یا محض دھوکا ہے۔ دیکھئے نا!"

نشاط نے پیچھے سے آکر ڈاکٹر صاحب کو کھینچ لیا اور مصنوعی غصے سے بولی۔ "آپ جائیے، یہ تو مذاق کرتی ہی رہتی ہے"

ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے گلشن کی طرف چبھتی نگاہوں سے دیکھا اور چلے گئے۔ اور گلشن نے کھڑکی سے باہر تیزی سے دیکھا اور پھر گھوم کر یوں چلائی جیسے ہاتھ سے شکار نکل گیا ہو۔

"نشاط تم بھی ایک ہو —— ذرا ڈاکٹر صاحب کو یہ رنگ تو پہچاننے دیتی کہ کس کے خون سے مشابہ ہے"

"بس اب اپنی خفت کو رہنے دو۔ وہ تو ہٹ چکی" نشاط گلشن کو کھینچ کر کھڑکی میں لے آئی۔ ڈاکٹر صاحب تانگے میں بیٹھ رہے تھے۔ وہ دونوں کھڑکی پر جھک گئیں۔ گلشن کو یوں محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر اور اسی طرح جھکی رہی تو کھڑکی کی دہلیز اس کے سینے کی گرمی سے پگھل جائے گی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے کے نیچے رکھ لئے اور قدرے سنجیدہ ہو کر بولی "تمہارے ڈاکٹر صاحب ہیں تو پورے سو روپے ڈاکٹر، لیکن معاف رکھنا نشاط بہن، اگر میں یہ کہوں کہ —— جو بات دیکھنی اور سمجھنی چاہئے نہ ادھر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور جب ہمارے سامنے ہنستے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں لڑکیوں کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ ساری عمر بڈھی ٹوٹیوں سے ہی کھیلتے رہے ہیں"

"واہ ری بنو! بڑی نقاد تو دیکھو میرے رفیق حیات ہی کو تنقید کا نشانہ بنا رہی ہے۔ لیکن تجھے اس کا کیا حق ہے؟"

"واہ مجھے کوئی حق ہی نہیں ہے؟ کیوں وہ میری بچپن کی سہیلی کا شوہر نہیں ہے! میری سہیلی کا دل مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں اس کی ہر دھڑکن پہچانتی ہوں کیا تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتی ہو کہ شادی سے پہلے تمہارے خوابوں میں ہمیشہ ایک ایسے ان دیکھے نوجوان کی پرچھائیں رہی، جس کی محض ہنسی کا تصور ہی تمہارے اندر ایک خوشگوار کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ اور تمہارے دل میں ایک ایسا شوق بھر دیتا تھا کہ تم ہمیں بن کہے ایک پارٹی دے ڈالتی تھیں۔ پکچر دیکھنے کے لئے کھینچ لے جاتی تھیں۔ تمہارا چہرہ ہی تمہاری اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا تھا۔ اور نشاط آج تم ایک ایسے شخص سے وابستہ ہو چکی ہو، جو ہنستا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے تیل کا خالی کنستر اونچائی سے زمین پر دے مارا ہو، جیسے ہکلاتے ہکلاتے گلے میں پھانس پڑ پڑ جائے۔ تمہارے پاس ایک البم پڑی تھی۔ کہاں ہے وہ؟ اس میں تمہارا ماضی بند ہے۔ کبھی ڈاکٹر صاحب نے بھی دیکھا ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب تو دل دیکھنے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ جب بھی گھر آتے ہیں، عجلت میں ہوتے ہیں۔ میری ہر ایک بات اور فرمائش کا ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ "مجھے ذرا جلدی ہے۔ اسپتال میں بہت سے مریض چھوڑ آیا ہوں" اور یہ سنتے سنتے اب میرا دل ایک گندے پھوڑے کی مانند پک گیا ہے۔ جی ہر وقت کپکپاتا رہتا ہے دل تو چاہتا ہے کہ اس پھوڑے کو کسی دن چیر ڈالوں۔ ناخون سے کرید دوں، لیکن احساس میں کچھ ایسی نفرت اور تعفن بھر گیا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے بھی خوف آنے لگا ہے۔ نفرت اور بے اعتنائی میں مجھے اپنی موت نظر آتی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ کسی دن کچھ کھانے پر مجبور نہ ہو جاؤں"

"نشاط! یہ تو کہہ رہی ہے جس نے ہمیشہ جینے کے خواب دیکھے ہیں اور آج تو زندگی جیسی مقدس اور عزیز تحفے کو ٹھکرا رہی ہے کہیں قدرت طیش میں نہ آجائے!"

نشاط نے ایک لمبی سرد آہ کھینچی اور کچھ ایسے انداز سے گلشن کی طرف دیکھا، جیسے دُنیا کی ہر مخالفت سے پہلے اُسے صرف اسی سے شکایت ہو۔ بولی: "قدرت صرف ایک بار طیش میں آئے گی اور اُس وقت میں اس دُنیا میں نہ ہوں گی۔"

"اس کا مطلب؟"

"مطلب کچھ بھی نہیں — میں ایسے بک گئی"۔ نشاط کھڑکی سے پرے ہٹ گئی۔ گلشن اسے پیچھے سے لپٹ گئی اور صوفے پر گراتے ہوئے بولی۔ "بتاؤ نا تم نے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ لو دیکھو۔ ٹھہرو ذرا۔ تمہارے بالوں میں میرا بُندا اٹک گیا ہے۔ یہ بال کتنے خوبصورت ہیں؟" نشاط نے گلشن کے بالوں کو کمر سے اٹھا کر اُس کے سینے پر پھیلا دیا اور بولی "کبھی کسی کم بخت کی شامت تو آئے گی نا!"

"چل ہٹ —!"

"میں نے کہا — تو بہت حسین ہے"۔

"مجھے معلوم ہے"۔

"تیری حسین آنکھوں، لمبے گیسوؤں، ستواں ناک اور پتلے ہونٹ دیکھ کر کبھی کبھی مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تیرے لئے تیرے جیسا خوبصورت نوجوان مشکل ہی سے ملے گا!"

"میں نے کبھی نوجوانوں کے خواب نہیں دیکھے"۔

"تو پھر کیا گھوڑوں کے خواب دیکھتی ہو؟" نشاط نے پھبتی کسی اور گلشن کے چہرے پر کسی ایسی شرارت کے آثار نمودار ہوئے، جو ردّ عمل کے طور پر اُس کے ذہن میں اُبھری تھی، لیکن دونوں ہنس پڑیں اور پھر اسی لمحہ چونک کر کھڑکی کی طرف یوں دیکھا، جیسے اُدھر سے کوئی سنسناتی ہوئی گولی داغی گئی ہو۔ سامنے فلیٹ پر سے کھنکارنے کی آواز آئی۔

"یہ کون ہے بدتمیز؟" نشاط چمکی۔

"ارے! یہ مسٹنڈا ابھی تک زندہ ہے۔ رفیع ہے نا؟"

"تو تمہاری خواہش ہے کہ اُسے مرجانا چاہئے تھا؟" وہ ہنس کر اُس سے لپٹ گئی۔

"مرے یا جئے — یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میرا مطلب ہے ابھی اسی طرح پھرتا ہے؟"

"نہیں اسی طرح کہاں ہے۔ اب تو خاصا لمبا ہو گیا ہے اور یہ نوکدار مونچھیں کب تھیں؟"

"ہائے — وہ اِدھر ہی دیکھ رہا ہے۔ کیا کھڑکی بند کردیں؟"

"کیا ضرورت ہے ابھی ہٹ جائے گا"۔

"مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ اُس کی نگاہیں تو دیکھو"۔

"کیوں — پردے پھاڑتی ہیں؟"

"آگ لگے پردوں کو۔ پردے کہاں سے ٹپک پڑے۔ اُس کم بخت رضیہ کا خیال آتا ہے۔ بہت جان دیتی تھی اس پر"۔

"کونسی رضیہ"؟

"واہ ابھی سے بھول گئی۔ سعید کی بہن۔ شیخ صاحب کی کوٹھی سے پرلی کوٹھی انہیں کی تو تھی۔ لیکن وہ تمہارے جانے کے بعد آئی تھی"

"تبھی تو میں کہتی ہوں کہ یہ رضیہ کا کیا ذکر لے بیٹھی!"

"اچھی لڑکی تھی"۔

"بہت یاد آتی ہے؟"

"ہاں۔ تمہارے بعد وہی میری دمساز تھی۔ بہت دیکھی ہیں لڑکیاں۔ پر ایسی لڑکی شاید ہی ملے"۔

"کیوں؟"

"ایک نقص تھا اُس میں۔ جو باوجود میری ہزار کوشش کے دور نہ ہو سکا۔ وہ مردوں پر جان دیتی تھی۔ جب بھی موقعہ ملتا گلی میں جھانکتی رہتی۔ آتے جاتے کو دیکھتی۔ اُس کی تعریف کرتی۔ نقص نکالتی نمبر لگاتی اور فیل کر دیتی۔ راستے میں چلتے چلتے ٹھہر جاتی۔ میں اُسے کھینچتی، ٹوکتی اور جھگڑتی، لیکن نہ جانے وہ کس مٹی سے بنی تھی جب تک نمبر نہ لگا لیتی، آگے نہ بڑھتی۔ اُس کے پاس بے شمار ڈائریاں تھیں۔ ان ڈائریوں میں بے شمار باتیں تھیں۔ اسی رفیع کے متعلق اُس نے پچاس صفحے سیاہ کر رکھے تھے"۔

"پچاس؟" اُس کی آنکھیں پھیل گئیں

"ہاں پورے پچاس!"

"کیا وہ اس چغد پر اس قدر زوروں سے عاشق تھی؟"

"عاشقی کی بھی ایک ہی کہی ـــــ پچاسوں صفحات میں اس کے محض نقائص ہی گنوائے تھے اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ اس شخص سے جو عورت بھی عشق کرے گی، پچھتائے گی۔ اس سے کسی قسم کی بھی وابستگی کیکڑے کے کھردرے تنے سے ہم آغوش ہونے کے برابر ہے۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کتابچے کو شائع کرایا جائے، لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی اور انہی دنوں اس کے ابا کا تبادلہ بریلی ہوگیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اڑتی اڑتی خبر سنی کہ رضیہ کے پیٹ میں اسی رفیع سے ایک ناجائز بچہ پل رہا تھا۔"

"ہائیں!"

"ہاں میں خود متعجب تھی۔ لیکن رضیہ چلی گئی اور کسی سے تفصیلات پوچھتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا۔ یہ خوف میری جان نکال رہا تھا کہ کہیں لوگ مجھے رضیہ کی سہیلی سمجھ کر مجھ پر بھی کوئی تہمت نہ لگادیں!"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا۔ وہ سانڈ جیسے تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ دونوں کے سامنے ہے۔"

"گولی لگے اسے! کس بری طرح سے گھور گھور کر دیکھتا ہے۔"

"ہٹاؤ بھی اسے۔ میں کھڑکی بند کرتی ہوں۔"

نشاط کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھی۔ رفیع اپنے جنگلے پر جھکا سگار پی رہا تھا۔ نشاط کو کھڑکی کے قریب آتے دیکھ کر سگار منہ سے نکال لیا اور مسکرادیا۔ نشاط نے منہ بناکر کھڑکی پھٹاک سے بند کردی۔ اور پھر واپس صوفے پر آپڑی۔ گلشن نے ڈاکٹر صاحب کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں ان کی بجائے اگر اسی رفیع کی تصویر ہوتی تو بھی کچھ برا نہ تھا۔"

نشاط خاموش رہی۔ جانے وہ آنکھیں بند کئے کیا سوچ رہی تھی۔ گلشن سرک کر اس کے ساتھ جالگی اور اس کے چمکتے ہوئے رنگین ہونٹوں پر انگلی پھیر کر بولی "ایک بات تو بتاؤ میری اچھی سہیلی!"

"کیا؟" گلشن نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور بوجھ سے دب کر نشاط کے چہرے پر خون کی سرخی جھلک پڑی تھی۔

"میں نے سنا ہے شادی کے بعد مرد بڑی عجیب عجیب حرکات کرتے ہیں۔"

"کیوں نہ کریں؟" اس کی آواز میں طنز تھا جیسے اس کے ساتھ ابھی تک کوئی حرکت نہ کی گئی ہو۔

"ہمارے پڑوس میں جو ایک دیسی صاب آکر رہا تھا نا:ـــ وہ اپنی میم کے ساتھ بند کمرے میں، آدھی آدھی رات کو اٹھ کر ڈانس کیا کرتا تھا۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی۔ نعیم اور میں باری باری دروازے کے سوراخ میں سے یہ منظر دیکھا کرتے تھے۔"

"اب نعیم نے کبھی یاد نہیں دلایا؟"

"اب وہ یہاں تھوڑے ہے بمبئی سے پانچ چھ سال کے بعد آئے گا تو وہ بھول چکا ہوگا۔ بچپن کی باتیں سپنوں کے برابر ہوا کرتی ہیں۔"

کلاک نے چار بجائے تو گلشن سائیکل اٹھاکر چلی گئی۔ نشاط اسی طرح صوفے پر پڑی رہی۔ پڑا رہنا اس کا معمول تھا۔ نئی بات نہ تھی۔ یوں تو زندگی کی ہر گھڑی ایک معمول ہوتی ہے، لیکن بے کار پڑے رہنے کو اس نے ایسا معمول بنالیا تھا کہ اب وہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکالنے کی سعی کیا کرتی تھی اور یہ معمول یوں تھا۔ صبح چھ بجے (کبھی کبھی اس سے پہلے بھی) سے آٹھ بجے تک بستر میں پڑے رہ کر اپنے ذہن کو چاٹتے رہنا۔

آٹھ بجے سے نو بجے تک ڈاکٹر صاحب کے لئے چائے تیار کرنا اور انہیں پلانا۔ اس دوران میں اخبار آجائے تو انہیں اخبار دے کر خود ڈھیر پڑ رہنا۔

ٹھیک سوا نو بجے تک ڈاکٹر صاحب کا نہا دھو اور سوٹ پہن کر سٹیتھسکوپ گھماتے ہوئے اسپتال چلے جانا۔

اس کے بعد بارہ بجے تک کھانا تیار کرکے جی میں آئے تو نہانا دھونا بننا سنورنا ورنہ بستر میں لیٹے رہنا۔

ساڑھے بارہ بجے ڈاکٹر صاحب کا لنچ کھانے کے لئے آنا اور دو بجے پھر چلا جانا۔

اس کے بعد شام کے چھ سات بجے تک کوئی ملنے کے لئے نہ آجائے تو وہ اطمینان سے پڑی رہتی تھی۔

رات کو ڈاکٹر صاحب کے واپس آنے کا کوئی وقت مقررہ نہیں تھا۔ وہ کسی وقت بھی آسکتے تھے اور وہ کسی وقت انہیں ڈنر کھلاسکتی تھی۔ اس کے بعد یا پہلے نہ کبھی ڈاکٹر صاحب نے اس

سے کچھ وقت مانگا اور نہ اُس نے اپنی خدمات اپنے آپ پیش کیں۔ زندگی بغیر کسی حادثے کے گزر رہی تھی۔ اِس لئے وہ چپ چاپ وقت کے سٹیم رولر تلے پتھر کی بجری کی مانند پستی رہی۔ زندگی کی کول تار میں جمتی رہی۔ اور یہ سڑک بالکل ہموار ہو گئی تھی۔ صاف اور ستھری خاموش اور بے جان، بے حس، بے روح۔۔۔ روح کی تحریک بھی ہوئی کول تار میں جم کر رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کول تار کی مانند تھے۔ اور کول تار ڈاکٹر صاحب کی مانند۔ یا ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑا تاریخی اور مقدس مینار تھے جس کے قدموں میں اُسے ایک راہبر بنا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ دُور دُور سے سیّاح آتے تھے اور اُس کے آگے بچھے ہوئے کپڑے پر کچھ پیسے بطور نذر جاتے ہوئے پھینک دیتے تھے، لیکن سیاحوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس قدر کم کہ کئی کئی دن تک کوئی بھی نہ آتا اور اُسے ایک پیسہ بھی نہ ملتا اور راہبر کڑھتا۔ اس طرح تو سالانہ ٹھیکے کی رقم کبھی پوری نہ ہو گی۔ اُس کا جی چاہتا نیچے سے ڈائنا میٹ رکھکر اِس مقدس اور تاریخی مینار کو بھک سے اُڑا دے۔

نشاط اِس مقدس مینار کی تاریک سیڑھیوں میں اپنی سرکش خواہشات کی راہبری کرتے کرتے تنگ آ گئی تھی۔ جی چاہتا تھا دیواروں سے اپنا سر پھوڑ لے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب دل کے اس قدر سخت اور سنجیدہ تھے کہ اُس کی پہاڑ سی بے چینی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

گلشن کے جانے کے بعد وہ دیر تک صوفے پر پڑی تصوّرات کے جھمیلوں میں اُلجھی رہی۔ آنے اور جانے والے حالات کا تجزیہ کرتی رہی۔ چھت پر سرڑ سرڑ کرتا ہوا پنکھا اُس کے ذہن میں ایک عجیب سی اتھل پتھل مچاتا رہا۔ وہ جو بات بھی سوچتی، اُس میں سرڑ سرڑ کی آواز گھس آتی تھی اور بات درہم برہم ہو جاتی تھی۔ مثلاً وہ کتنی دیر سے رفیع کی لمبی ناک کا تصوّر کر رہی تھی اور اس کے اچانک گھوم کر دیکھنے کے انداز کو ذہن کے دھندلکے میں سے نمایاں کر دینے کی سعی میں مصروف تھی کہ سرڑ سرڑ کی آواز یوں بیچ میں آ کر بیٹھ گئی جیسے رفیع کا حلق اور ناک مل کر خر خرا رہے ہوں۔

اُس نے کروٹ بدل کر پھر رفیع کی نیلی لکیروں والی قمیص کا تصوّر کیا جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور چھاتی کے گہرے سیاہ بال بنیان میں سے جھانک رہے تھے۔ لیکن آسے اِسی اُدھیڑ بن میں پڑے ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ پھر سرڑ سرڑ گونجنے لگی اور اُس نے یوں محسوس کیا جیسے رفیع قمیص کے بٹن کھول کر سینہ کوبی کر رہا ہو۔

اس قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں اُس کے ذہن میں اُٹھتی اور ڈوبتی رہیں۔ کلاک ابھی تک چار نہ بجا سکا تھا۔ کچھ دیر پہلے اُس نے دیکھا تھا کہ بڑی سوئی دس کے ہندسے کے قریب آ پہنچی تھی۔ اور اب بھی وہ دیکھ رہی تھی کہ سوئی اپنی جگہ سے رتی بھر نہ سرکی تھی۔ وہ چونک پڑی۔ شاید کلاک بند ہو گیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے یکسو ہو کر ٹک ٹک سننے کی کوشش کی۔ لیکن پنکھے کی گھسٹ گھسٹ کی آواز نے اسے اپنی کوشش میں ناکام رکھا۔ اور وہ زچ ہو کر اُٹھ گئی۔ اور وہ کھڑکی پر جا جھکی۔

دونوں اطراف سے عالیشان کوٹھیوں میں گھری ہوئی چوڑی گلی دھرتی کے سینے پر ایک دودھ پیتے بچّے کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ پڑوس کا وکیل محمود اپنی ہمشیرہ اور بیوی کو کار میں بٹھا کر جانے کہاں لیے جا رہا تھا۔ محمود کے چہرے سے کس قدر محبت اور اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس کی ہر ایک حرکت سے ایک ایسا خلوص جھلکتا تھا۔ جو صرف اُس کی رفیقہ کی خاطر تھا۔ تاڑ کی طرح لمبی بے ڈھنگی رفعت ——— سیاہ ریشمی برقعے کے اندر ایک طویل انگڑائی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن باہر آتے ہی بے وزن شعر کی مانند تھکا دینے والا احساس پیدا کر دیتی تھی۔ لیکن اُس کا خاوند اُس سے کس قدر مرعوب نظر آتا تھا۔ اُس نے کھڑے کھڑے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ کانوں پر لٹکی ہوئی بالوں کی لٹ کو دانتوں تلے دبا لیا اور ایک لمبی آہ کھینچی۔ ٹھنڈی سانس جب اُس کے ہونٹوں کو کپکپاتی ہوئی نکلی تو اُس کے جسم کے نچلے حصے کی شریانوں میں ایک ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ جیسے برف پگھل کر خون میں شامل ہو گئی ہو۔ وہ دیر تک اُسی طرح جھکی رہی اور بازو پر گال رکھے نیچے دیکھتی رہی اور اچانک اُس نے محسوس کیا کہ سامنے بالکونی میں سے دو تیز نگاہیں اُس پر گڑی ہوئی ہیں اِس کا احساس ہوتے ہی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یونہی ——— بے طرح سی باتیں اور خیال

اِدھر اُدھر کودنے لگے۔ اور جب یہ احساس ناقابلِ برداشت ہوگیا اور رینگا ہوں کے تیزوں نے اُس کا جسم کرچھے رہنا ناممکن کردیا۔ تو اُس نے سر اٹھایا اور رفیع کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر اُس کی بھنوئیں تن گئیں۔ لیکن رفیع کو فوراً ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں سے بھی مسکراہٹ چھلک پڑی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کھڑکی سے پرے چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے ایک اور کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا کہ رفیع پُر امید ہو کر اُس کی طرف تک رہا تھا۔ آگے بڑھنے سے اُس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ وہ شیشے کے پیچھے چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ جیسے کسی نے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ جانے رفیع نے ہاتھوں کے اشارے سے کیا کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ دیکھتی ہی رہی۔ رفیع اتنی تیزی سے ہاتھوں کے اشارے کر رہا تھا جیسے وہ اُسے کوئی بہت بڑی اطلاع لکھا رہا ہو؛ اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مُنہ اٹھائے کھڑی ہو۔ اس کے دیکھتے دیکھتے رفیع اندر چلا گیا، اور وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ ابھی اُس نے بدن سیدھا بھی نہیں کیا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے بھاری بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی۔ وہ چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ دروازے پر لٹکا ہوا پردہ کانپا اور رفیع اندر آگیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"معاف کیجئے میں بلا اجازت اندر آگیا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اِس گستاخی کی سزا کئی سال کی قید بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن میں آپ سے صرف ایک بات پُوچھنے آیا ہوں۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟"

"کیا ہے؟" اُس کے لہجے میں درشتگی تھی۔

"خدارا غصّہ تھوک دیجئے اور اطمینان سے سُنئے۔ آپ کی سہیلی گلشن میرے پلنگ پر دو گھنٹے سے بے ہوش پڑی ہے۔ میرا خیال ہے اُسے فِٹ آگیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔"

"وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟" اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ رضیہ کی باتیں اُس کے سامنے آگئیں۔

"بس پہنچ گئی —— اس پر بحث نہ کیجئے۔ آپ سمجھ لیجئے کہ وہ کسی طرح میرے ہاں پہنچ گئی۔ اب یہ بتایئے کہ میں کیا کروں؟ کچھ ہی دیر بعد میرے ماموں کلکتہ میل سے آرہے ہیں۔ اور میں اِس بات کو کسی طرح سے بھی نہ چھپا سکوں گا۔ وہ آپ کی سہیلی ہے نا —— خدارا میری مدد کیجئے! کہو تو ٹرنک میں ڈال کر آپ کے ہاں چھوڑ جاؤں۔"

نشاط گم بسم کھڑی تھی۔ رضیہ کی ڈائری کے اوراق ذہن میں اِدھر اُدھر اُڑنے لگے۔ اور رفیع تیز تیز قدموں سے اِدھر اُدھر گھومنے لگا

(طبع زاد)

غزل

از جناب عبدالستار شاد

دیدنی ہے حُسنِ فانی کی بہار
مُسکرا اُٹھی جوانی کی بہار

تُو نہیں ہے پاس تو کس کام کی
یہ جوانی یہ جوانی کی بہار

یہ شبِ مہتاب یہ صحنِ چمن
یہ شرابِ ارغوانی کی بہار

گدگدایا پھر کسی کی یاد نے
آگئی پھر شعر خوانی کی بہار

کون دیکھے لالہ و گُل کی طرف
دیکھ کر اُن کی جوانی کی بہار

زندگی کیا ایک سایہ ایک خواب
مختصر ہے عمرِ فانی کی بہار

کیسے مرجھائے ہوئے پھولوں میں شاد
ڈھونڈتا ہے تُو جوانی کی بہار

دُنیا کے نامور ڈاکٹر اور سائنسدان یہ حقیقت تسلیم کر چکے ہیں کہ ریڈیم ٹانک پلز مردانہ کمزوری اور ناطاقتی کا بہترین علاج ہیں۔ ریڈیم ٹانک پلز جسم میں نیا خون پیدا کر کے زبردست مردانہ طاقت بڑھاتی ہیں۔ کھوئی ہوئی جوانی کو واپس لانے کے لئے ریڈیم ٹانک پلز دُنیا کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اس مفید دوائی کو لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں قیمت فی شیشی مکمل خوراک چھ روپے

بیرونی نقائص اور کمزوری دُور کرنے کے لئے ریڈیم مساج نامی طلا استعمال کریں۔ یہ طلا دُنیا کے تمام طلاؤں سے بہترین تسلیم کیا جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپے

تندرست نوجوان اِن دواؤں کو استعمال کر کے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں چوٹی کے ڈاکٹر ریڈیم ٹانک پلز اور ریڈیم مساج کے استعمال کی زبردست سفارش کرتے ہیں

انڈیا آفس

ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ دھلی

زندگی کا ایک رُخ

افسانہ

از

جناب یونس رمزی

" اونہہ ——— شی شی، یو ایڈیٹ فول ——— تم آرٹ آف کسنگ (Art of Kissing) بھی نہیں جانتے۔" کرنجی آنکھوں والی اینگلو انڈین لڑکی اپنے لپ سٹک اور غازہ شدہ چہرے کی توہین سمجھ کر فضل کو گالیاں دینے لگی۔

" بُرا نہ مانو ڈارلنگ، ہم ہندوستانی ہیں بھئی"۔

" تم بالکل سوئر ہو"۔

" یس ڈارلنگ ——— لیکن تم میرا انسلٹ (Insult) کر رہی ہو"۔

" میں نے کہا، میرا غازہ خراب ہو گیا نا؟"

" تو مجھے اِس کے لئے افسوس ہے ڈیر ——— آملٹ منگاؤں، یا صرف کافی، یا پھر لیمن ——— حالانکہ ....!"

" نو، تھینکس"۔

آخر اتنا بگڑ کیوں گئیں، ابھی تو تم میرے ساتھ چھ گھنٹے رہ سکتی ہو، میرے پاس چھ سو روپے ہیں۔ کہو تو ایک گھنٹہ کی قیمت سو روپے ادا کر دوں؟ ——— ہاہاہا..... یوائے آملٹ لاؤ، پیسٹری، پلم کیک"۔

اور وہ اینگلو انڈین نیم پیشہ ور لڑکی جو صرف اعلےٰ سوسائٹی میں بیٹھ کر اپنا سودا کرنے کی عادی تھی، اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ سے آئینہ نکال کریپ کی مدد سے غازہ جمانے لگی۔

جولیا اور عام بازاری لڑکیوں میں فرق کیا تھا۔ ایک برسرِ عام گندگی اچھالتی ہے اور دوسری رومان پسند قسم کے نوجوانوں سے۔ کلب، سینما، تھیئٹر میں قہقہے کے ساتھ ساتھ روپیہ بھی کما لیتی ہے۔ جولیا اس سوسائٹی کی نمائندہ تھی۔ وہ پُرانے خداؤں کے تبسم کی طرح تھی ——— جولیا بھی ایک دیوتا تھی، سوسائٹی کے اعلےٰ وارفع مارکٹ کی رُکن۔

فضل سوچ رہا تھا۔ اُس کے پاس آٹھ سو روپے تھے، اور جب وہ چورنگی سے نکل کر نیو مارکٹ کی طرف آ رہا تھا تو اُس کرنجی آنکھوں والی نوجوان لڑکی نے ایک عجیب خواب آگیں نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اِس طرح کہ وہ سحر زدہ سا سڑک کے ایک کنارے کھڑا ہو کر اُسے گھورتا رہا۔ وہ گون میں بالکل وینس کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کی مرمریں گردن سے تھوڑا نیچے کا حصّہ دھوپ کی طرح چمک رہا تھا۔ بھرے بھرے بازو، توانا جسم اور نوکیلے مینارجن کی گولیاں عریاں طور پر نظر آ رہی تھیں ——— جن پر فضل کے اندھے جذبوں کی نگاہیں پھیلے گئیں، اور ہندوستانی معیار پر اُس نے جانچا کہ اُس کی عمر اٹھارہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور نجانے کیوں وہ مُسکرا پڑا۔ دھیرے دھیرے، آہستہ جب وہ نیو مارکٹ میں داخل ہو رہا تھا، تو جولیا اپنے لپ سٹک شدہ لبوں پر وہ مسکراہٹ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی، جو اُس کا اعلیٰ فن تھا، آرٹ! اُس کی ہر مسکراہٹ کی لکیر میں فضل نے محسوس کیا، کہ وہ خود عریاں ہو کر ناچ رہی ہے۔

" بہت خوب محترمہ!" اُس نے دل میں کہا۔ اب وہ لڑکی بالکل اُس کے مقابل چلنے لگی۔ اُس نے ایک دکان سے سٹیٹ ایکسپرس کا ایک ٹین خریدا، اور سگرٹ جلاتے ہوئے اُس نے حد درجہ جسارت سے اُس کی طرف سگرٹ بڑھا دیا۔

" تھینکس"۔ ——— جولیا نے کہا اور اپنے رنگین لبوں کے خم میں سگرٹ تھام کر دھوئیں اڑانے لگی۔ فضل کی نگاہیں ہر دم اُس کے کسے ہوئے بازوؤں کی طرف جاتیں۔ اُسے ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا کہ اِس خیال ہی سے اُس کے دل میں گدگدی ہو رہی ہے۔ وہ خاموشی سے اُس لڑکی کے ساتھ چل پڑا، اور آخر اُس لڑکی نے اُس کا نام پوچھا۔

" میرا نام فضل ہے"۔

" اور میرا جولیا"۔

" خوب! فضل ایک ترنگ سے جھوم اٹھا۔ "بہت اچھا ہے نام تمہارا ——— آؤ کیفے چلیں"۔

اور کیفے میں ہلکے ناشتے کے بعد جب فضل نے منی بیگ نکالا تو اُس نے محسوس کیا کہ جولیا کی نگاہیں بیگ کے عقبی حصّہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

—— بیگ کا اندرونی حصہ، جس میں آٹھ سو کے نوٹ کھڑکھڑا رہے تھے۔

پھر اس کے بعد ہی رومانس شروع ہوگیا "اف ڈارلنگ، بہت ہی گرمی ہے۔" وہ فضل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنے لگی —— تھوڑی دور چلنے کے بعد اُس نے اصرار کیا کہ براڈوے چلیں، اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ فضل نے انکار نہ کیا۔ اُسے پیٹ کی بھوک سے زیادہ جذبات کی بھوک ستا رہی تھی۔ توانا جسم، بھرے بھرے بازو، اور اور —— اس احساس سے اُس کا سارا جسم جلنے لگا۔ جب وہ براڈوے کی ایک کیبن میں بیٹھا، تو جولیا بالکل سٹ کر اس سے کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ اس طرح کہ اس کے زانو فضل کے پیڑوں سے مس ہو رہے تھے۔ اور وہ ایک نئی گرمی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ایک ایسی گرمی جیسے خون میں دیئے جل رہے ہوں۔ —— شعلہ، آگ، دھواں، اور وہ اُس کے سنہری بالوں سے کھیلنے لگا —— بہت دیر تک —— کھانا آگیا، دونوں کھانے لگے۔ جولیا شوق سے لذیذ چیزیں کھاتی رہی۔ اور جب کھانا ختم ہوگیا تو فضل نے اپنی باہیں جولیا کی مرمریں گردن میں حمائل کر دیں۔ جولیا کے رخسار اُس کے رخساروں سے مس کرنے لگے۔ اور پھر وہی انجانی گرمی۔ بہت دیر تک دھیرے دھیرے وہ اس کے بازو سہلاتا رہا۔ تشیبٹ ایکسپرس کا رومانی قسم کا دھواں فضا میں بکھیرتا رہا۔ جیسے آن کے لئے ایک عورت ہی اُس کی تقدیر تھی اور حسین تعبیر بھی۔

ایک عورت کے حسین خد و خال دقتی طور پر کسی انسان کی تقدیر کی لکیریں بن جائیں، تو پھر کتنی رومان انگیز بات ہے۔ فضل نے سوچا۔ بھوک اور انسان" —— بھوک کی بھی قسمیں ہیں۔ جذبات کی بھوک، دولت کی بھوک، شہرت کی بھوک اور صرف "بھوک" —— یہ بھوک ہی تو ہے جو انسان کو صرف انسان بنائے رکھتی ہے۔ ورنہ اگر بھوک نہ ہو تو انسان دیوتا بن جائے۔ فضل بھی ایک انسان تھا، صرف انسان، بھوک کے جوئے تلے دبا ہوا بیل!

اور جب جولیا نے پوچھا "تمہیں سکیٹنگ (Skating) آتی ہے؟" تو وہ بالکل متعجب ہوگیا "نہیں بھئی" فضل نے کہا تھا۔

"تو تم بالکل ہندوستانی ہو؟" جولیا نے طنز کیا۔

"اور تم بھی تو ہو —— فرق صرف اتنا ہے کہ تم خداؤں کی مخلوق تھیں اور ہم بندوں کی۔ حالانکہ اب یہ تضاد ختم ہوچکا ہے" فضل نے کہا۔

"دیکھو، میں ایسی باتیں تم سے سننے نہیں آئی" جولیا بگڑنے لگی۔

"اف، ڈارلنگ، چھوڑو ان باتوں کو۔" اور فضل بہت دیر تک اُس کے سڈول بازوؤں کو اپنے بازوؤں میں ڈال کر لطف اندوز ہوتا رہا۔

"تم بہت خوبصورت ہو جولیا —— بالکل کلوپیٹرا!"

"یہ بات بہت پرانی ہوچکی ہے مائی ڈارلنگ! —— میرے پاپا کا بھی یہی خیال ہے، اور تم سے پہلے سارے نوجوانوں کا بھی یہی تھا۔ لیکن ——"

"اور کچھ منگواؤں —— ؟" فضل نے اصرار کیا اور جولیا نے اپنا سر اُس کے دھڑکتے ہوئے چوڑے سینے سے ٹکا دیا۔ جولیا کے غیر متوازن سانس چلتے رہے۔ فضل نے محسوس کیا کہ اُس کے سینے کی گولائیوں میں مزید ایک ارتعاش، ایک نغمگی پھیل رہی ہوگی اور اُس نے جولیا کو شدت سے کھینچ لیا۔

"ڈارلنگ ایک بات کہوں —— ؟" جولیا نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ فضل کے جذبات کو آگ لگ چکی تھی۔

"کہو —— جولیا ——"

"مجھے سو روپے دو گے؟ میں تم سے روز ملوں گی۔ مجھے کام ہے۔"

"دے سکتا ہوں۔ یہ لو" اُس نے ایک نمبری نوٹ جولیا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تھینکس ڈیر ——" اور اُس نے تشکر یہ کی شدتِ اظہار کے لئے آنکھیں موند کر اپنے لب فضل کے لبوں پر رکھ دیئے۔

اور جب وہ ریگل سینما کے پاس سے گزرنے لگی تو اُس نے ایک بوڑھے انسان کو آنکھ ماری اور فضل سے معافی مانگ کر قریب ہی ایک بار میں اُس بڈھے کے ساتھ گھس گئی اور پھر پانچ منٹ بعد واپس ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس کا باپ تھا۔ جرائم پیشہ۔ وہ شراب پینے کا عادی تھا۔ اور وہ بوسہ لٹا دینے کی عادی۔ یہ عادت اُس کے باپ کی کثرت شراب نوشی نے دلوائی تھی۔ حالانکہ وہ بالکل مجبور تھی۔

اور اُسے ایک لمحہ کے لئے اُس سے ہمدردی ہوگئی —— اور جب وہ فرسکو پہنچا تو وہ سٹینڈرڈ سائز کی لڑکی سُست پڑگئی تھی۔ نجانے کیوں؟ وہ شاید سوچ رہی تھی، آج کی قیمت اُسے بہت زیادہ ملی ہے۔ اُس کا باپ شراب کے جرعے چڑھا رہا ہوگا۔ شیمپین، برانڈی، وسکی اور نہ معلوم کیا کیا؟ اور وہ؟

اُسے دو مختلف متضاد انسانوں کو شراب پلانا ہوتی ہے۔ ایک کو وہ خود شراب پلا کر پیسے لیتی ہے اور اُس معاوضہ سے اُس کا باپ شراب پیتا ہے۔ فضل سوچتا رہا اور اُسے لیمن پیتے ہوئے تلخی کا سخت احساس ہوا۔ لیکن جولیا نے جلد ہی اُسے اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ "ڈیر کیا سوچتے

ہو ——؟

اور ایک بار جو اُس کی نگاہیں جولیا کے سراپا پر گئیں، تو پھر اُسی جذبات کی بھوک نے شدت پکڑ لی۔ بھرے بھرے بازو، حسین خم —— اور —— اُس کے بازو اینٹھنے لگے

اُس نے دو گلاس بیئر پیا —— اور دھوئیں اڑاتی رہی ——

فضل نے اُسے چپکے سے رات ساتھ گذارنے کی دعوت دی اور اُس نے مسکرا کر قبول کر لی۔ فضل نے اُسے سینما کے لئے کہا اور وہ راضی ہوگئی۔ بے جان کھلونے کی طرح۔ بے حس جیسے وہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کرتی تھی۔ وہ بالکل اداس ہوئی جا رہی تھی۔

فضل نے بیلٹرو کے دو ٹکٹ لئے اور جولیا کے ساتھ بوکس میں بیٹھ گیا۔ ساؤنڈ پکچر شروع ہوگئی تھی —— انگلش فلم جس میں جمالیاتی جذبہ کو خاص طور پر ابھارا جاتا ہے۔ اور فضل پر بھی یہی ردّ عمل ہوا۔ اس نے جولیا کو اپنے شانہ سے ٹکا لیا۔ جولیا نے کچھ تعرض نہ کیا۔ بلکہ فضل کے ہاتھ گرمجوشی سے دبانے لگی۔ اور فضل کی رگ و پے میں ایک میٹھی میٹھی حرارت پھیل گئی۔ اُس کے احساس کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھا اور اُس نے بے تابانہ اُسے چمٹا لیا، پھولے پھولے سینے سے، وہ ایک عجیب لذت آگیں حرارت بہت دیر تک محسوس کرتا رہا۔ اس نے والہانہ طور پر سینکڑوں بار اُس کے لب اور رخساروں کو چوما۔ لڑکی بالکل خاموش رہی۔ بے حس، برف کا تودہ ——!

اور جب انٹرول ہوا تو اُس نے دیکھا۔ وہ بدستور اداس تھی بالکل ملول، بے جان۔ اُس کے گپون میں شکنیں آگئی تھیں۔ اور اوپر کا ایک بٹن بھی کھلا تھا۔ لیکن وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔

"کچھ بولو جولیا!" فضل نے کہا۔

"کیا؟" وہ چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

اور پھر انٹرول کے بعد وہی حرکت۔ وہ چپ چاپ فلم دیکھ رہی تھی اور فضل اُس کے جسم سے کھیل رہا تھا۔

فلم کے بعد وہ گرینڈ ہوٹل کے ایک کمرے میں آگئے۔ وہی پرانے کمرے، جن میں وہ ہنس ہنس کر کتنی جوان راتیں گذار چکی تھی۔

ساری رات فضل اُس کے جسم سے کھیلتا رہا۔ اور جب صبح جولیا ہوٹل سے رخصت ہونے لگی تو اُس کے کپڑوں پر اتنی شکنیں تھیں کہ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے شرما رہی تھی۔ وہ پھر شام کو ملنے کا وعدہ کرکے چلی گئی۔

دوسری شام وہ پھر ملی —— مستقل کئی شامیں، اور کئی راتیں جولیا نے فضل کے ساتھ گذاریں —— اور ایک صبح رخصت ہوتے وقت اُس نے اندازہ لگایا کہ فضل کے پاس اب روپے نہیں ہیں اور اس لئے دوسری شام وہ فضل سے نہ ملی۔

لیکن اسی شام جب وہ نئے شکار کی تلاش میں نیو مارکیٹ میں داخل ہو رہی تھی کہ فضل نے اُسے چونکا دیا۔ "ہیلو ڈارلنگ ——! چلو کیفے چلتی ہو؟" اور جب اُس نے کیبن میں بیٹھتے ہوئے اُس کا بوسہ لیا تو جولیا نے اپنے لپ سٹک شدہ لبوں کی توہین سمجھی۔ وہ فضل کو گالیاں دینے لگی۔ "ایڈیٹ، فول ...." لیکن فضل اتنا مدہوش تھا کہ وہ کچھ بھی جواب نہ دے سکتا تھا۔ چاہے وہ اُسے تھپڑ ہی کیوں نہ مار دیتی۔ اور اسی لئے فضل نے کچھ سوچ کر بہانہ بنا دیا: "میرے پاس ابھی چھ سو روپے ہیں ڈارلنگ۔ اور ایک گھنٹہ کی قیمت سو روپیہ ادا کر سکتا ہوں۔"

اور جولیا صرف دھیرے مسکرا دی۔ اُس نے پف سے غازہ ٹھیک کر لیا۔ جیسے کوئی بات نہیں وہ چھ روز اور رہ سکتی ہے۔ اور اُسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے ناحق فضل کو گالیاں دیں۔ حالانکہ ..... اُس کے لبوں پر پھر وہی مسکراہٹ کانپنے لگی جس میں وہ یکسر عریاں ہو کر ناچ رہی تھی —— "اور نہ جانے جولیا کی طرح ہندوستان کی کتنی لڑکیاں عریاں ہیں" —— فضل نے سوچا، اور جولیا نے اپنے کپکپاتے ہوئے لب فضل کے لبوں پر رکھ دیئے۔

(طبع زاد)

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ (۱) حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمہ پر لفظ غیر مطبوعہ لکھیں بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں اور یہ بے حد نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمہ پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں (۲) نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ

عزیز و محترم بھائی اختر شیرانی کو مرحوم لکھتے ہوئے میرا قلم کانپتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مرحوم سے میرے پچیس سالہ دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھے۔ کسے معلوم تھا کہ آپ عالمِ شباب میں ہی ہمیں داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ آہ اختر شیرانی سہ

زندگی کی حقیقت آہ نہ پوچھ ! موت کی وادیوں میں اِک آواز (اختر شیرانی)

اختر شیرانی سے ملک کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اِن کی موت اُردو ادب کے لئے ایک ایسا المناک سانحہ ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ اختر شیرانی گنتی کے اُن ممتاز شعرا میں سے تھے، جن پر ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ رومانی شاعری میں آپ انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔ افسوس بحرِ ادب کے اس بے مثال شناور نے اپنے عزیز و اقارب سے دور، غریب الوطنی کی حالت میں، میو ہسپتال لاہور میں زندگی کی آخری ہچکی لی سہ

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی لاج

آپ "بیسویں صدی" کے ابتدائی دور سے "بیسویں صدی" کو اپنے کلام سے زینت بخشتے رہے۔ موت سے چند یوم قبل آپ نے حسبِ ذیل غزل ارسال فرمائی۔ کسے معلوم تھا کہ غزل کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے وہ اس دنیا سے چل بسیں گے اور اُن کی یہ غزل ماتمی نوٹ کے ساتھ شائع ہوگی۔

ہم دست بدعا ہیں کہ خدا انہیں آغوشِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے عزیز و اقارب کو صبر کی توفیق عطا ہو۔

سوگوار:۔ خوشتر گرامی

کسی کی جفا بن گئی ہے جوانی
پیامِ قضا بن گئی ہے جوانی

نگاہِ محبت کا پیغام توبہ
سراپا حیا بن گئی ہے جوانی

تری چشمِ کافر نے جس دن سے دیکھا
خدا جانے کیا بن گئی ہے جوانی

جوانی میں لیں اس قدر بددعائیں
کہ اک بددعا بن گئی ہے جوانی

نہیں چھوڑتی اب بھی پیچھا ہمارا
پیامِ بقا بن گئی ہے جوانی

کہیں نیچی نظریں کہیں شوخ آنکھیں
حسینوں میں کیا بن گئی ہے جوانی

نہیں پوچھتا کوئی اختر چمن کو
چمن کی ادا بن گئی ہے جوانی

افسانے چند

از

جناب راج کنول

میں کھڑکی میں بیٹھا ہوں۔ کالی کالی گھٹائیں گھری ہوئی ہیں ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی ہیں۔ دل میں سینکڑوں آرزوئیں بل کھانے لگی ہیں۔ میرے ذہن پر کئی حسین یادیں ــــ کئی کہانیاں اُبھر آئی ہیں۔ لیجئے چند کہانیاں آپ بھی سنئے۔

ٹوٹ گئے ہیں تار

ٹوٹ گئے ہیں تار ـــــ! بینا کے تار ـــــ! اُس بینا کے نہیں جس بینا پہ میں کبھی گایا کرتا تھا۔ سہانے سہانے گیت۔ اُس بینا کے نہیں، جس بینا پہ آج درد بھرے گیت تھرک رہے ہیں۔ ٹوٹ گئے ہیں من کی بینا کے تار ـــــ

آجاؤ۔ اور ایک بار پھر میری دنیا کو مسکراہٹوں سے منوّر کردو۔ ایک بار پھر تم، میری آشا بن کر میرے سامنے آجاؤ۔ کیسے تھے وہ دن ـــ! کیسی تھیں وہ راتیں! جی چاہتا ہے وہ منوہر سپنا پھر میری نیندوں میں بس جائے۔ زندگی کا ہر لمحہ اسی آرزو میں بیت رہا ہے۔ لوٹ آؤ ـــ! ایسا نہ ہو تمہاری یاد، یاد ہی بن کر رہ جائے۔ اُمنگیں دم ہی توڑ دیں۔

میری دنیا کا ہر ذرّہ تمہارا منتظر ہے۔ تمہارے لئے بے قرار ہے بہار کے دن پھر لوٹ آئے ہیں۔ میری سوئی ہوئی آشائیں پھر جاگ اٹھی ہیں اور اُس جنگلی گلاب کی ڈالیوں پر پھر جوان آرزوؤں کو بہلانے کے لئے کلیاں پھوٹ پڑی ہیں۔ اُس گلاب کی ڈالیوں پر جن سے نہ جانے کتنی کلیاں اور پھول توڑ کر تم نے میرے پہلو میں ڈال دیئے تھے۔ اور آج ـــ آج وہ پہلو بھی سُونا ہے۔ میں شام پڑے اُس ٹیلے کی طرف نکل جایا کرتا ہوں۔ جس ٹیلے پر وہ جنگلی گلاب ہے۔ مجھے وہاں بیٹھے اکثر رات ہو جاتی ہے وہاں بیٹھا ہوا میں کبھی ماضی کی حسین یادوں میں کھو جاتا ہوں ـــــ اور کبھی مستقبل کے دبیز اندھیرے میں۔

جب نیلے آکاش پر چاند مسکرانے لگتا ہے تو ایک پل کے لئے میرے پیاسے کملائے ہوئے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ مجھے یاد آنے لگتی ہیں وہ راتیں۔ جب چاند کی مسکراہٹ کی مانند تمہارے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔ اور میں کھو سا جاتا ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو جذبات سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ جیسے چاند آج سمٹ رہا ہے بدلیوں کی اوٹ میں، یونہی تم میری آغوش میں سمٹ جایا کرتی تھیں۔ لیکن اب تو ایک تاریکی ہے، جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ ایک احساس ہے غم اور تنہائی کا، جو روح کو کچل رہا ہے۔

جھرنے کا پانی اب بھی سنگریزوں پر سے اُسی شوخی سے مچلتا ہوا گذرتا ہے۔ اور وہ جلترنگ سا جو جب پانی کی روانی میں بجا کرتا تھا اب بھی بجتا ہے۔ جب آسمان کے نیلگوں پیالے میں شفق کی سُرخی ڈھل جاتی ہے۔ اور جب یہ سُرخی جھرنے کے پانی پر رقص کرنے لگتی ہے۔ تو مجھے وہ حسین شامیں یاد آجاتی ہیں، جو تم شاید بھول گئی ہو۔ اب بھی ان وادیوں میں پہاڑی دوشیزائیں شام پڑے وہی گیت گانے لگتی ہیں، جنہیں سُن کر تمہارے دل میں آرزوئیں گنگنا اٹھتی تھیں۔ تمہاری آنکھوں میں مستی چھا جاتی تھی ـــــ اب بھی گوالوں کے لڑکے بنسری پر کوئی درد بھری تان چھیڑ دیتے ہیں ـــــ اور میرے جذبات بے قرار ہو جاتے ہیں۔

میں نے اب شام پڑے جھرنے کے پاس اکثر دو جوانیوں کو دیکھا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر چلّو بھر بھر کر پانی اُچھالتے ہیں اور پھر جھرنے کے مدھر گیت ایسے قہقہے بکھر جاتے ہیں۔ میں پرلے ٹیلے پر بیٹھا انہیں دیکھا کرتا ہوں۔ نیلے آکاش پر چھٹکے ہوئے تاروں کی مانند میرے دل پر حسین یادیں اُبھر آتی ہیں۔ بیتے دنوں کی یادیں، جن تک اب میری رسائی نہیں ہے۔ ایسی سہانی رُت میں کبھی جذبات ایک سیلاب کی مانند اُمڈ آتے تھے۔ کیف و مستی کی جستجو میں دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب تو دل ڈول رہا ہے۔

ایک ایسی ناؤ کی مانند جو منجدھار میں پڑی ہو ——— ستارے میرے ارمانوں کے چاند سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں۔ لیکن میری آشائیں کسی ایسی البیلی کی طرح جس کے نازک سے پاؤں میں کانٹا لگ جائے، مچل کر رہ جاتی ہیں۔ چاند کو چومنے کے لئے میرے ارمان چکور کی طرح مچلتے ہیں، لیکن تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔

میری نگاہیں اب بھی اُنہی پگڈنڈیوں پر جمی رہتی ہیں، جن پر ڈھور چراتے ہوئے تم گیت گایا کرتی تھیں۔ تمہاری سکھی سہیلیاں تو اب بھی گیت گاتی ہیں۔ پردیسی ساجنوں کی راہ تکتے تکتے تھکی ہوئی آنکھوں کے۔ دھڑکتے ہوئے دلوں، اُمڈتے ہوئے جذبات کے۔ لیکن میرے دل کے ساز میں اب کوئی نغمہ باقی نہیں ہے۔ میری من کی بینا کے تار ٹوٹ گئے ہیں۔

اُلجھ گئے نیناں

پنگھٹ پر اب بھی جوان ہنسی کا ترنم بکھرتا رہتا ہے۔ راہی آتے ہیں اور چلّو سے دو گھونٹ پانی پی کر جوان دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر جاتے ہیں۔ پھر مد بھری آنکھیں اُس وقت تک پگڈنڈیوں پر جمی رہتی ہیں، جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو جاتے۔ آہیں گیت بن کر پنگھٹ کی فضا میں بکھر جاتی ہیں۔ پنگھٹ کی اُس فضا میں جہاں نہ جانے کتنی چتونیں چتونوں سے ملیں کتنی برہنوں کے آنسو اور آہیں گم ہو گئیں۔ ——— پردیسی دو پل کو ہنسا کر جیون بھر کا روگ دے جاتے ہیں۔ بھنورے ہونٹوں کا رس چرا کر لے جاتے ہیں، پھر تازہ گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ باسی پھولوں کی طرح سوکھ جاتے ہیں۔ لیکن پنگھٹ پھر بھی جوان ہے ——— یہاں سدا ہی نینوں سے نین ملتے رہیں گے۔

* * * * * * * *

سورج ڈھل چکا تھا۔ جب میں مادھو پور پہنچا پنگھٹ سے گذر کر جب میں گاؤں کی طرف مُڑنے کو تھا تو اُس کے گلابی ہونٹوں پر گیت تھرکنے لگا تھا۔

پردیسی!
ایک بار
پھر لوٹ کر آنا
میں پنگھٹ پر
تمہاری راہ دیکھوں گی
میری پلکیں
تمہاری راہ میں
سدا بچھی رہیں گی
پردیسی!
ایک بار پھر آنا
کہیں سکھیاں
مجھے طعنے نہ دیں

پردیسی
دِل توڑ گیا

اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ تو اُس کی بانہیں انتظار میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نگاہیں اُس راہگذر پر جمی ہوئی تھیں، جس رہگذر سے نہ جانے کتنے پردیسی دل توڑ کر جا چکے ہوں گے۔

مجھے رام نگر میں بھیا سے ملنے جانا تھا۔ دِن ڈھل چکا تھا سوچا آج یہیں ٹھہر جاؤں اور پھر کسی الھڑ جوانی نے التجا کی تھی۔ "شامو چاچا کہا کرتے ہیں۔ بیٹا، تم یہاں سے کئی بار گذرے۔ لیکن ہمارے یہاں کبھی نہیں آئے۔" میں شامو چاچا کے یہاں چلا آیا اور جب میں آنگن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بیٹھا، چاچا سے باتیں کر رہا تھا تو وہ کمر پر پانی کی گگری دھرے آئی۔

"یہ کون ہے چاچا ———؟" میں نے پوچھا۔

"ارے اپنی رسیا ہے!" چاچا نے جواب دیا اور حقّے کا ایک لمبا کش کھینچ لیا۔ میں سوچنے لگا۔ رسیا سچ اپنے نام ایسی رسیلی ہے کمر پر دھری گاگر سے پانی چھلک چھلک کر اُس کی کُرتی کو بھگو رہا تھا اور جوانی کے اُبھار نمایاں ہو رہے تھے۔

* * * * * * * *

آدھی رات گئے تک میں کھاٹ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ میں نے رسیا کی کھاٹ کی طرف دیکھا تو چاند کی جوت اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے چاند کو دیکھ کر سوچا۔ ایک چاند میرے پاس بھی تو پڑا ہے۔ رسیا نے میری

[illegible] سے [illegible] آگ سی لگ گئی۔ میں پیاس سے [illegible] کی طرف اپنا [illegible] تک پہنچا ہی تھا کہ چاچا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"پیاس لگی تھی چاچا" میں نے جواب دیا اور کنارے کے پاس دھرے ہوئے گھڑے سے کٹورے میں پانی لے کر بیٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے میری نظر پھر رتیا کے چاند سے مکھڑے پر پڑی اور میرے جی میں آئی کہ چیخ اٹھوں۔

"چاچا دل کی پیاس بجھانے لگا تھا"

مسکراتے ہوئے چاند کو دیکھتے ہوئے کبھی رتیا کو اپنے ہی ہونٹ کاٹتے دیکھا ——— کروٹیں بدلتے سویرا ہو گئی

صبح ہوتے میں بیٹھا جوتی میں پڑی ہوئی ریت جھاڑ رہا تھا اور رتیا آنگن میں پائل چھنکاتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔

"آ پھر گئے ساجن۔ ہمارے ان سنگ"

دروازے سے باہر نکلنے لگا تو چاچا بولے "بیٹا کبھی کبھار آ جایا کرو نا"

"اچھا چاچا کوشش کروں گا"

میں یوں کہہ کر واپس نگر کو چل پڑا۔ پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ کیا کبھی پردیسی بھی لوٹ کر آیا کرتے ہیں؟ لیکن رتیا کے نین؟ نین تو یونہی نینوں سے الجھتے رہیں گے۔ پنگھٹ پر بہنیں ہمیشہ ہی کسی کی راہ تکتے ہوئے گیت گاتی رہیں گی

دن کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں تیزی سے چلتے ہوئے گنگنانے لگا۔

"آ پھر گئے ساجن ہمارے ان سنگ"

تھک کر میں سڑک سے ذرا پرے آموں کے باغ میں سستانے کو بیٹھ گیا۔ کچھ آم خریدنے کے بعد جب میں آموں کی قیمت دینے لگا تو گویا کھنکتی ہوئی جوان لڑکی مسکرائی اور بولی "ہم پردیسیوں سے کچھ نہیں لیا کرتے" میں سوچنے لگا کیا یہ لڑکی سچ کہتی ہے ———؟

تم نہ آئے!

ساجن! تم نہ آئے۔ جیون بیتا جا رہا ہے۔ بہاریں لوٹ گئیں۔ آشاؤں کی پھلواری بھی سوکھ گئی۔ تم تو کہا کرتے تھے "پریتما۔ تمہیں بھول جاؤں یہ ممکن نہیں" لیکن اب تمہیں تمہارے وعدے کیسے یاد دلاؤں۔ پیپل کی چھاؤں اب بھی ویسی ہی گھنیری ہے۔ میں جلتی ہوئی ریت پہ چلتی ہوئی اب بھی وہاں جا بیٹھتی ہوں۔ اور تمہاری راہ تکا کرتی ہوں۔ سبھی تو پردیس جاتے ہیں۔ لیکن تمہارے ایسا کسی کا دل کٹھور نہیں ہے۔ سہیلیاں پوچھتی ہیں "پریتما، تجھے کیا ہوا جاتا ہے؟" انہیں کیا جواب دوں؟ کہہ دوں کوئی اپنا پرایا ہو گیا ہے؟

جب آسمان پر دھنک تمہاری سات رنگی پگڑی کی طرح جھلملانے لگتی ہے۔ تب میری نگاہیں تمہیں ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ میں کھلیانوں میں، پنگھٹ پر تمہیں ڈھونڈنے نکل جاتی ہوں۔ لیکن تمہیں ڈھونڈ نہیں پاتی۔ تھک ہار کر جھروکے میں آ بیٹھتی ہوں اور میری نگاہیں آکاش کے کنارے جم کر رہ جاتی ہیں۔ سکھیاں ٹھٹھول کرنے لگتی ہیں۔

"پریما! اس دھنک میں کسے ڈھونڈ رہی ہو۔ آکاش کے کنارے پر کس کی تصویر بنا رہی ہو؟"

"اوہ، موہن بھیا کا انتظار ہے شاید؟" رتنا چھیڑنے لگتی ہے۔ پھر سبھی ہنسنے لگ جاتی ہیں اور میری پلکوں سے آنسو ڈھلکنے لگتے ہیں۔

چاندنی راتوں میں، کھلیانوں میں اب بھی سائے لرزتے ہوئے ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں۔ میں بھی رات گئے تک کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑی تمہاری راہ دیکھا کرتی ہوں۔ جب اوس کلیوں کا منہ دھونے لگتی ہے تو میں تھک کر گھر لوٹ آتی ہوں۔ میں وہاں تمہارا انتظار اس لئے کرتی ہوں کہ شاید تمہیں کبھی بھولے سے میری یاد آ جائے۔ تم لوٹ آؤ۔ اور جیسے ان سوکھے سوکھے کیکروں میں پہلے پہلے پھول پھوٹ آئے ہیں۔ یونہی میرے جیون کی سوکھی ہوئی پھلواری میں بھی بہار آ جائے۔

برکھا کی رت ہے سکھیوں نے باغوں میں جھولے ڈالے ہیں۔ دور دور تک پھیلی ہوئی ہریالی کو دیکھتی ہوں، تو ہونٹوں پر مسکان آ جاتی ہے

لیکن جب اپنے دل میں جھانکتی ہوں تو گرد اُڑ رہی ہے، بگولے اُٹھ رہے ہیں۔ باغوں میں کوئلیں کوک رہی ہیں اور میرے دل میں ہوک سی اُٹھنے لگی ہے۔ بیتی باتیں، منوہر سپنے بن کر میری آشاؤں کو جگانے لگی ہیں۔

ایسے ہی دن تھے ننھی ننھی بوندیں برس رہی تھیں۔ دل میں آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں اور تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا "میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ تم چنتا میں کیوں ڈوب رہی ہو؟" جب ہی میری پلکوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے اور اب بھی ڈھلک رہے ہیں! میری آنکھیں اُس پگڈنڈی پر جمی رہتی ہیں جو آموں کے باغ کے پاس سے گزرتی ہوئی اکاش کے کنارے جا کر گم ہو جاتی ہے۔ میں اسی پگڈنڈی کو تکا کرتی ہوں۔ روز راہی آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ تھکے تھکے راہی، لیکن اُن کی آنکھوں میں آشا کی جوت ہوتی ہے۔ اسی آشا کی جوت سے میری آنکھیں بھی چمکتی ہیں، لیکن زندگی کے دن اس پگڈنڈی کی مانند گزرتے ہیں، جن پر سے راہی ایک بار گزر کر لوٹ کر نہیں آتے۔

کل ایک راہی اسی آم کی چھاؤں میں آکر بیٹھ گیا جس کی چھاؤں میں تم بیٹھا کرتے تھے مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میری آشا کی پھلواری مسکرا دی ہو۔ جب میں تیز تیز چلتی ہوئی باغ میں پہنچی۔ ایک پیڑ کے پیچھے سے چھپ کر دیکھا تو وہ "کوئی اور تھا۔ ایک طوفان خاموش ہو گیا۔ میں دھیرے دھیرے بوجھل جی سے لوٹ آئی اور رتنا کے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگ گئی جب بھی پگڈنڈی پر گرد اُڑتی ہے، تو مجھے تمہارا وہم ہونے لگتا ہے۔ پیتم! میرے نرموہی پیتم! آشاؤں کے سپنے روز ٹوٹتے ہیں۔ لیکن تم نہ آئے۔

پردیسی لوٹ کر نہیں آتے! لیکن تم تو پردیسی نہ تھے۔ تم تو میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ میرے ساجن! بولو لوٹ کر کب گھر آؤ گے۔ تمہیں کس کے ہاتھ سندیسہ بھیجوں؟ اِن گھری ہوئی گھٹاؤں سے کہوں! بادلوں میں شرما کر منہ چھپاتے ہوئے اس چاند سے کہوں—! یا ان اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی پیاری پیاری ہواؤں سے—؟ سبھی تو پردیس جا کر پردیسی نہیں بن جاتے! سبھی سکھی سہیلیوں کو اُن کے ساجنوں کے سندیسے آتے ہیں۔ کل کامنی کو خط آیا ہے۔ وہ پگلی نہیں سماتی۔ اُس کی آنکھوں میں مستی چھائی ہے۔ وہ مسکرا مسکرا کر خط پڑھ رہی تھی۔ لکھا تھا "میں تمہارے لئے گہنے لاؤں گا۔ ساون کی مدماتی رُت میں میرا یہاں اکیلے جی نہیں لگتا——" لیکن مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے تھا۔ بس ایک سندیسہ بھیج دیتے۔ اسی سے مجھے قرار مل جاتا——!

میں جھروکے میں بیٹھی ہوں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی چھائی ہے۔ ایک راہی گاتا چلا جا رہا ہے۔

"راہی تیرا دُور ٹھکانا —— دُور"

میری پلکوں سے آنسو ڈھلک رہے ہیں کس سے کہوں دل کا حال؟ ساجن۔ تم نہ آئے! جیون بگیا سے روٹ چلی ہے بہار——!

(طبع نادم)

آنسو

از:- جناب سحر شاد صدیقی

زندگی کے اداس لمحوں میں
بیتے دن جب بھی یاد آتے ہیں
میری پلکوں کے آسماں پہ ندیم
کچھ ستارے سے جھلملاتے ہیں

جیسے برکھا کی بھیگی راتوں میں
لُوٹ لے کوئی چاندنی کا سہاگ
اور تنہائیوں کے سائے میں
چھیڑ دیں سرد آہیں دیپک راگ

درد نے دل میں کروٹیں بدلیں
کون یاد آگیا ہے خدا جانے؟
آہ نے لی لبوں پہ انگڑائی
بس گئے انکھڑیوں کے ویرانے

جیسے بکھرا ہوا تخیل ہو
جیسے ٹوٹے ہوئے ستارے ہوں
جیسے ہنگامِ صبح، گلشن میں
شبنمستاں کے کچھ نظارے ہوں

جس کو سرمایۂ حیات کہیں
بھول سکتا ہوں میں کہیں وہ رات
اُن کے اٹھتے ہی پھوٹ نکلے اشک
اُن کے جاتے ہی آگئی برسات

ایک حمام میں تین ننگے

افسانہ

از

جناب سعید امرت

دھوپ پوری طرح کھل آئی تھی - اور اس کی تمازت سے بدن بری طرح تپنے لگا تھا - برابر کی اونچی چھت کا سایہ بھی سمٹتے سمٹتے ہٹ گیا

"اُف اللہ ——— !" وہ دھوپ کی تیزی سے بیزار ہو کر تنکی - کروشیا، ڈی - ایم - سی اور ادھورے غلاف کو تیلیوں کی بنی ہوئی پٹاری میں رکھ کر نیچے اتر آئی - کمرے میں آئی تو ہوا کی خنکی نے بدن میں آفت مچا دی - دھوپ میں تپا ہوا بدن سرد ہو گیا -

وہ جھنجھلا سی اٹھی ——— عجیب مصیبت ہے، دھوپ میں بیٹھو تو کھائے جاتی ہے، کمرے میں آؤ تو ٹھنڈ کے مارے کپکپی اٹھتی ہے بدن میں ——— پٹاری کو بے دلی سے ایک کونے میں پھینک کر وہ پلنگ پر اوندھ گئی - بدن میٹھی میٹھی لطف انگیز تھکن سے ٹوٹ رہا تھا - دونوں بازوؤں کو اوپر پھیلا کر اس نے لمبی انگڑائی لی خواہ مخواہ کی سسکیاں اس پر ٹوٹ پڑیں - بدن کی تمام ہڈیاں چڑچڑا گئیں - کمر کی ہڈی کو تو کوئی جیسے دھیمے دھیمے ٹھونک رہا تھا - ہلکے درد کے سرور نے اسے بے قرار کر دیا - آنکھیں نڈھال ہو کر مند گئیں، اور جسم ڈھیلا ڈھیلا سا ہو کر ڈھیر ہو گیا اور اس کی بات بات پر بہک جانے والی ادھوری جوانی خواب کے جزیروں میں منڈلانے لگی -

وہ بوجھل، گہری اور گھٹی ہوئی فضا میں تتلی کی طرح اڑ گئی - ہر طرف سرخی مائل سنہری گرد فضا میں گھل رہی تھی - آس پاس کوئی بھی چیز صحیح نظر نہ آتی تھی - وہ اڑی جا رہی تھی - اس سرخی مائل سنہری گرد سے بوجھل فضا سے دور ——— کئی سو میل دور آسمان پر کوئی نیلا تارا چمکا - وہ اس نیلے تارے کی طرف لپکی - ہلکی ہلکی نیلی روشنی آ رہی تھی - وہ تیزی سے اڑ کر اس تارے کے قریب پہنچ گئی - تارے کی باریک اور چمکیلی کرنیں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں - اس نیلے تارے کو دیکھ کر وہ ابھی حیران ہی کھڑی تھی کہ اچانک اس تارے کی ایک جھلملاتی کرن سے ایک انسان ——— ایک اجنبی پھوٹ کر نکلا - اور اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے کر اس آسمان سے اوپر ایک اور آسمان کی جانب پرواز کر گیا -

کچھ دیر تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی لیکن ہوش آنے پر وہ چونکی - اپنے آپ کو ایک اجنبی مرد کی آغوش میں محبوس دیکھ کر وہ مچل گئی - اس کی گرفت آہنی تھی - وہ پوری کوشش کے باوجود ہل بھی نہ سکی - مجبوراً وہ چیخی چلائی اور اس اجنبی کی کلائی پر کاٹ لیا - جواب میں اس خوبصورت اجنبی نے اس کے نرم و نازک حسین لبوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے - اجنبی کی آنکھوں میں نشہ تھا، خمار تھا - اس کی تمام کشمکش مردہ اور بے جان ہو کر رہ گئی - اس کی جادو بھری آنکھوں کا سحر نکما ہو گیا - رگوں میں ابلتے ہوئے خون کی حدت ختم ہو گئی کٹی ہوئی شاخ کی طرح وہ اجنبی کے بازوؤں میں آ گری - یکایک اجنبی کو جھٹکا سا ہوا اور وہ بے قابو ہو کر اجنبی کے ہاتھوں سے چھٹ گئی - زمین قریب آتی جا رہی تھی اور وہ ——— ہلکی سی چیخ سے اس کی آنکھ کھل گئی - دہشت اور خوف سے اس کے بدن پر پسینہ جھلک رہا تھا جسم میں سرسراہٹ دوڑ رہی تھی - کتنا مزا تھا اس کی گرفت میں ؟

کچھ سوچ کر بے اختیار وہ اپنے ہونٹوں کو دیکھنے لگی - ہونٹ خشک تھے، بالکل خشک ——— ! دھڑکتا ہوا دل، کھویا ہوا دماغ اور خیالوں میں ایک نئی کیفیت لئے وہ باہر آ گئی - روفی آپا کو دیکھا - وہ اپنے کمرے میں بند تھیں - چپکے چپکے کواڑوں کے قریب جا کر جلدی سے کمرے میں گھس گئی - روفی آپا نہ جانے کیا پڑھ رہی تھیں - اسے دیکھ کر چوروں کی طرح سہم گئیں - گھبراہٹ میں اسی کے سامنے وہ پرچہ پلنگ کی نواڑ میں ٹھونس دیا -

"آپا بی ———" وہ بھی اپنے اچانک آ جانے پر کچھ خجالت محسوس کر رہی تھی - "وہ ——— !" اس نے مجبوراً بات بنائی - "وہ جو نمونہ آپ نے بتایا تھا نہ بیج، ذرا پھر بتا دو مجھے !"

"کچھ بتا بھی ہے تیرے دماغ میں؟" آپا رو کھائی سے بولیں۔

"اچھا، لا بتاتی ہوں"

وہ روفی آپا کے قریب بیٹھ گئی۔ آپا کے بدن سے باسی خوشبو کی لپٹیں اٹھ اٹھ کر اُس کے سانسوں کو مہکا رہی تھیں۔ آپا بے دھیانی سے جھکی ہوئی، اُس کے لئے کروشیا کا نیا نمونہ بنا رہی تھیں۔ اُس نے روفی آپا کو دیکھا۔

"کتنی اچھی لگتی ہیں آپا ——— ! بھرا بھرا بدن گول مول سا، اور خون تو دیکھو کتنا ہے پنڈے میں، سُرخ انگارہ ہو رہی ہیں بالکل۔ اور ایک میں ہوں، سوکھی سی لکڑی ——— جیسے کھانے کو ملتا ہی نہیں کچھ!

آپا روفی کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ اُس کی آوارہ اور بے قرار نظریں روفی آپا کے سینے پر جا ٹھہریں۔ ہاتھ کی تیز حرکتوں سے اُن کی چھاتیاں اُچھل اُچھل کر لرز رہی تھیں۔ جیسے موجوں کے ہونے اُس نے اپنے سینے پر نگاہ ڈالی۔ کتنا ذرا سا اُبھار ——— بس یونہی سا ———

"لے!" آپا نے نمونہ بنا کر لاپروائی سے اُس کے آگے بڑھا دیا۔ وہ نمونہ لے کر چلی آئی۔ اچانک ایک سوال دل میں کوندا۔ "وہ ——— آپا بی نے پڑھتے پڑھتے کیا چھپایا تھا؟"

"اچھا، لو ابھی ———" مُسکرا کر اُس نے روفی کو آواز دی۔ "آپا بی، امّی کہہ رہی ہیں۔ آگ سُلگا لو ذرا، وقت ہوا جا رہا ہے، شاہد بھائی کالج سے آتے ہی ہوں گے"

اِدھر آپا آگ سلگانے گئیں۔ اور وہ اُدھر آپا کے کمرے میں۔ نواڑ کی تہ میں چھپایا ہوا پرچہ اُس نے نکال لیا۔ بلاوز میں رکھ کر اطمینان سے کمرے میں واپس آ گئی۔ پرچے میں لکھا تھا ———

"روفی! میں تمہاری ناراضگی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں نے کوئی خطا نہیں کی۔ تم قطعی وہمی ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ تم نے جو بات لکھی ہے، وہ بے بنیاد اور جھوٹ ہے۔ تمہارا شاہد سوائے تمہارے کسی اور کی جانب نگاہ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ کہیں ثریا نے تو نہیں بہکا دیا تم کو ——— یقین مانو میں اُن کے ہاں آج تک نہیں گیا۔ میں تو خود ہی اُن لڑکیوں کا کیریکٹر پسند نہیں کرتا ——— دیکھو آج آٹھ روز ہو گئے ہیں۔ تم سے ملے ہوئے۔ اتنا بُرا تو نہیں میں ——— ! کیا اُمید رکھوں کہ آج رات کھانے کے بعد مجھ کو عزت بخشی جائے گی۔

تمہارا شاہد

انجانے خوف کے شرارے اُس کے گرد پھیل کر چیخ گئے۔ اتنے بڑے راز کے انکشاف نے اُسے چکرا دیا۔

"ہوں ——— تو اتنے پانی میں ہیں آپا روفی، نہ جانے کتنے پردے اوڑھ رکھے ہیں انہوں نے اور بھولی کتنی بنتی ہیں۔ جیسے کچھ جانتیں ہی نہیں بیچاری ——— ! جب ہی تو میں کہوں کہ یہ مطلب کیا ہے۔ روز روز نیا جوڑا، گھنٹوں کنگھی چوٹی، کریم پوڈر کے توڑے۔ اللہ توبہ کتنی بری بات ہے یہ! امّی کو معلوم ہو جائے تو وہ ٹکڑے ہی اُڑا دیں آپا جی کے ——— تو پھر کہہ دوں امّی سے!

آج رات کو آپا ملیں گی شاہد بھائی سے! اُس کے خیال میں شاہد بھائی اور آپا روفی کے ہیولے آ کھڑے ہوئے۔ وہ ایک دوسرے میں سمائے ہوئے تھے۔ دو جسموں کے ملنے کے خیال سے وہ اپنے اندر ایک کیفیت سی محسوس کرنے لگی۔ جذبات، جستجو اور انکشاف نے اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔

یہ شاہد بھائی دراصل اپنے شہر سے کوئی خاص امتحان دینے آئے تھے۔ امّی کہتی تھیں کہ شاہد اُن کی خالہ کا بیٹا ہے۔ بہت نیک اور شریف ——— اب کہاں ہوٹلوں کے سڑے بُسے کھانے کھا کر مصیبت مول لے گا۔ کیا ہرج ہے اگر وہ دونوں وقت کھانا یہیں کھا لیا کرے گا۔ اللہ کے فضل سے گھر کافی بڑا ہے۔ ایک کمرے میں پڑا رہے گا۔ رہی پردے کی بات تو ابھی جنت اس کی بہن سے بھی چھوٹی ہے۔ روفی کا یہ ہے کہ وہ جتنے وقت گھر میں رہا کرے گا باہر نہ آیا کرے گی۔

شاہد بھائی کو آئے ہوئے چار ماہ سے زیادہ گذر چکے تھے۔ اس عرصہ میں کئی بار اُس نے دیکھا کہ آپا روفی چوکھٹ میں بے خبر کھڑی آسمان کو تک رہی ہیں۔ دوپٹہ کہیں ہے اور بال کہیں بکھرے ہیں۔ سامنے ہی شاہد بھائی مزے سے انہیں گھور رہے ہیں۔ کئی بار تو اُس نے ابا کو جا جا کر بتا بھی دیا۔ لیکن آخر کوئی حد بھی ہو۔ ہر دفعہ ہر روز یہی بات ——— !

کہیں بیٹھی اور اپنا پائی ہوئی بھوکی نظروں سے دیکھتے ہیں شاہد

بھائی روفی آپا کو، جیسے کوئی بچہ رس بھری چاکلیٹ کو۔

ایک دن تو عجیب سی بات ہوگئی۔ شاہد بھائی ناشتہ کرکے کالج جا رہے تھے۔ ابھی زینے ہی میں اترے ہوں گے کہ امّی اُن کی کوئی چیز لئے دوڑی ہوئی آئیں۔ بولیں۔

"جنّت ذرا یہ لپک کر شاہد کو دے دینا۔ ابھی زینے ہی میں ہوگا اپنے کمرے سے لے کر نکلا تھا۔ خدا جانے کس کام کی چیز ہے۔ چائے پیتے پیتے بھول کر میز پر چھوڑ آیا۔"

وہ دوڑی۔ اور جھپا کے سے ڈیوڑھی میں —— وہ ٹھٹک گئی۔ آپا روفی اور شاہد بھائی کچھ گھبرائے گھبرائے سے پاس پاس کھڑے تھے۔ آپا کو اپنے پردے کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ اور شاہد بھائی —— وہ تو بُری طرح بوکھلا رہے تھے۔

"لیجئے شاہد بھائی، یہ آپ کی کوئی چیز، بھول آئے تھے آپ اوپر"

کچھ کہے بغیر شاہد بھائی نے وہ چیز لے لی اور جھپٹ کر باہر چلے گئے۔ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے آپا روفی کو دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں گھبراہٹ اور خفت تھی۔ وہ سہمی ہوئی تھیں۔ تنفّس تیز اور حواس منتشر اور —— اور بہت سی باتیں تھیں اُس وقت اُن میں۔

"کوٹھے نہیں تھے نہ اوپر —— وہ لینے آئی تھی میں!"

یہ تھیں روفی آپا، اُن کی تیز اور رسیلی آواز خدا جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ چہرے کی شادابی کا نور، کھویا کھویا اجنبی سا احساس، وہ تو کچھ بھی نہ سمجھی۔ اُلجھی اُلجھی باتیں سوچتی لوٹ آئی۔

اور آج ——

آج آپا روفی رات کو کھانا کھا کر شاہد بھائی کے پاس، اُن کے کمرے میں جانے والی تھیں۔ یہ سوچ کر اُس کا ننّھا سا دل بے اختیار دھڑک اُٹھتا۔

آج آپا روفی کھانا کھانے کے بعد —— وہ سوچنے لگی۔

آپا روفی کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جائیں گی اور جا کر جھوٹ موٹ سو جائیں گی۔ امّی اپنے کمرے میں ہوں گی اور میں —؟ میں تو سرِ شام ہی سو جاتی ہوں۔ پھر چپکے سے آپا اپنے کمرے سے نکل کر دبے پاؤں شاہد بھائی کے کمرے میں چلی جائیں گی۔ وہاں وہ پہلے ہی سے آپا کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ آپا روفی کو —— اسی نیلے تارے والے اجنبی کی طرح اپنی گرفت میں دبوچ لیں گے۔ وہ اُن کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیں گے اور پھر —— !

جنّت نے اس سے آگے قصداً کچھ نہیں سوچا —— بس آپا روفی اور شاہد بھائی —— شاہد بھائی اور آپا روفی بس —— اس کے خیالات منتشر ہوگئے

—— . —— . —— . —— . ——

شاہد بھائی کالج سے آگئے۔ جنّت نے گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ "کتنے اچھے ہیں یہ شاہد بھائی، بالکل نیلے تارے والے اجنبی جیسے جبھی تو آپا لٹّو ہوکر رہ گئی ہیں، ان پر!"

صحن کو عبور کرکے وہ تیر کے مانند۔ گردن جھکائے اپنے کمرے میں گھس گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، انہیں کوئی سروکار ہی نہیں اِس دُنیا سے، اِس گھر سے، اور آپا روفی سے۔

"ہوں" وہ اپنے آپ ہنسی۔ امّی کہہ رہی تھیں، کتنا سیدھا بچّہ ہے بالکل گائے، گردن جھکائے اس طرح چلتا ہے، جیسے زمین پر کھوئی ہوئی سوئی ڈھونڈ رہا ہو" وہ تلملا کر رہ گئی۔

"آخر کیا سمجھتی ہیں امّی شاہد بھائی کو! اتنی ہیں بالکل۔ نہ اِن کے کاٹے کا منتر اور نہ چڑھائے کا اتار۔ خاموش کتنے ہیں۔ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ گُڑ کا لڈّو بنے ہوتے ہیں۔ جس کا جی چاہے بڑھ کر چکھ لے اور شکل تو کوئی دیکھے، کیسی معصوم سی بنا رکھی ہے"

آپا روفی نے چائے تیار کرکے کیتلی اُس کی طرف بڑھا دی۔

اُس نے پوچھا "کسے دے آؤں یہ چائے؟"

"انہیں"

"انہیں کسے —؟" وہ ستانے پر تُل گئی۔

"شاہد بھائی کو" شرمائی ہوئی آواز میں آپا بولیں۔

"میں تو نہیں جاتی" وہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

"تو میں دے آؤں؟"

"ابھی سے ——" اس نے نشتر چبھویا۔

"کیا؟" آپا کی آواز میں خوف اور رشک تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی چھ ہی بجے تھے۔ رات کے کھانے میں دو گھنٹے باقی تھے ابھی۔ ہر لمحے اُس کی بے قراری بڑھ رہی تھی۔ "آخر کب بجیں گے آٹھ"

آپا روفی کھانا تیار کر رہی تھیں۔ امّی مغرب کی نماز میں تھیں اور وہ شاہد بھائی کے کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی۔ شاہد بھائی سات بجے

کے قریب واپس آئے کھانا تیار تھا۔ وہ کھانا شاہد بھائی کے کمرے میں رکھ آئی۔ وہ ٹیبل لیمپ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ موم کی مانند پگھل گئی۔ کتنی خوبصورت اور بھوری آنکھیں ہیں ان کی، کتنے اچھے ہیں یہ۔ اگر یہ مجھے مل جائیں تو کیا ہو؟ کیا یہ مجھے نیلے تارے والے اجنبی کی طرح اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے؟ کیا میں ان میں سما نہیں سکتی؟ وہ دیوانے پن سے سوچے جا رہی تھی۔ شاہد نے اسے گھورا، انہی میٹھی نظروں سے۔ اس کے بدن سے روح جدا ہو کر شاہد کے قدموں میں جا گری۔ پھڑپھڑاتے ہوئے کپڑے کی طرح وہ بل کھا کر بے دم ہو گئی۔ وہ ان رس برساتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ وہ کوئی آپا روفی تو نہ تھی۔ جو مزے سے نظروں کا جواب نظروں سے دیتی۔ اسے خوف بھی تھا اور شرم بھی —— اور پھر وہ ابھی بہت چھوٹی بھی تو تھی۔

وہ شاہد بھائی کے کمرے سے بادلِ ناخواستہ چلی آئی۔ ورنہ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس شاہد بھائی کو دیکھے جائے صبح سے شام اور شام سے صبح تک۔

دس بج چکے تھے۔ جاڑے میں تو ویسے ہی آٹھ بجے سے نیند آ جاتی ہے۔ امی اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ شاہد بھائی کے کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ آپا روفی اور اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر ہوا کے بے کل جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ جاگ رہی تھی۔ بس ذرا سی آہٹ ہو —— اور وہ پیچھے پیچھے —— بہت دیر ہو گئی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ اب اسے شبہ ہوا —— کہیں آپا پہلے ہی سے تو نہیں چلی گئیں؟ یہ سوچ کر وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر آ گئی۔ باہر اندھیرا تھا، گھپ اندھیرا۔

وہ شاہد بھائی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ وہ اور قریب آئی۔ اندھیرے میں زمین پر گری ہوئی کوئی چیز اس کے پاؤں سے ٹکرائی۔ مدھم سی آواز سناٹے میں گونج گئی۔ شاہد بھائی آہٹ سن کر باہر آ گئے۔

اندھیرے میں دو قوی ہاتھوں نے اس کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کا سانس گھٹنے لگا —— اور شاہد بھائی کے وحشی ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو شاداب کر دیا۔ ان میں ٹھنڈک تھی، تازگی تھی، ایک ناتمام آسودگی ایک میٹھے خمار کے احساس سے۔ اس کی پلکیں بھاری ہوتے ہوتے جھک گئیں۔ اور جنت اپنے آپ شاہد بھائی کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔

شاہد بھائی سرگوشی کے لہجے میں بولے۔ "روفی چپ کیوں ہو تم؟ کچھ ناراضگی ہے کیا؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ شاہد بھائی پھر بولے۔

"روفی!"

وہ خاموش رہی۔

"روفی!" وہ تیزی سے بولے

"جی!" اندھیرے میں کسی اور جانب سے آواز آئی۔

یہ روفی تھی۔ روفی قریب آ گئی۔ شاہد بھائی کے سامنے ان کی جانی پہچانی روفی کھڑی تھی۔ تو پھر یہ ان کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی لڑکی کون تھی کون —— !

روفی غصہ اور شکست کے احساس سے تلملا رہی تھی۔ اس نے شاہد بھائی کے بازوؤں میں پھنسی ہوئی لڑکی کی شکل بھی نہ دیکھی۔ اس کے منہ پر تھوکا بھی نہیں۔ اور پھری ہوئی واپس آ گئی۔ شاہد بھائی اسے روشنی میں گھسیٹ لائے۔

"تم —— جنت تم —— ؟" اور شاہد بھائی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈانواڈول ہونے لگے —— شرم، خوف اور غصہ۔ ان کے جذبات میں بیک وقت احساس کی تین لہریں گتھم گتھا ہو کر ہلچل مچا رہی تھیں —— روفی اور جنت، جنت اور روفی —— یہ کیا ہوا؟ یہ کیسے ہوا؟ —— اب کیا ہو گا؟ —— اب کیا ہو گا —— ؟

اور صبح تینوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے —— خاموش اور کھوئے کھوئے، معصوم اور ناآگاہ۔ جیسے بات کچھ ہوا ہی نہیں —— کچھ بھی نہیں!

جنت سوچ رہی تھی، خواب کتنا سہانا اور حقیقت کتنی ڈراؤنی ہوتی ہے

(ملیح زاد)

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔

غزل

از
جناب سید حباب ترمذی شاہجہانپوری

نگاہِ حسن کافر بدگماں معلوم ہوتی ہے
خموشی حالِ دل کی ترجماں معلوم ہوتی ہے

حقیقت دل کی چہرے سے عیاں معلوم ہوتی ہے
کہاں کی چوٹ ہے لیکن کہاں معلوم ہوتی ہے

اے او جانے والے چند باتیں اور کرتا جا
تری باتوں سے کچھ تسکینِ جاں معلوم ہوتی ہے

قفس میں اور کیا جمعیتِ خاطر کا ساماں ہو
وہ دیکھو صاف شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جہاں تم نے کبھی ہنس کر نقابِ رخ الٹ دی تھی
وہاں اب تک مجھے ہر شے جواں معلوم ہوتی ہے

نہ جانے آنکھوں آنکھوں میں کوئی کیا کہہ گیا مجھ سے؟
یہ دنیا بے سبب کیوں بدگماں معلوم ہوتی ہے

اگر میری جبیں سائی کا دیکھیں دیکھنے والے
کہ اب کچھ اور شانِ آستاں معلوم ہوتی ہے

کوئی جانِ دو عالم جب تبسم ریز ہوتا ہے
تو یہ دنیا مجھے جنت نشاں معلوم ہوتی ہے

بہ باطن رفتہ رفتہ دل میں گھر کرتی ہے پتھر کے
بہ ظاہر سعیِ پیہم رائگاں معلوم ہوتی ہے

فلک پیراہنِ ابرِ سیہ میں کس قدر دلکش
شگوفہ کاریِ برقِ تپاں معلوم ہوتی ہے

کسی پردہ نشیں کی یاد کو شاید نصیبِ عشق!
مرے گہوارۂ دل میں اماں معلوم ہوتی ہے

محبت میں یہ عالم ہے مرے دل کی نزاکت کا
شعاعِ ماہِ تاباں بھی گراں معلوم ہوتی ہے

حباب ان آبجوئے عشق کی موجوں کو کیا کہیے
مجھے ہر موج بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے

افسانہ

سنیچر کی ایک رات

از

جناب مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

مجھے خوب یاد ہے۔ جمعہ کا دن اور شب کے نو بجے تھے۔ دوسرے دن سنیچر کو وائسرائے کپ ہونے والا تھا۔ نار تھمور جا کی میرا بے تکلف دوست گڈ بوائے پر سوار ہونے والا تھا۔ اُس نے انتہائے وثوق سے کہا تھا "مسٹر علیم! اُس عدیم النظیر اخلاص کے شکریہ میں جو تم کو میرے ساتھ وابستہ کئے ہے، ایک چانس دینا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسی کوئی طاقت نظر نہیں آتی جو گڈ بوائے کو وائسرائے کپ جیتنے سے باز رکھ سکے۔ یہ گھوڑا غیر معروف ہے اور کھلاڑیوں کو اس کی تیاری کا مطلق علم نہیں۔ بھاؤ بہت اچھا ملے گا۔ تم جس قدر روپیہ بتانے کی ہمت کر سکتے ہو بنا لو۔ ایسا زرّیں موقعہ شاذ و نادر ہی میسّر ہوتا ہے۔"

اتنی یقینی ٹیپ ملنے پر کون ایسا بے نصیب ہو گا جو پس و پیش کرے؟ لیکن میرے لئے دشواری یہ تھی کہ ہاتھ بالکل خالی تھا۔ روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں جمعہ کا سارا دن صرف کر دیا۔ یہ بھی سوئے اتفاق کہ جن جن احباب سے روپیہ حاصل ہونے کی توقع تھی۔ میری جیب کی طرح اُن کے آئرن سیف بھی لچھمی دیوی کی نگاہ لطف سے بے نیاز تھے!

صحیح کوشش ہو تو آسمان کے تارے بھی توڑے جا سکتے ہیں مجھے تو صرف تھوڑے سے روپوں کی ضرورت تھی۔ آخر سات بجے شام کو شریف سے ساڑھے تین ہزار روپے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ روپیہ نمبری اور بلا نمبری نوٹوں کی شکل میں تھا۔ میں نے صمیم قلب کے ساتھ شریف کی شکر گزاری کی اور تمام نوٹ جیب کے حوالے کر کے رخصت ہوا۔

چورنگی پہنچنے پر خیال آیا کہ ایک دفعہ پھر نار تھمور سے مل کر مزید اطمینان کر لینا بہتر ہے — وہ روزانہ شب کو گرینڈ ہوٹل میں پینے پلانے کی غرض سے اسی طرح آیا کرتا تھا جیسے اتوار کے روز گرجا گھر عبادت کے واسطے جانا فرض تھا۔ ہوٹل میں داخل ہوا تو اُسے ٹیبل کے سامنے شراب نوشی میں مشغول پایا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی "ہیلو مسٹر علیم!" کہتے ہوئے سامنے والی خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے اُس کی خواہش کی تعمیل کی۔

"کل کے لئے تیار ہو؟"

"ہاں، ہاں۔ بھلا اتنا بہتر چانس چھوڑا جا سکتا ہے؟"

"کچھ پیو گے؟"

"شکریہ، سارا دن روپے کی فکر میں دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ بے انتہا شل ہو چکا ہوں۔ آرام نہ کیا تو طبیعت بدمزہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

"ٹھیک، ٹھیک۔ مگر برانڈی کے دو پیگ ساری کسل دور کر دیں گے۔ اس وقت تم کو یقیناً ڈرنک کی ضرورت ہے۔"

اُس نے بوائے کو اشارہ کیا اور وہ برانڈی کے دو گلاس لے کر حاضر ہو گیا۔ کم و بیش ایک گھنٹہ گپ لڑتی رہی۔ وہی ریس، گھوڑے اور ٹرینر اور جاکیوں کے قصے۔ پھر ہم دونوں "شب بخیر!" کہہ کر جدا ہوگئے۔

ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی کی فکر میں کھڑا ہی ہوا تھا کہ برجو نے سامنے آ کر فرشی سلام کیا۔ پھر ایسے انداز سے خاموش کھڑا ہو گیا، جیسے کچھ عرض کرنا چاہتا ہے! وہ کلکتے کا مشہور ترین دلال تھا۔ خریداروں کو یوروپین اور اینگلو انڈین چھوکریاں سپلائی کرنا اُس کا پیشہ تھا۔ اب سے پہلے میرے بھی چند کام کر چکا تھا۔ اُس کا ملتجیانہ انداز تاڑتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔ "کچھ کہنا چاہتے ہو برجو؟"

"ہاں بابو! بہت بڑھیا مال ہے — پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں۔"

"آج تو بہت تھک چکا ہوں۔ آرام کے سوا کسی تفریح کی ضرورت نہیں۔"

"ایسا مال گھڑی گھڑی ہاتھ نہیں لگتا بابو! ایسی دلچسپی ہوتی تو ہرگز نہ ٹوکتا۔ یہ مال تو آپ ہی کے قابل ہے"۔
"یورپین ہے یا اینگلو انڈین؟"
"ہے تو اینگلو انڈین ہی مگر یورپین تو اس کے تلوؤں کی برابری نہیں کرسکتیں"۔
"بھلا خرچہ کتنا بیٹھے گا؟"
"کچھ بھی نہیں بابو! دس دس کے دو نوٹوں میں خوش ہوجائے گی۔ گاڑی بھاڑا اور چائے پانی اس کے علاوہ۔ میرا کیا ہے جو بخشش دیجئے گا۔ سلام کرکے لے لوں گا"۔

~~~~~~

برجو کی باتوں میں جادو کی گھلاوٹ تھی۔ بے حد کسل مندی کے باوجود کہنا ہی پڑا۔ "اچھا تو دکھاؤ اپنا مال"۔
اُس نے ساتھ آنے کا اشارا کیا اور میں دھاگے میں بندھی تیلی کی طرح عقب میں ہولیا۔ وہ نیو مارکٹ سے گذرتا ہوا ایک تنگ گلی میں داخل ہوا۔ گلی نسبتہً تاریک تھی۔ راستہ بھی کم کم چل رہا تھا۔ لالٹین کے کھمبے کے نزدیک ایک اینگلو انڈین چھوکری شانِ استغنا سے کھڑی تھی۔ چینیئی رنگ، اس میں لطیف چمک جیسے شاداب انگور، بڑی بڑی مست و صہبا ریز آنکھیں، لبہائے لعلیں لپ سٹک کی اعانت کے بغیر ہی یاقوتِ احمریں کے تراشے ہوئے دو ٹکڑے۔ صراحی نما گردن، گردن میں امیٹیشن سفید موتیوں کا دو لڑا، میانہ قامت، متناسب اور گداز جسم۔ بادی النظر میں حورِ ارضی معلوم ہو رہی تھی۔ اُبلتے ہوئے شباب کی رعنائیوں نے اُس کے حُسن میں اس قیامت کی جاذبیت ودیعت کر دی تھی کہ کبھی مرد کا ایک نگاہ دیکھنے کے بعد۔ دل پر قابو رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس کا لباس قیمتی تو نہ تھا، لیکن مروّجہ فیشن کے عین مطابق تھا۔
اُس کے جمالِ جہاں افروز پر ایک نظر پڑتے ہی ساری کلفت دور ہوگئی۔ معاملات میں اُلجھاؤ نہ تھا۔ میں نے جلد شرطیں منظور کرتے ہوئے ٹیکسی کرایہ کی اور اُس سراپا ناز کے پہلو میں جا بیٹھا۔ کوچبین نے ٹیکسی اٹھائی اور برجو نے پاؤ ندان پر کھڑے ہوکر لمبا سلام عرض کیا۔ گویا اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کرتا ہے ـــــ واقعی! اُس کی خدمت معقول انعام کی مستحق تھی۔ میں نے پانچ روپے کا نوٹ نکالنے کو جیب میں ہاتھ ڈالا، لیکن وہ اور نوٹوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ احتیاط کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کل نوٹ باہر نکال لئے اور پانچ کا نوٹ تلاش کرکے برجو کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ حسبِ معمول سلام کرکے پاؤ ندان سے اُترگیا۔
جذباتی سیلاب کے دھارے پر دھیرے دھیرے گاڑی بہنے لگی۔ ٹھنڈی سڑک چالو تھی۔ موٹروں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں پر میرے ہی طرح کے حُسن پرست جوڑے شباب و زیست کی رنگین کیفیتوں میں غرق بزمِ رازِ دنیا ازگرم کئے تھے ـــــ گرد و پیش کے حالات سے بے پروا تسکینِ جذبات کی غفلت آفرینیوں میں ڈوبے ہوئے۔ ایک ہی کشتی کا سوار ہونے کی حیثیت سے میں بھی جذبات کی طغیانیوں میں قلابازیاں کھانے لگا۔ مجھے مطلق محسوس نہ ہوتا تھا کہ کدھر جارہا ہوں یا کیا کررہا ہوں؟ ہوشربا للّی کی حسین صحبت نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔
للّی فی الواقع للّی ہی تھی۔ اُس کی باتوں میں حلاوت، اداؤں میں لگاوٹ اور رگاتوں میں گھلاوٹ اس حد پر تھی کہ اُس کا صحیح اندازہ آسان نہیں۔ وہ مشرقی لڑکیوں کے مانند حیا پرور یا شرمیلی بالکل نہ تھی۔ بلکہ مغربی شوخی و بے باکی رگ و پے میں سرایت کئے تھی۔ اُس کی باتیں وقت اور محل کی مناسبت سے تھیں۔ اُس کے دوچار ابھروں ہی سے مسحور ہوکر میں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ اگر اُس نے قبول کیا تو عرصہ تک معاشقہ قائم رکھنے کی سعی سے دریغ کو راہ نہ دوں گا۔
کم و بیش دو گھنٹے صراطِ جذبات پر گشت جاری رہی۔ ۱۲ بجے للّی نے واپسی کا پروگرام پیش کیا۔ دل تو گوارا نہ کرتا تھا کہ اتنا جلد یہ حسین ڈرامہ بند کیا جائے، لیکن دن بھر کی تکان اور ریس کے تصوّر نے اس کھیل کو آئندہ پر موقوف کرتے ہوئے واپسی کا مشورہ دیا۔ میں نے للّی کے فرمان پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ڈارلنگ! بے شک رات بھیگ چلی ہے، تم کو مکان واپس ہونا اور مجھے کل ریس کی تیاری کرنا ہے۔ لیکن ہم اُس وقت تک جدا نہ ہوں گے جب تک تم دوبارہ مجھے سرفراز کرنے کا پختہ وعدہ نہ کرلو۔ کیونکہ آج کی مختصر ملاقات نے میرے ذوق کی تشنگی فرو کرنے کے عوض کچھ اور بھی بھڑکا دی ہے! اور ـــــ اور اگر غیر مناسب نہ ہو تو اپنے پتے سے مطلع کردو کہ میں تمہارے حُسن کدے پر حاضر ہوکر تفریح کی درخواست پیش کرسکوں"۔
~~~~~~

"میرا پتہ ـــــ ۲ ولنگٹن اسٹریٹ، فلیٹ نمبر ۳ .... مگر تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل ٹھیک ساڑھے نو بجے گرینڈ ہوٹل کے سامنے تمہارا انتظار کروں گی۔"

"ضرور۔ سرنہ ـــــ کیا تمہارے کاشانۂ جمال میں میرا داخلہ ممنوع ہے؟"

"فی الحال مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔"

"خیر، خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ میں آہستہ آہستہ تمہارے لطیف و نازک دل میں گھر کرلوں گا۔ پھر تم کوئی پابندی عائد نہ کرسکو گی۔"

گاڑی دھیرے دھیرے وائسرائے ہاؤس کے سامنے جا پہنچی ہاؤس کے دروازے پر دو کانسٹیبل سنگینیں چڑھی بندوقیں کاندھے پر دھرے ٹہل ٹہل کر پہرہ دینے میں مصروف تھے۔ یکایک "پولیس پولیس" کے امداد طلب شور نے طلسم جذبات پارہ پارہ کرتے ہوئے سہما دیا۔ یہ الفاظ للی کی زبان سے ادا ہو رہے تھے ـــــ! آخر وہ کیوں پولیس کی مدد طلب کرنے پر مجبور ہوئی تھی؟ اُس کے ساتھ کسی طرح کا ظلم و جبر بھی تو نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی خواہش اور مرضی سے میرے ہمراہ تفریح کر رہی تھی۔ لیکن محل نازک اور غور و فکر کا موقعہ نہ تھا۔ سراسیمگی سے پولیس طلب کرنے کا سبب بھی دریافت نہ کرسکا بدحواسی کے عالم میں گاڑی سے کود چورنگی کی طرف بھاگا۔ بوکھلاہٹ میں قیمتی ٹوپی بھی وہیں چھوڑ دی۔ پاؤں کی ساری طاقت یکجا کرکے بھاگ رہا تھا۔ قدم قدم پر گرفتاری اور سزا کا خوف ہلاکت آفریں تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے ہاؤس کے چوکیدار تعاقب کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ بدستور اپنی جگہ پر تھے۔ عشق و ہوس کا بھوت بھی سر سے اُتر چکا تھا اور اس کی جگہ لفظ ناموس کے تصور نے حاصل کرلی تھی۔ بدشواری نیو مارکٹ کے سامنے پہنچ کر دم لیا۔ سانس پھول رہی تھی اور پیشانی پر عرق کی بوندیں نمایاں تھیں۔ اگرچہ دسمبر کا سینہ اور سرما کا شباب تھا۔ میں نے ایک بلڈنگ کے برآمدے میں کھڑے کھڑے حالات کا جائزہ لیا۔ واقعی پولیس کی زد سے محفوظ ہو چکا تھا۔ کوئی کانسٹیبل میرا جویا نہ تھا۔ قدرے اطمینان ہونے سے ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ سکون حاصل کرنے کو چائے کی پیالی طلب کی۔ اور اُس کی لطیف و شیریں چسکیوں کے ساتھ واقعہ کی علت پر غور شروع کردیا۔ انواع اقسام کے وجوہ ذہن نشین ہوئے۔

لیکن اُن میں کوئی بھی تیقن کا درجہ حاصل نہ کرسکا۔ چائے ختم ہو چکی تھی اور دم کا توازن نارمل درجہ میں آگیا تھا۔ رات کے ایک بجنے میں کچھ ہی کسر تھی۔ میں نے مکان واپس ہونے کا ارادہ کرتے ہوئے ہوٹل کا بل بیباق کرنے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہوش اُڑ گئے! سارے نوٹ جیب سے غائب ہو چکے تھے! صرف چند نقرئی سکّے اور تھوڑی ریزگاری باقی تھی جو پتلون کی جیب میں احتیاط کے طور پر ڈال لی گئی تھی۔

اب پولیس طلب کرنے کا راز افشا ہو چکا تھا۔ عیارہ چھوکری نے نوٹ ہتھیانے کے بعد ہی مرعوب کرنے کو "پولیس پولیس" کا بے ہنگام شور مچایا تھا۔ بے شبہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی اور میں احمق بن کر رہ گیا۔ نہیں، میں یہ چوٹ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ روپیہ یقیناً واپس کرنا پڑے گا۔ میں نے یہ روپیہ حاصل کرنے میں شدید زحمت اٹھائی ہے۔

میں چائے کی قیمت ادا کرکے ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ میرا دماغ مقصد برآری کی تدبیریں سوچنے میں مصروف تھا۔ نہ جانے کتنی تدبیریں ذہن نشین ہو ہو کر نظر انداز ہوگئیں۔ اچانک عبید کا دھیان آگیا۔ یہ ایک عربی نوجوان تھا۔ بلا کا طباع، فطرتی اور ہوشیار۔ کوئی سرکاری یا پبلک ادارہ ایسا نہ تھا جہاں اُس کی پہنچ نہ ہو۔ اُسے سینما سے عشق تھا۔ اس انتہا کا عشق کہ کھانا ترک ہو جائے، لیکن سینما کا طواف ناغہ نہ ہو۔ وہ عموماً ناولٹی میں فلم دیکھا کرتا اور ناولٹی اس مقام سے قریب تر تھا۔ عبید کا خیال آتے ہی مایوسیاں امید سے بدلنے لگیں اور میں نے ناولٹی کا رُخ کیا۔ اندیشہ تھا کہ تماشا ختم ہو کر وہ جا نہ چکا ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ آج وہ ناولٹی نہ آیا ہو۔ امید و بیم کے اُلجھاؤ میں اُلجھا ہوا ناولٹی پہنچا۔ حسن اتفاق سے فلم طویل ہونے کے باعث ابھی ختم ہوا تھا۔ اور تماشائیوں کے ریلے میں بہتا ہوا عبید برآمدے تک پہنچ چکا تھا۔

"ہیلو مسٹر عبید!" میں نے آواز دی اور وہ بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا میرے پاس آگیا۔

"علیم! تم اس وقت یہاں کیسے آگئے؟ کیا فلم دیکھنے آئے تھے؟ فلم تو کافی دلچسپ ہے۔" عبید نے مصافحہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ میرا جواب تھا۔ "اس وقت تو صرف تمہاری تلاش میں آیا ہوں۔ بڑی خیریت ہوئی کہ ملاقات ہوگئی۔ ورنہ سخت پریشانی ہوتی۔"

اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا "کیوں — کیوں؟ خیر تو ہے؟"

"میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ تمہاری دست گیری کے بغیر میرا کام سنور نہیں سکتا۔"

"میں تمہاری خدمت کو بسر و چشم حاضر ہوں۔"

میں نے اختصار کے ساتھ روداد بیان کی۔ اُس نے کہا "ایک بج چکا ہے۔ تاہم کوشش ناگزیر ہے۔ چلو پولیس سٹیشن رپورٹ درج کرادیں۔ چورنگی کے ایک سارجنٹ سے بھی مدد ملنے کی توقع ہے۔ مگر اُس کی مدارات میں چالیس پچاس کا صرفہ ہے۔"

"میرے نزدیک پولیس میں رپورٹ کرنا دردِ سر ہے۔ سارجنٹ والی رائے بہتر ہے۔ مصارف کی پروا نہ کرو۔ ٹانگ برابر کی چھوکری مجھے احمق بنا گئی۔ اُس کی چالبازی کا بدلہ واجب ہے۔ ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ روپے پیسے کے معاملے میں میں کتنا بے جگر واقع ہوا ہوں؟"

عبید مجھے لے کر چورنگی روانہ ہوا۔ سارجنٹ کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی۔ ہنوز وہ اپنے قائم مقام کو چارج دے رہا تھا کہ ہم دونوں پہنچ گئے۔ اس سے عبید کافی بے تکلف تھا۔ اُس نے سارجنٹ کو کنارے لے جاکر سرگوشی کی۔ اولاً ہم لوگوں نے ہوٹل میں کچھ ڈرینک کیا۔ پھر کام کی گفتگو چھڑی۔ للی کے بتائے ہوئے پتے کا اعتبار نہ ہو سکتا تھا۔ کافی رد وقدح کے بعد رائے ٹھہری کہ بر حو سے صحیح پتہ معلوم کرنا چاہیئے وہ کرایہ روڈ پر رہتا تھا۔ ہم لوگ ٹیکسی نے کر روانہ ہوئے۔ باوہ گھنٹے میں ٹیکسی بر حو کی کوٹھری کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ اپنے کاروبار سے فراغت پاکر ابھی واپس آیا تھا۔ خلافِ امید ہمیں سارجنٹ کے ساتھ دیکھ کر خوف وہراس سے اُس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ میں نے اُس کو ڈھارس بندھاتے ہوئے للی کا پتہ دریافت کیا۔ اُس نے کہا "بابو! اُس کا ٹھکانا تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ وہ مجھے فری اسکول سٹریٹ میں ملی تھی۔ ضرورت مند بھی تھی۔ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ لیکن گاڑی بان کو جانتا ہوں۔ وہ سیالدہ سٹیشن سے متصل اڈگرٹے میں رہتا ہے۔ اس کا نام رحمن ہے۔ وہ ٹھیک ٹھیک پتہ دے سکے گا۔"

اڈگرٹے پہنچ کر رحمن کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کو کھول کر بیڑی خریدنے گیا ہے۔ ہنوز بات ختم نہ ہوئی تھی کہ رحمن بیڑی کے کش لیتا ہوا آگیا اور اپنی کوٹھڑی کے سامنے ہمیں سارجنٹ کے ہمراہ دیکھ کر تھرتھرانے لگا۔ سارجنٹ کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ مس صاحبہ دھرم تلہ سٹریٹ پر ۲۲ نمبر میں اُتری تھیں۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی تھیں۔ مجھے دس روپے کا نوٹ دے کر مکان میں گھس گئی تھیں۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔"

پھر ہماری مہم جاری ہوئی۔ ۲۲ نمبر کا فلیٹ بالکل تاریک پڑا تھا۔ اُس میں ایک اینگلو انڈین خاندان کے چند افراد سکونت پذیر تھے بار بار دستک دینے پر آواز آئی "کون ہے؟" سارجنٹ نے اُسے باہر طلب کیا۔ چند سیکنڈ بعد پینتیس چالیس سال کا گندم گوں مرد شب خوابی کے کپڑے پہنے باہر آیا اور اتنی رات گئے نیند میں مخل ہونے کی وجہ دریافت کی۔ سارجنٹ نے بالاختصار سبب ظاہر کر کے للی کو دریافت کیا، لیکن کرشچین نے لاعلمی و عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ سارجنٹ نے ثبوت کے طور پر گاڑی بان کے بیان کا حوالہ دیا اور مجرم کی امداد کے سلسلے میں گرفتار کر لینے کی دھمکی دی۔ تقریباً تیس منٹ کی بحث بحثی کے بعد اُس نے بتایا کہ للی نام کی کوئی لڑکی تو میرے یہاں نہیں آئی۔ البتہ روزی جو میری بھانجی ہوتی ہے ½۱۲ بجے اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی اور ایک بجے واپس گئی۔ وہ ۷۷ نمبر رپن سٹریٹ کے تیسرے فلیٹ میں مقیم ہے۔

آہستہ آہستہ مایوسیوں کی گھٹائیں چھٹنے اور امید کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ ہم لوگ رپن سٹریٹ ۷۷ نمبر کے سامنے ٹیکسی سے اُترے۔ یہ وسیع اور مرتفع عمارت تھی۔ متعدد عیسائی خاندان اس میں سکونت رکھتے تھے تیسرے فلیٹ پر سیکڑوں دستکوں کا جواب نہ ملا تو سارجنٹ نے دروازے کو ہاتھوں اور پاؤں سے پیٹنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ہمسایہ چونک چونک کر بیدار ہو گئے۔ انہوں نے اس مداخلت پر احتجاج بھی کیا، لیکن واقعہ کی نوعیت دریافت ہونے پر خاموش ہو گئے۔

قریب تھا کہ دروازہ ٹوٹ جائے کہ پندرہ سولہ برس کا چھوکرہ سٹکنی کھول کر برآمد ہوا۔ سارجنٹ پر نگاہ پڑتے ہی اس کا غیظ و غضب خوف و رجا سے بدل گیا۔ سارجنٹ نے ڈپٹتے ہوئے سوال کیا "مس روز کہاں ہیں؟"

لڑکے نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ گھر میں موجود نہیں۔"

"کہاں مل سکتی ہیں؟"

"بتا نہیں سکتا۔"

سوالات کرتے ہوئے ہم سب کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہی

رسمی سامان جو ہر عیسائی گھر میں دیکھا جاتا ہے، یہاں بھی تھا۔ الماری، سنگار میز، کپڑے رکھنے کی ڈولی، کرسیاں، ٹیبل اور مسہری قرینے قرینے سے موجود، در و دیوار خوشنما چھینٹ کے پردوں اور خوب صورت مرقعوں سے مزین۔ بستر کی سلوٹیں غماز تھیں کہ ابھی ابھی اُٹھ کر کوئی گیا ہے۔ میں سامنے والی ٹیبل پر اپنی ٹوپی دیکھ کر چونک پڑا اور سارجنٹ کو اُس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو سارجنٹ! ٹیبل پر میری ٹوپی رکھی ہے۔ روزی گھر نہیں آئی۔ تو یہ ٹوپی کیسے آگئی؟"

سارجنٹ نے میری دلیل قبول کرتے ہوئے چھوکرے پر سوالات کی بوچھاڑ جاری کر دی مگر وہ روزی کی عدم موجودگی کا آموختہ دہرائے گیا۔ آخر مجبور ہو کر سارجنٹ نے فلیٹ کی تلاشی شروع کی۔ گوشہ گوشہ چھان ڈالا۔ وہ سوئی تو نہ تھی کہ نظر نہ پڑتی۔ تاہم ٹوپی کا ہونا روزی کی موجودگی پر دال تھا۔ سارجنٹ ناکام رہ کر پھر سونے والے کمرے میں آگیا۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد اُس نے الماری کھول کر دیکھی۔ استعمالی لباس کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ اب اُس کی توجہ ڈولی کی طرف منعطف ہوئی۔ اُس نے جھٹ ڈولی کا پٹ کھول کر میلے کپڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ نصف ڈولی خالی ہو جانے پر روزی اُس کے اندر گٹھڑی بنی پائی گئی۔ "باہر تشریف لائیے مس صاحبہ! ہم لوگ آپ کے مشتاق ہیں۔" کہتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر مس صاحبہ کو ڈولی سے باہر کھینچ لیا۔ سچ مچ یہ روزی ہی تھی۔ بیم و رجا اور ڈولی کی گرمی نے اُس کے چنپئی حسن کو اور بھی دمکا دیا تھا۔ صہبا ریز آنکھیں بادۂ خوف کی آمیزش سے اور زیادہ مسحور کن ہو گئی تھیں۔ وہ سموم رجا سے بید مجنوں کی طرح لرزہ براندام تھی۔ یہ احوال ملاحظہ کر کے میرا دل تڑپ گیا۔ اگر احمق بن جانے کی ندامت اور ریس کا تصور مانع نہ ہوتا تو یقیناً اُس کی شاطرانہ عیاری سے درگذر کرتے ہوئے رقم معاف کر دیتا۔ مگر.....

سارجنٹ اُس سے اڑائی ہوئی رقم کے متعلق سوال کر رہا تھا اور اُس کی خائف آنکھوں کے سامنے اجلاس کا کٹہرا اور جیل کی سنگین عمارت ناچ رہی تھی۔ وہ انکار نہ کر سکی — اور انکار کر بھی کیسے سکتی تھی؟ جبکہ اُس کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت فراہم ہو چکے تھے۔ اُس نے زبانی جواب کے بدلے گیپے کی تہ سے تمام نوٹ نکال کر سارجنٹ کے حوالے کر دیئے۔ دس روپوں کے علاوہ کل رقم موجود تھی۔

"دس روپے کیا ہوئے؟" سارجنٹ نے دریافت کیا۔

"گاڑی کا بھاڑا دیا۔" اُس نے مختصر جواب دیا۔

میں اس کا سہمنا برداشت نہ کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی ہرج نہیں سارجنٹ! دس روپے صرف ہو گئے تو ہو جائیں۔ میری رقم واپس مل گئی۔ اِس لئے میں اِس کو پچاس روپے کا حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے معاف کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم بھی اِسے قانونی شکنجے میں جکڑنے سے درگذر کرو گے۔ اس کے لئے غالباً اتنی سزا کافی ہے۔"

ٹیکسی، سارجنٹ، روزی اور بر تجربہ پر دو سو روپے صرف کرنے کے بعد جب مکان میں داخل ہوا تو اذان کی تقدس آفریں صداؤں سے فضائیں معمور تھیں اور مشرقی افق پر سپیدۂ سحر جھلک رہا تھا۔ (طلوع زاد)

غزل

از

جناب شبنم رومانی بی کام

کاوشِ دل نہ رنجِ تنہائی
شامِ غم دوست بن کے موت آئی

اِک اُجالا سا ہے گھٹاؤں میں
رُخِ تاباں پہ زلف لہرائی

چشمِ ساقی سے پی کے "آبِ حیات"
عشق نے زندگی نو پائی

ہے مجھے اعتبارِ عہدِ وفا
بے سبب آپ نے قسم کھائی

پرسشِ حالِ غم خدا کی پناہ!
توڑ دی ہمّتِ شکیبائی

جیسے رقصاں ہوں چاند کی کرنیں
ہائے اک مہ جبیں کی انگڑائی

جب کسی نے وفا کا عہد کیا
مجھ کو بے ساختہ ہنسی آئی

ڈوب کر رہ گیا نگاہ کا تیر
اُف! یہ زخمِ جگر کی گہرائی

جس نے مجھ کو بھلا دیا شبنم
یاد اُس کی ہزار بار آئی

لیکن جب اس کے اولاد نہیں ہوتی تو وہ غمگین رہنے لگتی ہے۔ ایسی عورت کے لئے خاص دوا "محافظ اولاد" ہے۔ اس کے استعمال سے عورت کی اندرونی خرابیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں اور اولاد ہونے لگتی ہے۔ ایک شیشی "محافظ اولاد" ایک عورت کے لئے کافی ہوتی ہے اسکی قیمت دو روپے آٹھ آنہ ہے جن عورتوں کو ضرورت ہو۔ پتہ ذیل پر خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔ پارسل پر دس آنہ محصول لگیگا۔

زنانہ دواخانہ (بی - ایس) نمبر ۳۴ دہلی

(ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸)

رُومال

افسانہ

از

جناب منوّر اشرف

"یہ بُندے تو بہت اچھے ہیں — کہاں سے لئے تھے؟" آپا نے اُن کے بُندوں کو حریصانہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ یہ سفید موتیوں کے بُندے انہیں واقعی بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ویسے تو اُن میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ کچھ یونہی وہ انہیں اچھے لگتے تھے اور کسی کو شاید زیب بھی نہ دیتے۔ وہ یہ آویزے پہن کر بہت پیاری معلوم ہوتی تھیں۔

بمبئی سے بھیجے تھے حمید چچا نے۔" انہوں نے فخریہ لہجہ میں جواب دیا۔ "بالکل نیا ڈیزائن ہے۔ اس سے اچھے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔" اُن کی آنکھیں فرطِ مسرّت سے جگمگا اُٹھیں۔ شاید یہ نسوانی کمزوری کم و بیش ہر عورت پر ایسے موقعوں پر طاری ہو جایا کرتی ہے۔

"جی ہاں۔ اور یہ بھی سُنا ہے کہ ایسے بُندے تو بمبئی تو کیا ہندوستان بھر میں دستیاب نہیں ہو سکتے۔" میں نے لقمہ دیا۔ "ایک ہی جوڑی تو تھی جو دکاندار نے......"

"آپ چپکے بیٹھے رہئے۔" وہ رکھائی سے بولیں۔ "آپ کو کون بُلاتا ہے جو آپ یوں ہی......!"

"اور آپ خواہ مخواہ ڈینگیں مارتی رہا کریں، کوئی منع نہ کرے" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ہاں اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں انصاف کی کہنے سے باز رہوں تو اور بات ہے۔"

تو آپ کے پاؤں کون پڑا تھا کہ آپ ضرور دخل دیں۔" وہ تنک گئیں "مہربانی کرکے آپ میری باتوں میں نہ بولا کریں۔" "مجھے آپ کی یہی باتیں زہر لگتی ہیں۔"

لہجہ سے انتہائی سرد مہری اور روکھا پن مترشح تھا۔ میں جل بھن کر رہ گیا۔ وہ مجھے ہر وقت ایسے ہی جھڑک دیا کرتی تھیں۔ میں جتنا اُن کی طرف کھنچتا وہ اُتنا ہی بے رُخی سے پیش آتیں۔ آخر مذاق مذاق میں اِس قدر جلی کٹی سُنانے کا کیا مطلب؟ بعض اوقات تو اُن کے اس ذلیل کن رویّہ سے میری خودداری بھڑک اُٹھتی۔ جی میں آتا اُن کی صورت نہ دیکھوں۔ اُن کا ذکر تک فراموش کر دوں...... اُن کی دُنیا سے کہیں بھاگ جاؤں۔ اپنے دماغ کے آخری گوشوں سے اُن کی یاد نکال باہر کروں، لیکن دوسرے ہی لمحے یہ حالت نہ رہتی۔ میں سب کچھ بھول جاتا۔ میری جبینِ نیاز پھر اسی سنگِ آستاں پر جُھک جاتی، جہاں سے پیہم ٹھوکروں کے سوا کبھی کچھ نہ ملا تھا۔ اُن کی شخصیت میرے دل و دماغ میں کچھ اِس طرح گھر کر چکی تھی کہ مجھے اکثر ایسا معلوم ہوتا، جیسے میری ہستی اُن کے بغیر نہ ہونے کے برابر ہے...... لیکن اُنہیں تو شاید میرا احساس تک نہ تھا۔ آخر انہیں مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ میں سوچنے لگا۔

"اسے ہے۔ پھر جھگڑنا شروع کر دیا۔" آپا جو اُن کے بُندے اپنے کانوں میں اُڑس چکی تھیں، بولیں۔ "دیکھوں مجھے کیسے لگتے ہیں۔"

"یہ تمہیں بہت سج رہے ہیں آپا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر میں یہی پہنے رہوں، یا مجھے اور جوڑی منگوا دوگی؟"

"نہیں، آپ یہی رکھ لیں، میں منگوا لوں گی۔" انہوں نے کہا اور آپا میری طرف بڑی رعونت سے نظر ڈال کر آئینے میں جھانکنے لگیں لیکن میں نے کوئی ردِّ عمل نہ کیا۔

مجھے خاموش پا کر وہ بولیں۔ "آپا انہیں کس نے مارا ہے یا صورت ہی ایسی ہے۔" میں نے جھلّا کر مُنہ چڑا دیا۔

تمہیں نے ناراض کیا ہے اِسے۔" آپا نے جواب دیا۔

اور اچانک میری نظریں میز پہ پڑے ہوئے اُن کے رُومال پر جا پڑیں۔ یہ ایک ننھا سا سفید رنگ کا ریشمی رومال تھا اور رنگا رنگ دھاریاں پڑی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ خواہش ہوئی کہ یہ رومال میرا ہو جائے اور ابھی — اِس لئے آپا کی بات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں بول اُٹھا۔ "ہاں ہم ناراض ہیں تم سے

بے حد ناراض - آپا کو تو بُندے دے دیئے اور ہمیں کچھ بھی نہیں۔"

" اوہو - یہ بات ہے " وہ شوخی سے بولیں " منہ دھو رکھیئے گا پہلے ــــــ "

" اور اگر کوئی زبردستی قبضہ کرلے تو ؟ میں نے کہا -

وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں - وہ سمجھیں میں نے اُن کی کوئی چیز چھپالی ہے ، اور چڑانے کے لئے ایسا کر رہا ہوں اور جب کچھ معلوم نہ ہو سکا تو خفیف سی ہو کر گنگنانے لگ گئیں -

" لو بھئی - وہ رہا تمہارا حصّہ " آپا بولیں اور میز پر سے اُن کا رومال اُٹھا کر میری ناک کی طرف بڑھا دیا -

" اُونہہ ہوں - ہٹاؤ آپا - میرا تو دماغ اُلٹا جا رہا ہے - اتنا ذلیل رومال ..... "

وہ آپا کی طرف بڑھیں ، لیکن میں نے حق بحقدار کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ایک ہی جھپٹ میں رومال اپنی گرفت میں لے لیا -

" آپ اسے مہربانی کرکے مجھے دے دیں " وہ جھنجھلا کر بولیں " یہ آپ کے کسی کام کا نہیں "

" اس سے آپ کو غرض ؟ " میں نے جواب دیا - میں نے آپ سے تھوڑے لیا ہے "

" دیکھو میں کہتی ہوں ، مجھے یہ ذرا اچھا نہیں لگتا - تمہیں میرا رومال لینے کا کوئی حق نہیں "

" واہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں کہ مجھے آپ پر کوئی حق نہیں ہے " میں نے ڈھٹائی سے کہا - ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیئے تو ..... "

" بس بس میرا رومال واپس کردو " وہ بولیں " نہیں تو اچھا نہ ہوگا "

" تو کیا ہوگا - آپ رو ہی دیں گی نا ؟ "

" روئے میری بلا " وہ تیز ہو کر بولیں - سیدھی طرح سے میرا رومال دے دو - میں کہتی ہوں "

" آخر یہ آپ مجھ پر خفا کیوں ہو رہی ہیں - آپا سے پوچھیئے جنہوں نے یہ رومال مجھے عنایت فرمایا - بندہ تو چلا " اور رومال زور زور سے ناک سے رگڑتا ہوا باہر چل دیا -

بعد میں اُن کی آپا سے رومال کے معاملے میں مزید رنج چلی ہوگی - کیونکہ جب میں واپس آیا تو وہ ابھی تک کشیدہ سی تھیں

میں نے دو ایک دفعہ بلانے کی کوشش بھی کی تو اس قدر تلخی سے جواب دیا کہ میں کھسیانا ہو گیا - جی میں تو آیا کہ ناک پر دے ماروں رومال اُن کا - پھر بھی میں ایسا نہ کر سکا -

" رومال واپس دے دو نا بھیّا " آپا بسورنے لگیں " یہ خواہ مخواہ ناراض ہوئی جاتی ہے "

" رومال تو کسی صورت واپس نہیں کیا جا سکتا - میں نے رُعب جمایا ' اس لئے کہ اُن کے سامنے اپنی شکست مجھے کسی طرح منظور نہ تھی -

" واہ آپ کے ہاں یہ بھی انوکھا دستور ہے کہ مہمانوں سے اُن کی چیزیں ہتیالی جائیں " وہ بے بسی سے بولیں -

" اور اگر مہمان ہی گھر والوں کو لوٹنا شروع کردیں " - بے ساختگی میں میں کہہ اُٹھا -

اور نہ جانے وہ کتنا شرما جاتیں کہ امّاں جان آگئیں اور ایکدم سے بول اُٹھیں " بیٹی کبھی کبھار اپنی خیریت کی اطلاع دے دیا کرو نا - تم نے تو خط لکھنا ہی چھوڑ دیا "

امّاں جان ، یہ ہمارے خطوں کا جواب بھی تو نہیں دیتیں " میں نے حاشیہ چڑھایا -

" نہیں دیتے ہم جواب تمہیں ! "

" میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں ؟ "

" ہم نہیں لکھنا چاہتے - ہماری مرضی - دباؤ ہے کسی کا ؟ " اُن کی بن آئی - سب لوگ ہنس پڑے میں نے بھی دانت نکال دیئے -

" اچھّا تو مجھے لکھ دیا کرو " آپا نے شہ دی -

" جی نہیں ہم آپ سے خفا ہیں " انہوں نے رُوٹھے ہوئے انداز میں جواب دیا - ہم اب سے اپنی خالہ جان کو خط لکھا کریں گے " اور امّاں جان پھول کر کپّا ہوگئیں -

" واہ انہیں کیوں اور ہمیں کیوں نہیں ؟ "

اس لئے کہ وہ ہمیں اچھّی لگتی ہیں " انہوں نے کمال سادگی سے جواب دیا -

" اور ہم ؟ "

" تم سے کالج کے لڑکے تو مجھے زہر لگتے ہیں " کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا - میں نادم سا ہو گیا ..... کیا میں واقعی انہیں برا لگتا ہوں ..... میں سوچنے لگا - آخر وہ مجھ سے اِتنی متنفر کیوں ہیں ؟

"چلو بھئی، اب کھانا کھالو" امّاں جان نے حکم دیا اور ہم کھانے کے کمرے میں چل دیئے۔ میں نے جیب سے اُن کا رومال........ نکال لیا اور اُنہیں دکھا دکھا کر ہلانے لگا۔ کبھی میں اُسے ہاتھوں میں مسلنے لگتا۔ کبھی ناک سے لگاتا اور کبھی اُس سے پنکھا کرنے لگ جاتا۔ آپا کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ لال بھبھوکا ہوئی جا رہی تھیں اور میں اُسی طرح اپنے کھیل میں مصروف تھا۔

"یہ اچھّا نہیں" اُنہوں نے جیسے سپر ڈال دی۔

"کیوں؟"

"یہ زبردستی ہے"

"پھر؟"

رومال مجھے واپس کر دیجئے۔ میں اپنے ہاتھ سے دوں گی"

"وعدہ؟"

"وعدہ"

اور میں نے رومال اُن کے ہاتھ میں تھما دیا جسے اُنہوں نے مجھے لوٹانے کے بجائے اپنی قمیص کی اندر والی جیب میں ڈال لیا اور اس مکاری پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ میرے جی تو آیا کہ زبردستی رومال چھین لوں، لیکن حیا مانع رہی۔ پھر بھی کسی قدر تلخی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہہ ہی دیا "واہ آپا یہ ہیں آپ کی عزیز ترین سہیلی، اور خالہ زاد بہن۔ آہا کتنی شرافت ہے اِن میں"

"اُونہہ۔ لڑائی میں سب کچھ جائز ہے"۔ وہ کہنے لگیں۔

آپا ایک دم سے بول اُٹھیں "تم نے غلط کہا بنّو۔ اصل مقولہ یوں ہے کہ لڑائی اور محبّت ....."

"ہشت" اور ایک نرم و نازک ہاتھ نے آپا کا منہ بند کر دیا۔

کھانے کے بعد میں نے پھر سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھا، وہ انجان بن گئیں "اب کیا ہوا؟"

"میں نے کہا وہ رومال مجھے عنایت کر دیجئے"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟" اُنہوں نے آنکھیں نچا کر جواب دیا۔

"دے دو نہ بنّو۔ آخر کیا بڑی بات ہے" آپا نے وکالت کی "وہ بیچارہ اتنی دیر سے منتّیں کر رہا ہے"

"آپ ہماری بات میں نہ بولئے آپا" اُنہوں نے ٹوک دیا۔

"اگر اپنا فیصلہ تم خود ہی کر لیا کرو تو مجھے دخل دینے کی کیا ضرورت ہے" آپا بولیں۔ میں نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

"میں پوچھتی ہوں، آخر آپ کو اس رومال سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"بس مجھے اچھّا لگتا ہے، اور میں اِسے پاس رکھنا چاہتا ہوں"

"اونہہ یہ منہ ——" وہ کہنے لگیں۔ "جایئے ہوا کھایئے، رومال نہیں ملنے کا"

اور میں غصّہ میں زور زور سے زمین پر پاؤں مارتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا...... کیس تماشش کی لڑکی ہے.... میں کھولنے لگا.... جانے اِسے دوسروں کو ستانے میں کیا مزا آتا ہے۔ اِسے کسی کے جذبات کی بھی قدر نہیں —— میری خواہشات وہ ہمیشہ یوں ہی بیدردی سے ٹھکرا دیا کرتی تھیں۔ میری انتہائی خواہش ہوا کرتی تھی کہ میں اُن کی کسی چیز کو اپنا سکوں یا وہ میری طرف سے کچھ قبول کریں۔ اِس غرض سے میں اکثر رومال، انگوٹھیاں، بُندے، جھومر، غازے، سُرخیاں اور جانے کیا کیا الا بلا لا کے رکھ چھوڑتا تھا، لیکن اُن کی بے اعتنائیوں سے کبھی ہمّت نہ ہوتی تھی کہ یہ چیزیں اُنہیں پیش کر سکوں۔ اور یہ سب اکثر آپا ہی کے کام آیا کرتی تھیں، یا گھر ہی میں اِدھر اُدھر ضائع ہو جاتیں۔

خیال تھا کہ وہ میرے پاس ضرور آئیں گی۔ بہت دیر تک انتظار کرنے پر بھی وہ نہ آئیں تو میرا دل بھر آیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے.... کیا انہیں واقعی مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں۔

وہ پچھلے چند دنوں سے ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ اور پہلے بھی جب کبھی ہم اکٹھے ہوتے، سارا سارا دن ہنسی مذاق میں گذر جاتا تھا۔ میں اُن کی باتوں کو محض مذاق ہی سمجھتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ انہیں صرف میری تضحیک منظور ہے۔ اُف! میں اُنہیں کس قدر غلط سمجھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اُنہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دینے والا ہوں۔

—— اچانک میرے تصوّر میں ایک روح فرسا نظّارہ گھوم گیا —— جیسے صبح کا سہانا وقت ہے، ایک لطیف سی خاموشی طاری ہے ہلکی ہلکی مسرور کن ہوا چل رہی ہے۔ فضا میں سکون چھایا ہوا ہے۔ دور کہیں سے مدھم سروں میں گانے کی آواز آ رہی ہے۔ بہت ہلکی ہلکی، پاکیزہ اور آسمانی۔ میں ایک سبزہ زار میں کھڑا ہوں اور "وہ" آسمان پر سے مسکراتی ہوئی جھانک رہی ہیں۔ میں اُنہیں آغوش میں لینے کے لئے بازو پھیلا دیتا ہوں، لیکن وہ مُنہ موڑ لیتی ہیں۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں —— میری نگاہوں میں تاریکی چھا گئی۔ میرا دل

رو دان تھرا اُٹھا۔ کیا میری قسمت میں یہی انجام لکھا ہے؟

آخر کیوں؟ کیوں وہ مجھے التفات کے قابل نہیں سمجھتیں.....

وہ پہلے تو ایسی نہ تھیں۔ ہم بچپن سے اکٹھے کھیلتے آئے تھے۔ میری ذرا سی تکلیف پر اُن کی معصوم آنکھیں ساون کی جھڑی لگا دیا کرتی تھیں۔ میں روٹھ جاتا تو وہ کتنے پیار سے منایا کرتی تھیں۔ میرے بغیر وہ کھانا تک نہ کھایا کرتی تھیں، اور گھر والوں کے منع کرنے پر بھی کہ لڑکیاں لڑکوں سے نہیں کھیلا کریں، وہ میرے ساتھ ہی سارا دن آنکھ مچولی کھیلا کرتیں —— اور اب جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ لڑکپن گذر جانے پر سب لڑکیاں کیا اسی طرح اپنے ہم جولیوں سے پیش آیا کرتی ہیں؟ میں الجھنے لگا۔ "وہ شاید مجھے اب صرف ایک خالہ زاد سمجھتی ہیں اور بس" وہ اُن کا بچپن کا خلوص کہاں گیا..... کیا یہ میرا قصور تھا کہ میں نے انہیں کبھی اپنے جذبات سے آگاہ نہیں کیا، لیکن جذبات کہیں چھپائے بھی چھپ سکے ہیں۔ مانا کہ میں نے زبان سے کبھی اظہار نہیں کیا، پھر بھی کئی باتیں ایسی بھی ہوئی ہیں کہ وہ میری دلی کیفیات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر سکتی تھیں۔ لیکن یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ "وہ" سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنتی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں میرے جذبات کا علم نہ ہو، جبکہ نوشابہ اُن کی چھوٹی بہن، سب کچھ جانتی تھی، اور اس واقفیت کا اظہار اُس نے ایک دن کر بھی دیا تھا، جبکہ ہم چاند ستاروں پہ باتیں کر رہے تھے کہ وہ ایک دم سے بول اٹھی تھی۔ "بھائی جان آپ نے کبھی تارے گنے ہیں؟" اور اس بے موقع سوال پہ میرے بوکھلا جانے پر اُس نے خود ہی فیصلہ دے دیا تھا "آپ نے ضرور تارے گنے ہیں" —— کتنا صحیح اندازہ لگایا تھا اُس نے میرے متعلق۔ میں، جس کی اکثر راتیں آنکھوں میں کٹی تھیں۔ میں کچھ کھو سا گیا تھا اُس وقت۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں۔ نوشابہ تھوڑی دیر بعد خود ہی بولی "آپا بھی رات کو اکثر تارے گنا کرتی ہیں" اور شرارت سے ہنسنے لگی۔ وہ جھٹ سے بول اُٹھیں "اونہہ۔ ہم تو سرِ شام لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ اور دن چڑھے اُٹھتے ہیں۔ ہمیں کبھی یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ کب چاند ڈوبا اور ستارے غائب ہوئے۔" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دل کا چور چھپا نہ سکیں۔ اُن کی جھکی ہوئی گردن اور شرمائی ہوئی نظروں نے راز فاش کر دیا..... اور میں سوچنے لگا۔ وہ کون خوش قسمت ہے، جو اِن کی راتوں کو بے چین کر دیتا ہے، جس کا اِن کے دل میں اتنا خیال ہے۔ میں یا کوئی اور؟ میں یا کوئی اور —— ایک مدت سے مجھے یہی خیال ستا رہا تھا۔ لیکن اُس دن کے بعد بھی تو انہوں نے کوئی التفات ظاہر نہیں کیا تھا..... اُف!

دوسرے کمرے سے اُن کے اور آپا کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں..... گویا وہ مجھے بالکل فراموش کئے بیٹھی تھیں۔ میں ناراض تھا۔ اُن کی بلا سے۔ وہ خوش گپیوں میں مگن تھیں اور میں اتنی دیر سے اِدھر عذاب میں پڑا تھا۔ میرا خیال تھا وہ ضرور آئیں گی۔ بہت دیر تک چارپائی پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا، لیکن نیند پہلے ہی کہاں آیا کرتی تھی، جو اب آتی۔ آخر اُٹھا اور لکھنے کی میز پہ بیٹھ گیا۔ شاید اِس طرح دماغ کا غبار کچھ ہلکا ہو سکے، اور کاغذ قلم نکال کر لکھنے لگا۔ جانے کتنی دیر تک اِس شغل میں محو رہا کہ مجھے گردن پر کسی کے تنفّس کا گرم گرم لمس محسوس ہوا۔ چونک کر دیکھا۔ "وہ" مجھ پہ جھکی ہوئی پڑھنے میں مصروف تھیں۔ گھبرا کر جب میں نے مسودے پر نظر ڈالی تو حیران رہ گیا میرا پریشان دماغ آج ہی کے واقعات کو سپردِ قلم کر چکا تھا۔

"اوہو، تو آپ مضمون نگاری بھی کرنے لگے۔ یہ خبط کب سے سوار ہوا؟" انہوں نے دلربا انداز میں میز پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بس یونہی کبھی کبھی دماغ میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔" میں نے جھینپ کر جواب دیا۔

"اللہ بچائے اِس مرض سے۔" وہ بولیں۔ "خیر، لکھتے آپ اچھا ہیں۔"

"آپ کو پسند ہے؟"

"اوں۔ ہاں کچھ کچھ۔" انہوں نے نزاکت سے کہا اور میرے افسانوں کی کاپی اُٹھا کر پڑھنے لگیں۔ وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی دزدیدہ نظروں سے میری طرف بھی دیکھ رہی تھیں۔ میں اُن کے چہرے کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا۔ اُن کی رنگت لالہ گوں ہوئی جاتی تھی۔ کبھی تو وہ بہت شرما جاتیں اور اُن کے لب جیسے کچھ کہنے کے لئے ہلتے، لیکن وہ پھر پڑھنے میں مصروف ہو جاتیں۔ اُن کی شرمساری تھی بھی حق بجانب۔ میرے مضامین زیادہ تر میرے اپنے ہی خیالات و احساسات کا پرتو ہوا کرتے تھے، اور جو جو جذبات اُن کی بے اعتنائی یا التفات سے مجھ پر طاری ہوتے، میں انہیں افسانوں میں سمو لیا کرتا تھا، اور اِن تمام افسانوں کا مرکزی کردار "وہی" ہوا کرتی تھیں —— وہ پڑھنے میں منہمک تھیں اور میری حالت غیر ہوئی جاتی

تھی۔ میرے لئے یہ کیا کم تھا کہ وہ نفرت سے مُنہ پھیر کر چلی جاتیں، وہ اتنی دیر سے ان افسانوں میں غرق تھیں۔

آخر وہ کاپی پھینک کر بولیں "اِن افسانوں کے ہیرو غالباً آنجناب ہی ہیں"۔

"جی ہاں، کیونکہ میں جگ بیتی کا قائل نہیں"۔

"لیکن پوچھتی ہوں کہ آپ ہر جگہ مجھے کیوں گھسیٹ لاتے ہیں؟" اُنہوں نے لجاتے ہوئے کہا۔

"آپ اِن افسانوں کی ہیروئین جو ہوئیں۔ میں نے دبی زبان سے کہہ دیا۔

کمرے میں روشنی دیکھ کر امّاں جان آگئیں "کیا ہو رہا ہے۔ یہاں ابھی تک۔ سوئے نہیں؟"

"خالہ جان مبارک"۔ وہ بولیں "آپ کا بیٹا تو اچھا خاصا مضمون نگار بن گیا ہے"۔

"ارے مضمون سے مضمون۔ یہاں تو دن رات قلم گھسی ہوتی رہتی ہے"۔ امّاں جان جاتے جاتے کہنے لگیں۔ "جانے ملے گا کیا اس کام سے"۔

"وہ انگڑائی لے کر اٹھنے لگیں "اب اجازت ہے؟" اُن کی آنکھیں بوجھل سی ہو رہی تھیں، اور اُن سے عجیب طرح کی مستی جھلک رہی تھی۔

"شوق سے، لیکن وہ رومال؟" میں نے موقع غنیمت جانا۔

"ہوں۔ تو گویا اسی لئے ہو رہی تھی یہ ساری خوشامد"۔ وہ پھر سے تن گئیں۔ لیکن پہلے سا روکھاپن نہ پاکر میں پھر بولا "خوشامد کا کیا سوال ہے اِس میں۔ میں تو اپنی چیز مانگ رہا ہوں"۔

"شکل تو دیکھو، اور چلے ہیں رومال اڑانے"۔ وہ بولیں "جائیے رومال نہیں ملنے کا آپ کو"۔ اور میرا منہ چڑاکر وہ بھاگ گئیں۔

صبح جو آنکھ کھلی تو دیکھا وہ میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔ اِس خیال سے کہ ایسا نہ ہو میرے اٹھ بیٹھنے پر وہ چلی جائیں، میں دم سادھے پڑا رہا۔ پھر اُنہوں نے چپکے سے جیب سے کچھ نکالا اور میز کی دراز میں رکھ دیا اور دبے پاؤں چلی گئیں۔ میں لپک کر اٹھا اور دراز کھولا۔ وہاں وہی ننھا سا رومال اور ایک رقعہ پڑا تھا۔ لکھا تھا:۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اِتنے بے صبر ہو جائیں گے اور ڈھنڈورہ پیٹنا شروع کر دیں گے۔ آپ سے بھی کچھ ہو گا۔ اتنی تو ہمّت نہیں۔ لگے بچوّں کی طرح واویلا کرنے ...... لیجیئے رومال پڑا ہے، لیکن سنبھال کر رکھئے گا۔ کہیں مجھے ایک اور نہ دینا پڑے"۔

(......)

میں بے تحاشا باہر کو بھاگا۔ دُور برآمدے میں آپا اُنہیں میری میری طرف اشارے کر کرکے چھیڑ رہی تھیں۔ اور وہ شرم سے دہری ہوتی جا رہی تھیں۔

(طبع زاد)

یہ سنکی ہوائیں یہ بہکی گھٹائیں　　ہیں میخانہ بردوش ساری فضائیں

وہ گیسو کے خم میں چمکتے سے عارض　　چلو آج شام و سحر دیکھ آئیں

پہاڑوں کے دامن میں چاندی کے دھارے　　لبِ جو پپیہے کی "پی" کی صدائیں

یہ پچھلا پہر اور اُن کا تصوّر　　لبوں پہ چلی آ رہی ہیں دعائیں

محبّت کی وارفتگی کچھ نہ پوچھو　　بھلائیں اگر ہم تو وہ یاد آئیں

وہی ہیں ہوں صوفی وہی دردِ پیہم
وہی حسبِ دستور اُن کی جفائیں

پیدائشی اندھے پن کے سوا آنکھ کی ہر بیماری کا علاج
تندرست آنکھوں والے استعمال کریں تو بینائی بڑھاپے میں بھی تیز رہتی ہے
ملک کے کونے کونے میں بے شمار ڈاکٹروں نے تصدیق کی ہے کہ ریڈیم آئی ڈراپس آنکھوں کی تمام بیماریوں کو دور کر کے بینائی کو تیز کرتی ہے
ریڈیم آئی ڈراپس
رجسٹرڈ
ریڈیم آئی ڈراپس کے استعمال سے بیس بیس سال کے پرانے ککرے، نظر کی کمزوری آنکھوں میں پانی اتر آنا چیچک کی وجہ سے آنکھوں میں نقص، موتیا بند، ابتدائی جالا یعنی آنکھ کا پھولا، سرخی، دھند، غبار، جالا، خارش آنکھوں سے پانی بہنا، سوزش اور آنکھ کی دیگر تمام بیماریاں چند ہی یوم میں دور ہو جاتی ہیں۔
باریک اور کثرت سے کام کرنے والوں کو تو "ریڈیم آئی ڈراپس" کا استعمال ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ آنکھوں کی آنے والی بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رہیں قیمت فی شیشی صرف تین روپے۔
انڈیا آفس
ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ دھلی

شام کا مہمان

افسانہ

از

پروفیسر مس کرشنا کماری ایم۔اے

افراد

جگدیش............... ایک نوجوان
وملا........ جگدیش کی نئی نویلی دلہن
امیش........ .... جگدیش کا بچپن کا ساتھی
گجادھر............... نوکر

(جگدیش اور وملا بیٹھک میں چائے پی رہے ہیں۔ چائے ختم کے قریب ہے۔ یکایک باہر سے کوئی دروازہ تھپتھپاتا ہے)

امیش:۔ کیا میں آسکتا ہوں؟

جگدیش:۔ کون صاحب ہیں؟

امیش:۔ میں ہوں! کیا آسکتا ہوں؟ (ساتھ ہی جواب کا انتظار کئے بغیر گھس پڑتا ہے۔ امیش کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وملا تیزی سے اندر کے دروازے سے نکل جاتی ہے) پہچانا نہیں شاید؟

جگدیش:۔ اوہ، امیش! بیٹھو بیٹھو ——— داڑھی مونچھ بالکل صاف، اور چشمہ بھی پہن رکھا ہے، اور پھر رنگ بھی پہلے سے زیادہ گورا ہو گیا ہے۔ اس یوروپین پوشاک میں یکایک شاید ہی کوئی تمہیں پہچان سکے۔

امیش:۔ ارے ہاں، دربان بھی پہلے نہیں پہچان سکا۔ دو چار باتیں ہونے کے بعد جب پہچانا تو سلام کرکے بولا۔ جائیے۔ بابو جی اور بہو جی چائے پر بیٹھے ہیں۔

جگدیش:۔ آخر کوئی کیسے پہچانے، چھ برس سے تو کم نہ ہوئے ہوں گے۔

امیش:۔ ہاں بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ اس مدت میں امریکہ، جاپان سب چھان مارا۔

جگدیش:۔ مگر یہ تمہاری زیادتی ہے۔ ہم سے ملے تک نہیں، ذکر تک نہیں کیا۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب کئی دن ملاقات نہیں ہوئی تو تمہارے گھر پہنچا، وہاں دیکھا کہرام مچا ہوا تھا۔ تمہاری ماں نے دیکھتے ہی کہا "جگدیش آیا ہے، اسے ضرور کچھ معلوم ہوگا" میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ سوچا۔ اخبار میں حلیہ نکلواؤں۔ خیر کسی طرح سمجھا بجھا کر گھر لوٹا تو تمہارا تار ملا کہ امریکہ جا رہے ہو۔ تمہارے گھر پہنچا اور سب کو اطلاع کی۔ تب کہیں لوگوں کو کچھ تسلی ہوئی۔ مگر تم بھی عجیب آدمی ہو کہ پھر کوئی خط ہی نہیں لکھا۔

امیش:۔ یعنی میرا دماغ ٹھکانے نہ تھا۔ ماں کے روپے چرا کر چھپ کر بھاگا تھا۔ مگر اس کی سزا بھی انہوں نے دے دی۔ لوٹ کر پھر انہیں نہ دیکھ سکا۔

جگدیش:۔ میری زندگی میں بھی بہت سی الٹ پھیر ہو گئی۔ پتا جی سورگباش ہوئے، شادی ہوئی......

امیش:۔ خیر، یہ تو سمجھ گیا۔ یہ بتاؤ، یہ جو شریمتی جی ابھی ابھی میرے آتے ہی بھاگ کھڑی ہوئیں یہی تمہاری بیوی ہیں نا؟

جگدیش:۔ بیچاری بھاگتی نہیں تو کیا کرتی؟ بغیر اطلاع کے یکایک کوئی اجنبی کمرے میں گھس آئے تو ایک شریف عورت اس کے سوا کرے گی بھی کیا؟ ابھی تم سے تعارف بھی نہیں ہوا۔

امیش:۔ اجی وکالت رہنے دو۔ یہ دیوی وہی ہیں نا جو ہم لوگوں کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور جن سے تمہاری خط و کتابت عرصہ سے چل رہی تھی؟ وہی جنہیں تم.....

جگدیش:۔ ہاں ہاں وہی۔ مالتی....

امیش: مالتی؛ مجھے تو جہاں تک یاد ہے وِملا نام تھا...

جگدیش: ہاں نام تو یہی ہے، مگر میں مالتی ہی کہہ کر پکارتا ہوں۔

امیش: اوہ، وہی پرانی بات۔ بیوی کا نام نہ لینا چاہئے۔

جگدیش: خیر یہ بھی ہو، مگر بھئی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ شادی ہوئے دو برس ہونے کو آئے۔ مگر ایک روز بھی ہم لوگوں میں کشیدگی یا ان بن نہیں ہوئی۔

امیش: تو تم دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہو!

جگدیش: اب بھی مطمئن نہیں ہوں گے! بھائی میں تو عورتوں کی کامل آزادی کا قائل ہوں۔ میں نے انہیں پوری آزادی دے رکھی ہے۔

امیش: یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن میں اسے ایک دُوسری ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔

جگدیش: وہ کس نظر سے؟

امیش: یہی کہ عورت کو آپ آزادی دینے والے ہوتے کون ہیں؟ وہ تو خود......

جگدیش: ہاں، ہاں بات ایک ہی ہے یعنی میں اُن کی کسی پسند کی مخالفت نہیں کرتا۔ میں بیوی کو اپنی جاگیر نہیں سمجھتا۔

امیش: تم کیوں سمجھو گے۔ وہ تو ان کے سمجھنے کی بات ہے۔

جگدیش: اب یہ تو تم جانو۔ بھائی ہم لوگ تو بڑے...

امیش: سُکھی ہیں۔ ہونا ہی چاہئے۔ "لو میرج" ہے نا! ابھی کہہ رہے تھے کہ دو برس کے درمیان ایک روز کے لئے بھی کشیدگی نہیں پیدا ہوئی۔ مگر میں تو اسے اچھی علامت نہیں سمجھتا۔ کہیں تمہاری جگہ میں ہوتا تو اب تک شاید "الوداع" کہنے کی نوبت آ گئی ہوتی۔

جگدیش: یہ کیا؟ معلوم ہوتا ہے۔ ولایت جا کر بھی عورتوں کے متعلق تمہارے خیالات نہیں بدلے۔

امیش: کیا مطلب؟

جگدیش: پہلے بھی تم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں عورتوں سے نفرت کرتا ہوں۔

امیش: نفرت کرتا ہوں اور مرتے دم تک کروں گا۔ تم لوگ صرف ہوس کی نگاہ سے عورت کو دیکھتے ہو۔ اس لئے وہ تمہارے نزدیک دیوی، اپسرا، سجنی، ہردلیشوری اور جانے کیا کیا معلوم ہوتی ہے۔

جگدیش: یورپ اور امریکہ کی عورتوں کو دیکھ کر بھی تمہاری رائے نہیں بدلی؟

امیش: بدلتی تو کیا اور بھی پختہ ہو گئی۔ ہمارے ملک میں عورتیں گھونگھٹ نکال کر یا برقع پہن کر اپنی بے مائگی اور نقائص کو چھپائے ہوئے چار دیواری میں بیٹھی رہتی ہیں اور وہاں تمام باتیں کھلم کھلا ہیں۔ بس اتنا فرق ہے۔ عورت ہر جگہ عورت ہی ہے۔ آرائش و زیبائش اور لباس و پوشاک سے لیکر کلاس روم، آفس روم تک۔ عورت بس سیکس ہے اور کچھ نہیں۔ سر سے پیر تک سیکس۔

جگدیش: نہیں امیش۔ چاہے ولایت کے لئے یہ بات ٹھیک ہو مگر ہمارے ملک میں عورت سیکس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

امیش: ٹھہرو بھی، تمہاری عورتوں کی مدح سرائی مجھے پسند نہیں۔ میں کہہ چکا ہوں عورت ہر جگہ عورت ہے۔ وہ پردۂ فلم کی ایک مجسّم اداکارہ اور سیکس کے زندہ پیکر کے سوا کچھ نہیں اور اپنی کامیابی کے لئے وہ انتہا درجے کی مکّار، غرض پسند اور بے وفا ہو سکتی ہے.....

(کھٹ سے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی ہے)

یہ کیا ہوا؟

جگدیش: دیکھ تو رہے ہو، سب سُن رہی تھیں دروازے کی آڑ سے

امیش: دیکھو! اپنے متعلق باتوں کو چھپ کر سُننے کی اس بُری عادت پر ذرا دھیان دو۔ اچھّا ایک پیالی چائے پلا سکتے ہو؟

جگدیش: کیا خوب۔ ارے گنگادھر......!

(نوکر آتا ہے)

گنگادھر: مجھے بلایا بابوجی......؟

جگدیش: ہاں چائے لاؤ۔ اور دیکھو بہو جی سے کہہ دو۔ یہ ہمارے دوست آج ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے اور رات کو یہیں رہیں گے بھی۔

گجادھر:- بہت اچھا

(جاتا ہے)

امیش:- کھانا بھی ہوگا اور رات کو رہنا بھی پڑے گا؟

جگدیش:- جناب! کھانا بھی ہوگا اور رہنا بھی پڑے گا۔ آج تو میں تمہیں چھوڑتا نہیں۔ اتنے دنوں بعد ملے ہو

امیش:- کیا تم سمجھتے ہو کہ عورت کے متعلق میرے یہ خیالات سُن کر بھی تمہاری بیوی مجھے ایک منٹ یہاں رُکنے دیں گی؟

جگدیش:- چپ بھی رہو۔ مالتی کو ابھی تم نہیں جانتے۔ وہ ایسی نہیں ہے.... ٹھہرو میں ذرا تعارف تو کرا دوں (اونچی آواز سے) ارے مالتی! سُنو تو۔ امیش سے کیا پردہ؟ انہیں کا تذکرہ تو میں اکثر تم سے کیا کرتا تھا۔ یہ ہمارے.....

(گجادھر آتا ہے)

گجادھر:- بہو جی نے کہا ہے ابھی بواجی کے یہاں چلنا ہے' نہ جانے سے وہ بہت ناراض ہوں گی۔

جگدیش:- اچھا اچھا رہنے بھی دے ابھی۔ پہلے چائے تو لا

گجادھر:- چائے نہیں بن سکے گی۔ گھر میں دودھ نہیں ہے۔ بہو جی نے ہوٹل سے چائے لا دینے کو کہا ہے۔

امیش (قہقہہ مار کر) کیا کہا تھا میں نے؟ سُن لیا؟

جگدیش:- یہ تمہارے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔ وہ۔ بواجی کے یہاں لڑکے کا تلک ہے آج وہاں ہم لوگوں کے جانے کی بات طے تھی۔

امیش:- تو پھر جاؤ..... میں بھی چلوں اب.....

جگدیش:- پاگل ہوئے ہو، اتنے دنوں بعد تمہیں آج پایا ہے۔ کیا اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔ اچھا ٹھہرو میں ابھی آیا (جاتا ہے)

(امیش سگریٹ جلاتا ہے اور گجادھر کو بلا کر اُس سے باتیں کرنے لگتا ہے)

امیش:- تم کتنے دن سے یہاں کام کرتے ہو گجادھر؟

گجادھر:- جی، سال بھر ہوا ہوگا۔

امیش:- کھانا تمہاری بہو جی پکاتی ہیں یا براہمن؟

گجادھر:- جی براہمن۔

امیش (جیب سے پیسے نکال کر) اچھا دیکھو۔ ہوٹل سے ایک پیالی چائے تو لاؤ، جلدی سے۔

(گجادھر جھجکتا ہوا پیسے لے کر چلا جاتا ہے۔ امیش کسلمندی کی حالت میں انگڑائیاں لیتا، سگریٹ پیتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ دیوار پر آویزاں تصویروں پر نگاہ ڈالتا ہوا وملا کی ایک بڑی تصویر کے نیچے کھڑا ہو کر غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ اُسی وقت وملا کا ہاتھ پکڑے جگدیش کمرے میں آتا ہے)

جگدیش:- یہ لو بھئی، لایا گھسیٹ کر انہیں۔ اب آپ خود ہی اپنے کو متعارف کر لیں۔

امیش:- مگر یہ گھسیٹنے کی نوبت کیسے آئی؟ خواہ مخواہ کیوں تکلیف دی آپ کو؟

جگدیش:- تکلیف کس بات کی؟ نام نہاد پردے کے ہم قائل نہیں۔

امیش:- یہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ لیکن اس تعارف والی رسم کی کیا کوئی خاص ضرورت ہے؟ اور پھر متعارف ہونے میں اب باقی کیا رہا؟ جو کچھ باقی تھا وہ بھی پورا ہو گیا۔ جب گھر میں آئے ہوئے مہمان اور شوہر کے پرانے دوست کی یہ عزت کی جائے کہ اُس کے لئے ہوٹل سے چائے منگوائی جائے......!

وملا (شوہر سے) اور اپنے شوہر کے پرانے دوست اور مہمان کا تعارف بھی تو اس طرح حاصل ہوا کہ جس کے گھر آئے ہیں اُسے دیکھنے سے پہلے ہی مکار، خود پسند، بے وفا اور ذلیل کہہ رہے ہیں مجھے کسی کے تعارف کی ضرورت نہیں۔

امیش (آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھتا ہوا) دیکھئے یہ ذلیل والی صفت اس وقت میرے ذہن میں بھی نہیں تھی۔ اس کا استعمال آپ خود فرما رہی ہیں۔ اور اس کے لئے آپ کا شکریہ۔

جگدیش:- کیا خوب! تم لوگ تو بالکل ایک دوسرے پر ٹوٹ ہی پڑے۔ سامنا ہوتے ہی باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔

امیش:- بھئی ان لوگوں کے ساتھ میرا جھگڑے کا تعلق ہی ہے ہمیشہ ان سے جھگڑا ہی کیا ہے۔ آج بھی کر دوں گا۔

(گجادھر ہوٹل سے چائے لے کر آتا ہے اور امیش ہاتھ بڑھا کر لے لیتا ہے)

وملا :- کیا چائے ہوٹل ہی سے آئی ہے -

امیش :- جی ہاں - جس کے گھر میں سب کچھ رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں رہتا - اُسے باہر کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے -

وملا :- سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جو انجان کی طرح "کچھ نہیں ہے" کہہ کر رد کر دے، اِسے اُس کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

امیش (چائے کی چُسکیاں لیتے ہوئے) مگر مجھے اپنی اِس بدقسمتی پر افسوس نہیں ہوتا -

وملا (ہنس کر) بحث سے کوئی فائدہ نہیں (شوہر سے) پتاجی کے یہاں چلنا ہے نہیں؟

جگدیش :- نہ جانے سے بُرا مانیں گی! اچھا ایک کام کیوں نہ کریں؟ میں فوراً موٹر لے کر اُن کے یہاں ہو آتا ہوں - تب تک تم لوگ جھگڑا کرو (جھپٹ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے - پھر تیزی سے لوٹ کر) مگر دیکھنا پولیس وغیرہ بلانے کی نوبت نہ آئے -

امیش :- ارے یہ تو تم مجھے "دشمن کے ملک" میں چھوڑ کر بھاگے! ....بٹرسٹل.... کیا دوست کا یہی فرض ہے؟

جگدیش (دروازہ بند کرتے ہوئے) کوشش کر دیکھو شکست دے سکتے ہو - میں کہیں دُور تھوڑے ہی جا رہا ہوں -

(چلا جاتا ہے)

امیش :- سُنا آپ نے؟ اچھا اب قدم رکھئے، میدانِ جنگ میں -

وملا :- جناب میدانِ جنگ میں بھی عورتوں نے مردوں کو نیچا دکھایا ہے - مثالیں موجود ہیں -

امیش :- مجھے معلوم ہے - تلاش کیجئے تو کتنی مثالیں مل سکتی ہیں - مگر ابتدائے آفرینش ہی سے قدرت کا کچھ ایسا اصول چلا آرہا ہے کہ عورت کو مرد کی غلامی قبول کرنی ہی پڑتی ہے - یہ اٹل اصول ہے -

وملا :- "رفاقت" کا نام آپ لوگوں نے "غلامی" رکھا ہے! عورت "رفیقہ" کی بجائے آپ لوگوں کے نزدیک خادمہ اور کنیز ہے! جانتے ہیں اسی "پاپ" سے تو آج ہندوستان کی یہ درگت ہو رہی ہے -

امیش (کچھ ہنس کر) خادمہ نہ بنا کر جن ملکوں نے عورت کو رفیقہ کا مقام دیا ہے وہاں کی حالت بھی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں -

وملا :- کیا دیکھا وہاں؟

امیش :- دیکھا آج جو رفیقہ ہے کل وہی قاتل دشمن بن جاتی ہے سکون و اطمینان کا نام تک نہیں ہے کسی خاندان میں "خانہ داری" نام کی کوئی چیز سرے سے ہے ہی نہیں -

وملا :- تو گویا خانہ داری اور گھر گرہستی صرف آپ کے ہی ملک کی وراثت ہے -

امیش :- یقیناً - مثال کے لئے آپ اپنی ہی گرہستی کو لیجئے - شادی کے پہلے ہی دونوں ایک دوسرے کو پیار کرنے لگے تھے - خط وکتابت ہی کے ذریعے سہی - میں نے وہ سب خطوط پڑھے ہیں اور اس کے بعد آپ لوگوں کی زندگی بڑے عیش سے کٹ رہی ہے - کیوں؟

وملا :- تو گویا! (ہونٹوں کے نیچے ہنسی دبانے کی کوشش کرتے ہوئے) شادی کے پہلے، میں آپ کے دوست کو خط لکھا کرتی تھی کس نے کہا؟

امیش :- اگر میں نے خود اُن خطوں کو نہ پڑھا ہوتا تو آپ میری بات کو ہنس کر ٹال سکتی تھیں، اور اتنا ہی نہیں - جو خطوط آپ کے پاس پہنچتے تھے - اُس کا بیشتر حصہ میں ہی لکھ دیا کرتا تھا -

وملا (کچھ شرما کر) جائیے، مگر ابھی آپ نے جو کہا کہ آپ عورتوں سے نفرت کرتے ہیں؟

امیش :- ضرور کرتا ہوں -

وملا :- بالکل غلط - میں اِس پر کبھی یقین نہیں کر سکتی - کیونکہ....

امیش :- یقین نہ کرنے کی وجہ؟

وملا :- اُن خطوں کا نصف تو بہت ہوتا ہے - جو شخص اُن خطوں کا ایک فقرہ بھی لکھ سکتا ہے، وہ چاہے جو بھی ہو، مگر عورتوں سے نفرت کرنے والا نہیں ہو سکتا -

امیش :- مان لیجئے، وہ زیادہ دنوں کی بات ہے، جو بدل بھی سکتی ہے -

وملا :- لیکن آپ کے دوست نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس کے بھی پہلے سے اپنے کو عورتوں کا مخالف اور عورتوں سے نفرت کرنے والا کہتے چلے آرہے ہیں -

امیش :- کہتا چلا آرہا ہوں! یعنی میں دراصل عورتوں کا مخالف

نہیں ہوں۔

وملا :۔ کبھی نہیں! آپ بنتے ہیں! ہم لوگوں کی کمزوری ٹھیک کہاں ہے، اسے آپ بجولی سمجھتے ہیں اور اس سے ..... (ہنستی ہوئی) ذرا ٹھہرئیے میں آئی .... (وملا اندر جاتی ہے)

(امیش سگریٹ پیتا ہوا پھر وملا کی تصویر پر نگاہ جما دیتا ہے۔ اسی وقت گجادھر آتا ہے تاکہ چائے کی خالی پیالی اٹھا کر لے جائے)

امیش :۔ بھئی گجادھر، تم نے خوب یاد دلایا۔ ایک پیالی چائے اور لا دو تو وہیں سے، یہ ذرا ٹھیک نہیں تھی۔

(وملا کمرے میں آتی ہے)

وملا :۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پھر چائے! گجادھر! نہیں۔ اب مت لانا۔ کھانا تیار ہو گیا ہے، رسوئی میں جا کر مہراج سے کھانا نکالنے کے لئے کہہ دے۔

(گجادھر چلا جاتا ہے)

امیش :۔ کھانا؟ کھانا تو میں نہیں کھاؤں گا یہاں

وملا :۔ کیوں؟ (مسکرا کر) اور ابھی تو آپ چائے منگا رہے تھے ہوٹل سے؟

امیش :۔ اب کیا آپ بدل گئی ہیں؟ اور لو اب میں چلا، جگدیش سے کہہ دیجئے گا۔ مجھ سے کبھی ملنا چاہے تو میرے گھر پر آئے۔ (اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

وملا (دوڑ کر دروازے پر دونوں ہاتھ پھیلا کے راستہ روک لیتی ہے) اچھا! بغیر کھانا کھائے آپ کیسے جا سکتے ہیں۔

امیش :۔ مجھے جانا چاہیئے۔ عورتوں سے اپنی توہین برداشت کیسے کر سکتا ہوں۔

وملا (سنجیدہ لہجے سے) میں نے آپ کی توہین کی ہے؟ آپ کہہ رہے ہیں یہ؟

امیش :۔ یقیناً۔

وملا :۔ اچھا تو مجھے معاف کر دیجئے ـــــ کر دیا معاف؟ بولئے اب تو آپ خوش ہوئے؟

امیش :۔ (کچھ سیکنڈ تک ٹکٹکی باندھے وملا کی طرف دیکھتا ہوا) اچھا فرض کیجئے، اس بار معاف ہی کر دیا (کرسی پر بیٹھتا ہوا) اچھا آپ کا کیا خیال ہے، جگدیش کو آپ سکھی بنا سکتی ہیں؟

وملا :۔ دوسرے کے دل کی بات میں کیسے جان سکتی ہوں۔ بتائیے!

امیش :۔ تو اپنے ہی دل کی کہیے۔ کیا آپ جگدیش کو پا کر سکھی ہوئی ہیں؟

وملا :۔ ان سب باتوں کو جان کر آپ کیا کریں گے؟ اور ہاں آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں؟

امیش :۔ کیوں جاننا چاہتا ہوں؟ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کی بیشتر شادیوں سے سُکھ کی جگہ دُکھ ہی ملتا ہے شاید ہی ہزاروں شادی شدہ جوڑوں میں سے کوئی ایسا ہو، جو دراصل اپنے کو سکھی کہہ سکتا ہو۔ اور اگر کوئی کہتا بھی ہے تو وہ محض دنیا کو دکھانے کے لئے۔ نناوے فی صدی شادیاں دس روز بعد ہی پریشانی، زحمت، دنیا بھر کے جھنجھٹوں کا سبب بنتی ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اس کا ردِّ عمل دوسرا ہو ہی کیا سکتا ہے؟

وملا :۔ اچھا اچھا ٹھہرئیے، یہ سب باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ سمجھنے لائق عقل بھی تو نہیں ہے (شرم سے نظریں جھکا کر) اچھا بتائیے تو آپ اس طرح ٹکٹکی باندھے میری طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟ مجھے سچ مچ بڑا حجاب محسوس ہو رہا ہے

امیش :۔ کیوں دیکھ رہا ہوں؟ کیا اسے بھی زبان سے کہنا پڑے گا؟ اچھا بتا ہی دوں۔ سُنیئے، اس لئے کہ آپ حسن و جمال کی ملکہ اور اسادھارن سُندری ہیں۔

وملا :۔ مگر میں اسادھارن سُندری تو نہیں ہوں!

امیش :۔ اپنی سُندرتا کو کوئی خود آج تک سمجھ سکا ہے؟

وملا :۔ خود نہ سمجھ سکنے کے باوجود، آپ جیسے عورت کے دشمن اور باغی کی حریصانہ نگاہیں بیچ بیچ میں مجھے یہ بات سمجھا سکتی ہیں (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

امیش :۔ دیکھیے، آپ پھر میری توہین کر رہی ہیں۔ اس بار اگر میں ناراض ہو کر واقعی چلا جاؤں؟

وملا :۔ میں جانے ہی نہ دوں گی۔ لوٹا لاؤں گی۔

امیش :۔ اور اگر کھانا نہ کھاؤں؟

وملا :۔ کھانا بھی آپ ضرور کھائیں گے۔ آپ بھوکے ہیں نا،

امیش :۔ مگر میری یہ بھوک مٹنے والی نہیں۔

وملا :۔ راکشسی بھوک ہو گی تو نہ مٹے گی۔ ارے گجادھر!

(اونچی آواز سے) ارے گجادھر!

(گجادھر آتا ہے)

وملا (اٹھتی ہوئی) کھانا لانے کو کہو

(جاتا ہے)

امیش :- مگر ایک بات ہے، رات کا کھانا کھانے کے بعد پھر میں کہیں ہل ڈول نہیں سکتا - میری عادت ہی ایسی ہے - پھر مجھے رات کو یہیں سونا بھی پڑے گا -

وملا :- اچھا جی! رات کو بھی آپ یہیں سوئیں گے؟ ان کے کمرے میں تو جگہ ہی نہیں ہے -

امیش :- تو پھر تمہارے ....

(کھانے کی تھالی لے کر مہراج آتا ہے)

مہراج :- کہاں رکھوں بہو جی؟

وملا :- اسی ٹیبل پر رکھو، یہ ولایت سے لوٹے ہوئے ہندوستانی ہیں - ان کو یہیں پسند آئے گا - لا مجھ کو دے - میں ......

(مہراج کے ہاتھ سے تھالی لے کر ٹیبل پر رکھتی ہے اور گجادھر گلاس میں پانی لاتا ہے - وملا گلاس لے کر ٹیبل پر رکھ دیتی ہے - مہراج اور گجادھر چلے جاتے ہیں)

امیش :- تو شروع کروں - مگر یورپین ملکوں میں یہ قاعدہ نہیں ہے - ایک آدمی بیٹھ کر کھائے اور کوئی دوسرا کھلائے - یہ وہاں نہیں چلتا - دونوں کو ساتھ بیٹھ کر کھانا ہوتا ہے -

وملا :- مگر کھلا کر ہم لوگ سچ مچ سکھی ہی ہوتی ہیں - وہاں کی یہ رسم عورتوں کو اس خوشی سے محروم رکھتی ہے - لیکن چھوڑئے ان باتوں کو - میں آپ سے ایک دوسری بات پوچھنا چاہتی ہوں - جواب ضرور دیجئے گا -

امیش :- کون سی بات؟ پوچھئے -

وملا :- کیا آپ کبھی شادی نہیں کریں گے؟

امیش :- ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے -

وملا :- مگر ذرا بتایئے تو، ایسا ارادہ کیوں ہوا آپ کا؟

امیش :- ہر کیوں کا جواب نہیں دیا جاتا -

وملا (اصرار آمیز لہجے میں) بتایئے نا، کیا کبھی کسی عورت نے آپ کو دھوکہ دیا ہے؟

امیش (سنجیدگی سے) ہاں دیا ہے -

وملا :- مگر سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں، ایسی عورت بھی تلاش کرنے سے آپ کو مل سکتی ہے، جو سچ مچ آپ کو پیار کرے گی -

امیش :- مگر عورت کا پیار پا کر ہوگا کیا؟

وملا :- (ہنس کر) کیا ہوگا؟ دنیا کا رنگ بدل جائے گا جب تک زندہ رہیں گے سکھ پائیں گے -

امیش :- کیا وہ سکھ آپ کو کسی دن ملا ہے؟

وملا :- آپ ہر بات میں مجھے کیوں گھسیٹتے ہیں؟ ذرا بتایئے تو بحث کے لئے مان لیا وہ سکھ آج تک مجھے نہیں ملا تو آئندہ پانے کی امید تو رکھتی ہوں -

(اسی وقت اچانک جگدیش آجاتا ہے)

جگدیش :- ارے واہ - کیا خوب مجلس جما رکھی ہے - ایسی ذرا دیر میں صلح بھی ہوگئی!

امیش :- تو تم نے کیا سوچا تھا، ہم دونوں لڑتے ہی رہیں گے؟

جگدیش :- بھئی میں نے .... (کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے) تو سوچا تھا، پہنچتے ہی پولیس میں خبر کرنی ہوگی - تمہیں تو میں خوب پہچانتا ہوں اور عورتوں کے متعلق تمہارے جیسے خیالات ہیں ....

امیش :- تو اسی بھروسے پر تم انہیں میرے پاس تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے؟

جگدیش :- (قہقہہ مار کر) اجی نہیں - اچھا تو یوں نہ کہو - تم دونوں میں گہرا میل ہوگیا ہے؟

امیش :- اس میں بھی نہیں شبہ ہے؟ دیکھو اسے ہمیشہ یاد رکھو - پرماتما نے عورت اور مرد ان دو پرانیوں کو آپس میں میل کرنے کے لئے بنایا ہی ہے -

جگدیش (زور کا قہقہہ لگاتا ہوا) ٹھیک ٹھیک، تو یوں کہو - عورتوں کے متعلق تمہارے پرانے خیالات ابھی دس منٹ کے اندر بدل گئے -

امیش :- (سنجیدگی سے سر ہلاتا ہوا) ہاں کچھ بدلے تو ضرور ہیں، اس میں کوئی شک نہیں -

جگدیش :- (وملا کی طرف کنکھیوں سے اشارہ کرتا ہوا) تو ماننا پڑے گا، اس میں ان کی بہادری ہے -

امیش :- ہزاروں بار، بھولہوں آپ نے ان کی بہادری ہے۔ (کھانا ختم کر کے پانی پیتا ہے)

وملا :- ارے کھا چکے؟ نہیں دو کچوریاں اور کھائیے، اور یہ کھیر کیا یونہی رہ جائے گی؟

امیش :- مگر پیٹ میں تو جگہ ہی نہیں ہے۔ اچھا آپ کی بات نہیں مانتا (چبوانے لگتا ہے۔ اس درمیان میں جگدیش ٹکٹکی باندھے دونوں کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا رہتا ہے)

جگدیش :- تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ ہاتھ دھونے کا پانی اور پان وغیرہ لاؤ!

امیش (جگدیش کی طرف دیکھتا ہوا) تم خوب جانتے ہو میں پان کبھی نہیں کھاتا۔

جگدیش :- مگر ہاتھ دھونے کا پانی تو ضرور ہی چاہیئے۔

وملا :- (کچھ ہنس کر) لیکن اس کے لئے نوکر موجود ہے۔ ارے گنگادھر، او گنگادھر! (خود اٹھنے کی بجائے گنگادھر کو بلاتی ہے۔ گنگادھر تولیہ پانی وغیرہ لے کر آتا ہے اور امیش اس کے پیچھے پیچھے باہر چلا جاتا ہے)

وملا۔ (شوہر سے) کہہ رہے تھے کہ کھانے کے بعد میں کہیں چل ذرا نہیں سکتا۔ رات یہیں رہیں گے۔ کس کمرے میں بستر بچھواؤں؟

جگدیش :- تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی سب انتظام کئے دیتا ہوں۔

(تولیہ سے ہاتھ پونچھتا ہوا امیش آتا ہے)

امیش :- بھائی خوب جم کر کھایا، اب اگر ذرا آرام کر سکوں تو بہتر ہو۔

جگدیش :- اور رات بھی کافی چلی گئی (کلائی گھڑی دیکھتا ہوا) اچھا ایک کام کریں۔ ابھی نیچے موٹر کھڑی ہے۔ چلو میں خود تمہیں گھر پہنچا آؤں۔

امیش (بھونچکا سا ہو کر جگدیش کو دیکھنے لگتا ہے، پھر جیب سے سگریٹ اور دیا سلائی نکال کر اطمینان سے جلاتا ہوا ایک بار وملا کی طرف دیکھتا ہے اور یونہی ہلکے سے مسکرا پڑتا ہے اور پھر جگدیش سے) نہیں نہیں موٹر کی کیا ضرورت ہے، اکیلے ٹہلنا مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دوں گا

جگدیش :- کیا ہوا تکلیف کی کیا بات ہے اتنے دن بعد تو ملے ہیں۔ گپیں لڑاتے ہوئے ساتھ ہی چلیں (امیش کو ایک طرح سے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور وہ گردن موڑ کر وملا کی طرف دیکھتا، ہنستا ہوا جاتا ہے، پھر وملا سے)

امیش :- آپ کو "گڈ نائٹ" کہوں یا الوداع، کچھ سمجھ میں نہیں آتا وملا دیوی! بہت سی باتیں بک گیا، کچھ خیال نہ کیجئے گا۔

(وملا ایک اداس اور خفیف تبسم کے ساتھ سر جھکا کر اور جوڑے ہوئے ہاتھوں کو پیشانی تک اٹھا کر پرنام کرتی ہے۔ جگدیش اور امیش چلے جاتے ہیں، وملا اس کے بعد بھی دیر تک چپ چاپ اسی طرح کھوئی ہوئی سی کھڑی رہتی ہے)

(گنیش پرشاد دیویدی کے ہندی افسانے سے)

"بیسویں صدی" میں ۴۲۰ اور بوگس ٹائپ کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے، جن کا مقصد محض خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ قارئین "بیسویں صدی" سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ ریڈنگ میٹر پیش کرنے کے لئے پانچ سو روپیہ ماہوار یعنی چھ ہزار روپیہ سالانہ کے اشتہارات گذشتہ چھ سال سے بند کر رکھے ہیں۔ "بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہارات کا پلندہ نہیں بنایا، باوجودیکہ اشتہارات کی آمدنی ایسا ٹھوس منافع ہے، جس سے اخبارات و رسائل مالا مال ہو رہے ہیں۔ مگر ہمارے پیش نظر ذاتی اغراض سے زیادہ ہمیشہ ناظرین کا مفاد ہے۔ "بیسویں صدی" کی اس جسارت کو دیکھتے ہوئے ہمارے سرپرستوں کا بھی فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنی خریداری کو جاری رکھیں، بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں "بیسویں صدی" کی توسیع اشاعت کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ یہ حقیقت آپ سے پوشیدہ نہیں کہ "بیسویں صدی" میں آٹھ آٹھ روپے سالانہ چندہ والے رسائل سے بھی زیادہ مضامین ہوتے ہیں۔

مینیجر رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

گلابی ساری

از۔ جناب طیش صدیقی

اے مری جانِ تمنّا، مری شہنازِ قمر
تم تو آج آئی ہو فتنۂ عالم بن کر
زیب تن تم نے جو کی ہے یہ گلابی ساری
نظر آتی ہے فضا آج شرابی ساری
آسماں اوڑھے ہو جس طرح شفق کی چادر
جیسے ڈھلتے ہوئے سورج کا شہابی منظر
جس طرح پھولوں سے لدکر کوئی ڈالی لچکے
پے بہ پے جیسے سمن زار میں بجلی کوندے
جس طرح مشعلِ انوار ہو لرزاں لرزاں
جیسے اک شعلۂ بیباک ہو رقصاں رقصاں
جس طرح ہنستی ہوئی صبح کی دیوی آئے
جیسے صہبا سی فضاؤں میں کوئی چھلکائے
کروٹیں لیتی ہوئی جام میں جس طرح شراب
جیسے انگڑائیاں لیتا ہوا پریوں کا شباب
جس طرح دامنِ پنجاب پہ ہوں خوں کے نشاں
قحطِ بنگال کا ہو جیسے لہو بار سماں

انجم پارے

از۔ جناب انجم شاہانی لکھنوی

جوانی کے گلزار سے کھیلتا ہوں
حوادث کی رفتار سے کھیلتا ہوں
ہر اک برق رفتار سے کھیلتا ہوں
جوانی کے ہر دار سے کھیلتا ہوں
شبِ وصل کو جگمگانے کی خاطر
میں آہِ شرر بار سے کھیلتا ہوں
کبھی جذبۂ عشق پر اپنے نازاں
کبھی حسنِ خوددار سے کھیلتا ہوں
مری ہمّتِ عرش پیما تو دیکھو
غمِ دردِ دلدار سے کھیلتا ہوں
وہ رنگین جلوے منوّر نظارے
تجلّی گہربار سے کھیلتا ہوں
محبّت کا انمول موتی سمجھ کر
ہر اک اشکِ خونبار سے کھیلتا ہوں
نشیمن جلے یا رہے کچھ ہوا انجم
میں برقِ شرربار سے کھیلتا ہوں

از۔ جناب دانش ممتاز کانپوری

دامِ جمال

دور افتادہ ایک گاؤں میں
وہ کھڑی تھی شفق کی چھاؤں میں
میں جب اُس کے قریب سے گذرا
پڑ گئیں بیڑیاں سی پاؤں میں

نذرانہ

اک مسئلۂ غور طلب زیرِ بحث ہے
گھر بجی ہوئی ہے آج اسی واسطے چوپال
داروغہ نے پٹواری کو بھیجا ہے سندیسہ
اس فصل میں درکار ہے معشوق دو سال

ڈنلپ
کی پچاسویں سالگرہ
۱۸۹۸ — ۱۹۴۸
پچاس سال کا کامیاب تجربہ
ہمیشہ آگے رہتے ہیں — ہمیشہ رہنمائی کرتے
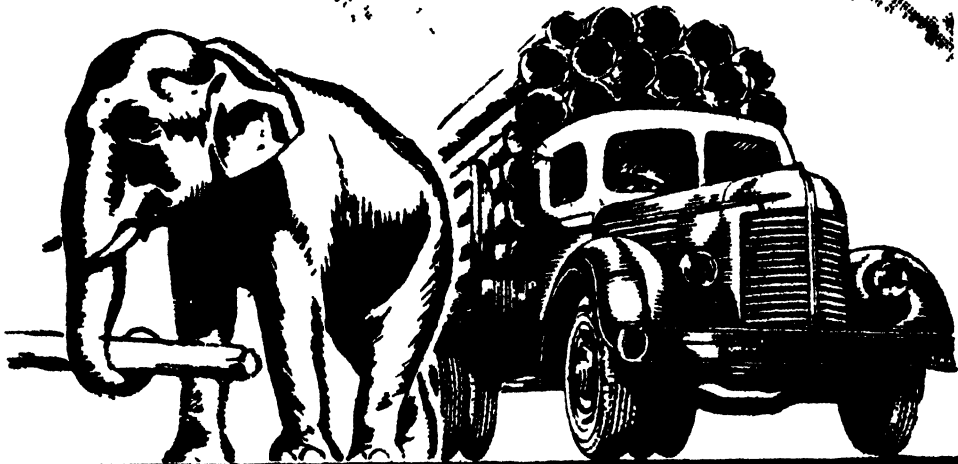
ان کا مستقبل مقدم
یہ اپنی زندگی کی تمام منزلیں اطمینان، حفاظت اور اعتماد کے ساتھ پہلو بہ پہلو طے کرسکیں گے
اگر آپ اِن کے مفاد کو بیمہ زندگی کی پالیسی سے محفوظ کریں
لکشمی انشورنس کمپنی لمیٹڈ
بیمہ زندگی کی بہترین سہولتیں مہیا کرتی ہے
لکشمی انشورنس کمپنی لمیٹڈ دہلی
برانچیں اور ایجنسیاں:۔ ہندوستان اور برٹش ایسٹ افریقہ بھر میں

افسانہ

بھوک

از

جناب برج موہن ناتھ کاچر

الہ آباد کا سٹیشن —— اور اُس کے دوسرے دن گرہن پڑنے والا تھا - ابھی ہی ٹرین آکر رُکی تھی - جاتریوں کی بھیڑ تھی —— بچے —— چھوٹے چھوٹے، قمیص اور نکریں پہنے ہوئے بچے"، دھوتیاں پہنے ہوئے بچے، ننھے مُنّے فراک پہنے ہوئے بچے"، ننگے دھڑنگے بچے"، اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چپکے ہوئے بچے" - مرد —— تن درست و توانا مرد، نحیف و لاغر مرد - بوڑھے اور کمرخمیدہ مرد —— اور عورتیں —— ماتھے تک چادروں کے آنچل ڈالے عورتیں، زیادہ تر بوڑھی عورتیں اپنی سادی دھوتیوں میں، کچھ جوان عورتیں بھی —— اپنے حسن کی رعنائیوں کو حسین و رنگین ساریوں میں چھپائے —— خوبصورت، بدصورت، ہر قد و قامت کی .....

بوڑھیاں چھوٹوں کی بے ہودگیوں پر ٹوک رہی تھیں اور جلدی جلدی سٹیشن کے سامنے تھوڑی دُور پر جو دھرم شالہ ہے، وہاں تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ سٹیشن کے باہر لوگوں کے پھینکے ہوئے جوٹھے پتّوں پر کتّوں سے لڑکر جھپٹنے والے بچے" —— یہ تو سبھی دیکھتے ہیں لیکن ..... بھوک ..... بھوک آج ہمارا تن، من، جیون ..... جس بھوک سے تڑپ رہا ہے ...... یہ بھوک ....

عتیق سٹیشن کے اُس سرے پر، جہاں وہیلر کا سٹال تھا، تنہا کھڑا تھا - دور سے اُس کے دوست اور یونیورسٹی ٹیم کے ساتھ کے کھلاڑی —— راج، راجندر، بلراج، نور کی ٹولی آتی دکھائی دی - —— بے فکرے، قدرے رومان پرست، مجسم ترقی پسند - عتیق اب بھی بک سٹال پر رکھے رسالوں اور دیدہ زیب کتابوں پر نظریں گاڑے تھا —— "دُنیا کے بہترین افسانے" "ٹالسٹائی کے منتخب افسانے"، "ماپساں"، "ترگنیو" "چیخوف"، "کولے" —— نہ جانے کس کس کے ناول اور افسانوں کے مجموعے، لیکن اِن سے پہلے کہ وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مایوسی کا احساس کرنے پاتا —— یہ ٹولی اِس کے قریب پہنچ چکی تھی۔

" اماں رہنے دو اُمنگ ہی ..... افسانوں کی بھوک ..... جب دیکھو بک سٹال"۔ راج نے طعنہ دیا۔

"جب ہوتا ہے افسانے، افسانوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے اِس کے"۔ بلراج نے حاشیہ چڑھایا۔

"اماں کہاں، یونہی دیکھنے کھڑا ہو گیا تھا"۔ عتیق نے صفائی پیش کی - کچھ مسافر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے، آدھی سگریٹ ہونٹوں میں دبائے، پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے، ٹہل رہے تھے، کچھ پان چباتے ہوئے، کچھ بیٹھے تھے - کچھ سٹال کے قریب بھی آ گئے رسالے اور اخبار خریدنے۔

لوگ آگے بڑھ رہے تھے ....

"اور کہو عتیق، کیا حال چال ہے ؟"

"کٹ رہی ہے یار، اور بتاؤ یونیورسٹی کا کیا رنگ ہے ؟"

" ابھی تو دسہرہ کے بعد میں گیا نہیں، لیکن یار یہ رفیوجی لڑکیاں غضب کی آئی ہیں"!

"اونہہ، تم تو یہی دیکھتے رہتے ہو ..... اور ..."

"اور کیا ..... اِسی کا نام دُنیا ہے"۔ راج نے جواب دیا۔

نُور جو ذرا زیادہ وجیہہ اور خوبصورت تھا، اپنے بالوں کو سر کی ایک جنبش سے ماتھے پر لاتے ہوئے اور دوسری حرکت سے انہیں پیچھے پھینکتے ہوئے بولا - یار اب کی جوہری سے دوستی نہ کی تو کوئی بات نہیں بڑی مغرور ہو گئی ہے"!

"مجھ سے تو اُس کے بڑے اچھے رسم ہیں - ان رفیوجیوں میں سے کسی کو رام کیا جائے"۔ بلراج نے جواب دیا۔

خاموش عتیق شاید میکسم گورکی کے کسی افسانے کا خواب دیکھ رہا تھا - لفظ رفیوجی سے چونک پڑا - اُس کا خیال تھا کہ یہ لوگ اپنی ان بدنصیب بہنوں کے ساتھ ہمدردی کے کلمے زبان پر لا رہے ہوں گے۔

لیکن —— اُنہیں —— اُنہیں اپنی بھوک کے آگے دوسرے کے احساسات کی کیا پروا؟

عتیق —— اپنے بیشتر وقت کو گورکی، ٹالسٹائی، مایم، مارلے کے افسانوں میں اُلجھائے رہنے والا، عتیق، مارکس کے اصول اور پاشاکے ڈراموں کا مدّاح عتیق —— اُس نے کچھ عجیب طرح سے سوچا ان سب کے بارے میں ..... اور وہ خاموش ہی رہا .....

لیکن وہ تو بات کا سلسلہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے

"ان سب میں سے بھی جوہری سب سے خوبصورت کیوں عتیق؟"

"اور سب سے سیریس بھی، میں نے اسے مارکس کی "کیپٹل" پڑھتے دیکھا تھا"

"اونہہ سیریس ویریس کیا؟ میں اگلی میچ کی دعوت کل ہی دوں گا اُسے —— جو ساتھ رہنا ہے ہر گھڑی کا، نبھے گا آخر حجاب کب تک" نور نے زور دیا۔

اور کافی دیر تک یہ اپنا اپنا راگ الاپا کئے۔

عتیق جلد ہی اُن سے دانستہ کٹ گیا —— کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اب آگے بڑھ کر ریسٹورنٹ کا راستہ لیں گے۔ اُس کا دل بھی اُس وقت مکھن توسٹ کھانے اور خوش ذائقہ چائے کی دلفریب چسکیوں کے لئے بے تاب ہو رہا تھا —— لیکن عتیق —— اُسے کچھ عجب احساسات روک رہے تھے، اُن کے ساتھ جانے سے۔ وہ اپنی مالی حالت سے واقف تھا اور کسی کا ایسا بار اسے پسند نہ تھا جسے وہ کوشش پر بھی نہ اتار سکے۔ وہ ایک اوّل درجے کا کھلاڑی تھا —— افسانوں کے مطالعہ اور کچھ لکھنے کا بھی اُسے بے انتہا شوق تھا —— یہی شاید اُس کی دو بھوکیں تھیں —— اور وہ سوچتا تھا کہ اُن کی تکمیل —— شاید نہ ہو سکے —— اُن کے بھی چاہئے تھا —— "روپیہ"!

اور عتیق کو کچھ بھوک محسوس ہوئی۔

پلیٹ فارم کے دوسرے حصّے پر اُترے ہوئے مسافروں کی ایک ٹولی سامان وغیرہ ٹھیک کر رہی تھی۔ عتیق چکر کاٹتا ہوا اُسی طرف نکل گیا اُس کے دماغ میں خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے —— کبھی وہ کینڈڈا[1] کے کردار پر غور کرنے لگتا —— کبھی شاعر مارچ بینکس[1]

پر —— اور فوراً یہ سب بھول کر اُس کا دھیان جوہری، تنہا، گپتا مایا داس —— یہ سب اُس کی نظروں میں گھومنے لگیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیا ہو رہا ہے؟

ایک دفعہ اُس نے یونہی نظر گھمائی۔ ذرا ایک گیروا کپڑا کندھے سے جانگھوں تک لپیٹے، کشادہ جبین، گٹھا ہوا خوبرو جوان اپنی بڑی بڑی آنکھیں ایک طرف جمائے ہوئے تھا۔ عتیق نے چاہا کہ وہ کچھ دھیان نہ دے۔ لیکن کب تک۔ سادھو کی نظریں اُس طرف ایک خاص مرکز پر جمی ہوئی پاکر غیر ممکن تھا کہ کوئی اُس کی طرف متوجّہ نہ ہوتا۔

عتیق نے بھی سادھو پر ایک گہری نظر ڈالی۔ کھلتا ہوا صاف رنگ، چوڑا چکلا سینہ، چوڑی بھر تُپد کلائی، سُرخ ہتھیلیاں —— اور اپنی نظریں —— گاڑے ہوئے تھا —— اپنے قریب کے اُس نوجوان کی اُبھری ہوئی جیب پر، جس کا اُبھار یہ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ رومال کا اُبھار نہیں، نوٹوں سے بھرے بیگ کا اُبھار ہے۔

عتیق کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا کتنا بھوکا ہے "سادھو"!

دوسرے ہی لمحے سفید ساری میں ملبوس ایک پیکر حسن اُدھر سے گذرا۔ جس کی مانگ سیندور سے خالی تھی۔ جس کے خوبصورت ہاتھ بھی سادے تھے۔ نازک کلائیاں بے چوڑیوں کے تھیں، رُخ بے غازہ تھا، جبیں بے قشقہ تھی ....

لیکن اُس کی صورت میں بلا کی جاذبیت تھی —— حسن پھوٹا پڑتا تھا۔ اُس کا گدرایا ہوا جسم، جوانی کے دلآویز تناؤ کے ساتھ نمایاں تھا۔ اُس کی جوانی کسی ستار کے کسے ہوئے تاروں کی طرح تھی جن کے کساؤ کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اُن سے کوئی کھیلے اور مضراب کی ضرب سے اُنہیں کوئی مترنم کر دے۔

عتیق کی نظریں بھی یکایک اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ دو منٹ پہلے کا سارا سلسلۂ خیال منقطع ہو گیا۔ آنکھوں میں کچھ جلن سی محسوس ہوئی اور خون میں تیز حدّت روانی۔

اور عتیق کو محسوس ہوا کہ سچ مچ اُس کی جوانی کتنی بھوکی ہے۔

بعد میں اُس نے یہ بھی غور کیا کہ اُس کی نظریں برابر سادھو کے دلکش چہرے اور چوڑے سینے پر پڑ رہی تھیں ... ... اور وہ آگے بڑھ رہی تھیں —— لیکن مایوسی کے ساتھ —— اُس کی نظریں برابر

---

[1] برنرڈ شا کے ایک مشہور ڈرامے کے دو افراد

سادھو کی طرف تھیں ..... اور عتیق کی نظریں، وہ شاید اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

سادھو نے بھی دفورِ خود رفتگی میں اپنی نظریں اُس کے سڈول گورے بازوؤں پر ڈالیں ——— عتیق کو اُس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک محسوس ہوئی اور عتیق نے سوچا " سادھو " کے دِل میں بھی وہی جذبات اُٹھ رہے ہیں، جنہیں وہ ہی منٹ پہلے وہ خود زبردستی دبا چکا ہے۔ حالانکہ عتیق یہ طے نہیں کر پایا کہ خود اُس کی کون سی بھوک شدید تھی۔ ——— اور سادھو ——— اُس کی بھوک کون سب سے زیادہ تیز تھی۔

گھر لوٹ کر عتیق نے روز سے زیادہ ناشتہ کیا۔ وہ اِس طرح کچھ گُنگنا رہا تھا:۔

میرا تن من جیون بھوکا .....

(طبع زاد)

مغرب زدہ عورت کی راتیں

از
محترمہ سیّدہ اختر صاحبہ حیدر آبادی

میری زندگی میں بے شمار راتیں آئیں اور گئیں ..... لیکن بعض راتیں مجھ پر ایسی گذریں جو میرے لئے ناقابلِ فراموش تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن راتوں میں میرے مشاہدات و جذبات کا افسانہ ہے۔ یہ راتیں اپنے اندر درسِ موعظت و عبرت رکھتی ہیں۔ میں نے اِن راتوں کو بصورتِ نظم پیش کر دیا ہے، تاکہ پڑھنے والے ان راتوں کو پڑھ کر زندگی کے مختلف المناک و بصیرت افروز حقائق سے آگاہ ہوں۔ اُن راتوں میں دوسری رات "مغرب زدہ عورت کی راتیں" ملاحظہ ہو!

ظلمتِ شوق کا آغاز ہیں میری راتیں
کتنی پُرکار و فسوں ساز ہیں میری راتیں

دلِ اخلاق کی جانب ہے مرا تیرِ نگاہ
سربسر فتنۂ اعجاز ہیں میری راتیں

چہرہ پر غازہ تو ہونٹوں پہ لپ اسٹک کی بہار
گلشنِ جلوۂ غمّاز ہیں میری راتیں

اپنی عریانی و آزادیِ پیہم کی قسم
صرف کہنے کو حیا ساز ہیں میری راتیں

کوئی مرکز ہی نہیں شوقِ جنوں ساماں کا
نَو بہ نَو مائلِ پرواز ہیں میری راتیں

کوئی کیا جانے مری فطرتِ پوشیدہ کا راز
محرمِ غمزہ و انداز ہیں میری راتیں

مجھ کو ہر دم طلبِ جاہ لئے پھرتی ہے
حرص کی مستقل آواز ہیں میری راتیں

کیا کہوں تجھ سے میں اختر! مرا افسانہ ہے کیا؟
یعنی اک نغمۂ بے ساز ہیں میری راتیں

بھول جائیے گا

افسانہ

از

جناب رتن رساپوری

"جی، میں نے کہا۔ نمستے!" میں نے جرأت کر کے ایک دیرینہ سوچ اور جذبے کے ماتحت کہہ ہی دیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا شاید انتہائی رفتار سے۔ جسم کی سنسنی کانپنے کی حد تک پہنچ چکی تھی۔

"جی؟" وہ چلتے چلتے اِدھر اُدھر دیکھ کر قدرے رک گئی۔ ایک ہی سرسری نگاہ سے اُس نے گرد و پیش کے بارے میں اطمینان کر لیا تھا کہ کوئی اُسے دیکھ نہیں رہا۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا، اور سہم سی گئی تھی۔ ڈر، حیرانگی اور سراسیمگی بہ یک وقت اُس کے چہرے سے نمایاں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میری حالت اُس کی نسبت ابتر تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سوچ نہیں سکتا تھا کہ میں نے یہ کیا کر دیا ہے۔ لیکن اُس کے سوالیہ "جی" کا جواب میں نے لڑکھڑاتی زبان سے دیا۔ "جی ..... نمستے!"

"جی کیا مطلب؟" وہ قدرے دلیر ہو رہی تھی۔

"جی؟ —— یعنی آپ نمستے کا لفظی معنی جاننا چاہتی ہیں؟" میں نے جان بوجھ کر معصوم بنتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ اِس نمستے سے آپ کا مطلب؟ آپ کو مجھے نمستے کہنے کی جرأت اور ضرورت کیوں کر ہوئی؟ —— میں آپ کو قطعی نہیں جانتی۔ میں نہیں سمجھ سکتی۔ جان نہ پہچان اور مہمان بن بیٹھتے ہیں۔" اُس کی آواز میں دلیری کے ساتھ غصّہ اور رعب بھی تھا۔ اُس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا، اُس کی آنکھیں اور بھی پھیل گئی تھیں۔ نتھنے اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میری جھجک بھی اب کسی حد تک دُور ہو گئی تھی۔ لیکن مناسب اور برمحل جواب نہیں بن رہا تھا، اور بنتا بھی کیا؟ میں نے بوکھلاتے ہوئے ڈھیٹوں کی طرح مسکراتے ہوئے کہا "جی، میں کل کی گاڑی سے دہلی جا رہا تھا —— اسی لئے وداعی نمستے عرض کی تھی۔ بُرا نہ مانئے۔"

وہ نہایت اداکارانہ انداز میں سر اور آنکھیں گھما کر بولی۔۔

"میری بلا سے۔ میں نے جناب سے کب پوچھا اور کہا تھا کہ آپ کون ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ کب جا رہے ہیں۔"

میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں ندامت سے آنکھیں جھکا کر سر کھجلانے لگا۔ ظالم موقع کا فائدہ اٹھا کر تیز آواز میں بولی۔ "آئندہ احتیاط رکھو۔ اِس بار نظر انداز کر رہی ہوں۔ سمجھے؟" —— اور حسبِ معمول اُسی راہ پر کھیتوں کی طرف سیر کی غرض سے چل دی۔ میں شرمندہ ہکّا بکّا سا وہاں کتنی دیر زمین میں نظریں گاڑے کھڑا رہا۔ مجھ سے ہلا نہیں جا رہا تھا۔ ٹانگیں پسینے سے شرابور تھیں اور بے حد وزنی محسوس ہو رہی تھیں نگاہیں گھما کر اُس کی طرف دیکھنے لگا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ اُس نے بھی ایک بار مڑ کر دیکھا، اور میری نظریں جھک گئیں۔ پھر میری اُس طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکی —— "لان" میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور "ڈیلی مِلاپ" اٹھا کر دیکھنے لگا۔ لیکن اخبار کی سرخیوں، سطور اور مضمون پر ایک سیکنڈ کے لئے بھی نظر نہیں جم رہی تھی۔ ذرا بھی یکسوئی نہیں ہو رہی تھی۔ میں رہ رہ کر اپنی حماقت کہئے یا کرتوت، پر غور کر رہا تھا۔ مجھے اپنے کئے پر بہت ہی پچھتاوا ہو رہا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار ایسی ذہنی تکلیف ہو رہی تھی۔ اتنی سخت ٹھیس میری خودداری کو کبھی نہیں پہنچی تھی۔ اور پھر سوچنے لگا، میں خود ہی تو قصوروار ہوں۔ بھلا مجھے کیا حق تھا کہ جان نہ پہچان میں اُسے نمستے کہہ رہا تھا۔ میرا اس سے تعلّق ہی کیا ہے جو میں نے ایسا کیا۔ ایک شریف لڑکی کو خواہ مخواہ اتنی دیر پریشان کیا۔۔۔

پھر سوچنے لگا —— پھر اپنے آپ کو ہی ڈھارس دینے لگا۔ "اچھا تو اب کیا کرنا چاہئے۔ ہو گیا سو ہو گیا —— لیکن مجھے ایسی نازیبا حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی —— مگر اب جب یہ بات ہو گئی، تو کیا کرنا چاہئے۔ اِس کی تلافی کی کوئی صورت —— اور مجھے —— اُس کی شیریں لوچ دار آواز کا خیال آنے لگا۔ اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ کس خوبی سے اس نے میری زبان بند کر دی تھی —— میں سوچنے لگا۔ اچھا۔ اُس کی واپسی پر معافی مانگ لوں گا —— بھلا کیا کہوں گا۔ کیسے کہوں گا؟ کن الفاظ میں معافی مانگوں گا۔ کیا مجھے واقعی معافی مانگ لینی چاہئے؟

یہ سوال تھے جو میرے ذہن میں اُٹھ رہے تھے۔ پھر خیال آنے لگا۔ آخر میں نے ایسا کیا ہی کیوں؟ ——— کتنی ہی دیر تک میں وہاں بیٹھا یہی کچھ سوچتا رہا۔ میں بے حد شرمندہ تھا۔ بہت ہی نادم ——— شاید آئندہ میں کبھی اُس کے سامنے ہو ہی نہ سکوں۔ معافی مانگنے کا خیال خود بخود ختم ہونے لگا۔ اخبار کی سُرخی پڑھتا ——— خبر پڑھنے لگتا۔ تو الفاظ پھیلنے لگتے۔ پھیلتے ہی جاتے تھے ———

غیر ارادی طور پر میری نگاہیں اُس پگڈنڈی پر دُور چلی گئیں جہاں پردہ گئی تھی ——— دُور سے وہ واپس آتی دکھائی دی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور پھر اُسی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں کسی قدر پریشان تھا' کسی قدر پشیمان! ندامت اور شرمندگی سے زمین میں گڑا جا رہا تھا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اُس گھڑی کو کوس رہا تھا، جب مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔ اُس لمحے کو کوس رہا تھا، جب میں نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اُس پگڈنڈی کی طرف دیکھنے کی ہمّت نہ ہوئی کوشش کے باوجود نگاہیں اُس طرف پلٹتی ہی نہ تھیں۔ اور میں نے اُس طرف سے اپنی پیٹھ ہی موڑ لی ——— لیکن قطعی بے سوچے سمجھے اُس طرف گردن موڑ کر دیکھا——— وہ قدرے راستہ لمبا کر کے اپنا روز کا راستہ ہی چھوڑ گئی۔ مجھے پھر اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا۔ میں کتنا بُرا ہوں۔ میں نے ناحق اُسے پریشان کیا کہ ایک ڈیڑھ فرلانگ راستہ اور طے کرے ——— میں نے پھر جب دیکھا تو وہ اپنی گلی کے موڑ پر مُڑ رہی تھی ——— میری پریشانی کچھ کم ہوئی اور دھڑکن بھی کم ہونے لگی۔

میں پھر سوچنے لگا ——— آخر میں نے کس غلط فہمی کے زیر اثر اُسے نمستے کہہ دی۔ محض اس لئے ——— کہ میں اپنے آپ کو خوبصورت سمجھنے کی ایک احمقانہ غلط فہمی میں مُبتلا ہوں۔ مجھے اپنے گھنگھریالے بالوں، اُن کی سیاہی اور چمک پر ناز ہے۔ میں بہترین اور جدید ترین لباس پہنتا ہوں۔ جیسے ہر وقت فوٹو کھنچوانے کے لئے تیار رہتا ہوں (یہ الفاظ ایک منچلے بزرگ نے مجھے حال ہی میں کہے تھے) اور وہ ہر روز کچھ دنوں سے اُسی راہ پر جاتی آتی تھی مجھے اکثر یہاں کھڑے بیٹھے، دروازے پر کھڑکی سے جھانکتے، گنگناتے اور وسل میں فلمی طرزیں بجاتے سُنتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ کبھی کبھی ایک ادائے بے نیازی سے دیکھ بھی لیتی تھی۔ اور جیسا کہ کالج میں لڑکے خاصکر لڑکیاں نہایت جذباتی انداز میں (ہو سکتا ہے بناتی ہی ہوں) میرے لباس اور دوسری باتوں کی نہایت بے تکلّفی سے تعریف کیا کرتی تھیں۔ کبھی بالوں کی کبھی گانوں کی۔ کبھی سوٹوں کی، کوئی ٹائیوں کے انتخاب کی ——— کوئی ڈراموں میں اداکاری کی ——— کوئی گیتوں کی اور کوئی افسانوں میں الفاظ کی ترتیب، فقروں کی بے ساختگی اور روانی کی ——— کیسے کیسے ترقّی پسند انہ لہجے اور الفاظ میں تعریف ہوتی تھی ——— غالباً اُنہیں تعریفوں اور خوش فہمیوں نے مجھے اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ یہ بھی ضرور مرعوب ہوگی۔ اس پر بھی شکل و صورت اور لباس کا رعب طاری ہو چکا ہوگا ——— مجھے تو کامل یقین تھا کہ نمستے کا جواب ضرور ایک مُسکراتی، لجاتی "ننھّی سی نمستے" ہوگی۔ اور پھر ایک پُر لطف رُومان .... لیکن اُس کی گفتگو بلکہ ڈانٹ نے مجھے ایک دیرینہ حسین خواب سے بیدار کر دیا تھا۔ جھنجوڑ دیا تھا۔ مجھے تو کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مجھ ایسے اوصاف کے پُتلے، (جیسا کہ کالج کے ماحول میں مجھے احساسِ برتری ہو چکا تھا) سے وہ کم بخت اس طرح پیش آئے گی۔ ٹھکرا دے گی۔

ہمیں صوبہ سرحد سے جلا "وطن" ہو کر شرنارتھی کی حیثیت سے یہاں آئے ہوئے چار ماہ کے قریب ہو چکے تھے۔ پتاجی مقامی میونسپل کمیٹی میں عارضی طور پر سیکرٹری مقرر ہو گئے تھے۔ گو تنخواہ بہت ہی کم تھی، اور ہمارے گھر کے اخراجات کے مطابق آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی۔ پھر بھی حالات اور واقعات کے پیشِ نظر یہی غنیمت اور غیبی امداد تصوّر کی گئی۔ کہ نہ ہونے سے تو کہیں اچھا ہے۔ بے کار سے بیگار بھلی۔

اخبارات، ناول، رسائل پڑھنے اور خطوط نویسی کے علاوہ بیکاری میں میرا ایک اور شغل جو تھا۔ وہ تھا ——— صبح و شام "اُس" کے سیر کے اوقات کے انتظار میں عموماً کھڑکی میں بیٹھ کر اخبار کی اوٹ سے اُسے جاتے ہوئے۔ اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ گنگنانے لگتا تھا...... اور پہروں اُس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اُس کے خیال میں غرق رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی بے کاری کا بھی احساس اور خیال نہ رہتا تھا..... مجھے اُس کی چال بہت ہی بھلی، اور پیاری لگتی تھی۔ تول تول قدم رکھتی تھی..... تنک کر سینہ اُبھار چلتی تھی..... میں تو ہزار جان سے قربان تھا۔ سرو قامت ———

چھریرا جسم ——— گلابی گلابی رنگت۔ چہرہ حد درجہ جاذب نظر۔ کتنی پیاری معلوم ہوتی تھی ——— عموماً نہایت ستھرا اور موزونا لباس پہنتی تھی ——— اُس کا مزاج ——— سلیقہ اور شعار اُس کے سادہ اور قیمتی لباس سے صاف عیاں تھا۔ پکار پکار کر اُس کی نفاست کا اظہار کرتا تھا ——— اور جب کبھی آسمانی رنگ کی شنون کی اوڑھنی لئے ہوئے گذرتی، جو جھلمل جھلمل کرتی ——— لہرا لہرا جاتی تھی۔ تو میرا جی بے اختیار چاہتا کہ اُس کے روبرو ہو کر اُس سے درخواست کروں کہ خدا کے لئے ——— اس اوڑھنی کو نہ اتارا کرو۔ اور نہیں تو سیر کو جاتے ہوئے اُسے ضرور اوڑھا کرو۔ میری خاطر۔ — ایک قدر دان کی خاطر — ایک شرنارتھی کی دلجوئی کی خاطر...... مجھے بارہا خواہش ہوئی کہ اُس سے کبھی باتیں کروں۔ لیکن وہ کبھی اکیلی نہ ہوتی تھی۔ عموماً اُس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی ہوتی۔ جو چوکیدار یا باڈی گارڈ تو نہیں۔ لیکن ایک ساتھی ضرور سمجھی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھی ایک بڑھیا بھی ہوتی۔ بھگوان جانے دادی یا پھر ——— خدا جانے کون؟

میں نے اُسے چار مہینوں میں چند ہی بار اکیلے جاتے دیکھا تھا۔ اور اُس وقت میں نے بہت چاہا کہ اُس سے کچھ کہوں۔ کیا کہوں؟ ——— یہ کبھی نہ سمجھ سکا۔ کئی بار جرأت کر کے دروازے سے باہر بھی نکلا۔ کچھ آگے بڑھا بھی۔ لیکن قدم ہمیشہ دوسری طرف مڑ جاتے۔

میں نے صبح بستر سے اُٹھتے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ آج ضرور اس سے بات کروں گا۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور کہوں گا۔ کیونکہ میں اب بہت جلد یہاں سے کسی کام کی تلاش میں باہر چلا جانا چاہتا تھا۔

شام کو جلد ہی میں نے باغیچے میں گلاب کے گھنے پودے کے سامنے میں ایک آرام کرسی رکھ دی، اور بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ اخبار دیکھنا تو محض وہاں بیٹھنے کا بہانہ تھا۔ ورنہ آج میں اُس سے ملاقات کی ترکیبیں اور عنوان سوچ رہا تھا۔ ——— آخر "نمستے" کہہ دینے کے سوا کچھ بہتر نہ سوجھا۔ میں نے ارادہ کر لیا۔ آج ہر قیمت پر اُسے "نمستے" کہوں۔ اور بعد میں دیکھا جائے گا۔ اتفاق دیکھئے ——— آج وہ بالکل تنہا آئی ——— اور "نمستے" کہنے کا جو نتیجہ ہوا۔ اُس نے میری تمناؤں اُمنگوں، ارادوں اور جذبات پر پانی ہی پھیر دیا۔ دل اُتنا نادم ہو۔ اور بیٹھ گیا کہ سارا دن انتہائی اُداسی اور مایوسی میں گذرا۔ نہ مجھے پڑھنے کا شوق اور نہ لکھنے کا۔ کھانے کی حاجت نہ گھومنے کا خیال۔ تمام دن اپنے آپ پر غصہ آتا رہا۔ اپنے آپ کو لعن طعن کرتا رہا۔ لیکن جب کبھی چلتی ہوئی نگاہوں میں پھر جاتی تو طبیعت بے چین ہو جاتی اور دل زور سے دھڑکنے لگتا۔

رات دیر تک نیند نہ آئی۔ شام کو اچھی طرح کھانا بھی نہ کھا سکا۔ ——— اُدھر بھوک ستا رہی تھی اور اُدھر اُس کی یاد آ جاتی ——— بہت رات گئے تک اِنہیں خیالوں میں غرق رہا۔ اُداس رہا ——— اور پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی...... تو بند بند دُکھ رہا تھا ——— اور ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز کھو گئی ہو، جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ زندگی میں ایک ناقابلِ برداشت خلا سا محسوس ہو رہا تھا...... میں نے ذہن پر بہتیرا زور دیا۔ آخر اس کی وجہ ——— ؟ یہ کیوں ——— ایسا کیوں؟ بھلا کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس خلا کی ——— اُداسی کی۔ کھوئے کھوئے پن کی ——— اچانک میرا دل دھڑک اُٹھا۔ کل کی بات دل میں نشتر چبھونے لگی ——— دل بیٹھنے لگا اور میں دیر تک خاموش لیٹا رہا۔ اُوندھے منہ پڑا رہا۔ سوچتا رہا.... جانے کیا ہوا ——— ! بیٹھے بیٹھے مجھے کیا روگ لگ گیا ہے ——— دل ہی دل میں توبہ کرنے لگا۔ اب کبھی کھڑکی میں نہ بیٹھوں گا۔ اُسے بالکل بھول جانے کی کوشش کروں گا۔ کوشش ہی کیا۔ بالکل بھلا ہی دوں گا۔ اُس کے بارے میں کبھی کچھ نہ سوچوں گا۔ نہ اُس کی چال کے متعلق...... نہ رفتار کے متعلق　　نہ اُس کی اوڑھنی ——— اوڑھنی کا خیال آتے ہی پھر اُسی خیال میں ڈوب گیا کہ اُسے کہوں گا کہ یہ اوڑھنی سیر کو جاتے ہوئے ضرور اوڑھا کرو۔ ——— خدا کے لئے　　- ایک قدر دان کی خاطر —　　ایک شرنارتھی کی دلجوئی کی خاطر......

سیر کا وقت جوں جوں قریب آتا گیا۔ دل بے قرار ہونے لگا۔ دیکھنے کا اشتیاق اُبھرنے لگا ——— اور سب کچھ فراموش کر کے اخبار لے کر باغیچے میں جا بیٹھا۔ اُس کے راستہ کی طرف پُشت کر کے۔ اخبار کے ایک دلچسپ آرٹیکل میں سب ماضی اور حال بھول گیا۔ مضمون طویل اور دلچسپ تھا۔ مجھے دیر تک دوسری کسی چیز کا خیال نہ آیا ——— اور میں پڑھتا رہا ——— کھو یا رہا ———

اچانک ایک سریلی آواز نے چونکا دیا۔ "جی نمستے ——— !"

میں نے حیرت سے مڑکر دیکھا ——— "وہی" میری پسندیدہ اوڑھنی اوڑھے کھڑی جواب کی منتظر مسکرا رہی تھی۔ میں نے تو اِس واقعہ کو ایک واہمہ اور خواب تصوّر کیا۔ اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ——— مجھے یقین ہوگیا کہ میں واقعی جاگ رہا ہوں۔ اور سب حقیقت ہے۔ دھڑکتے ہوئے دِل سے میں نے بے ساختہ کہا "جی ...... ؟" اور اُسی طرح پھٹی پھٹی نظروں سے تکنے لگا ...... اُس نے زیرِ لب مُسکراتے ہوئے پھر کہا "جی — نمستے" ——— "جی کیا مطلب ؟" میں نے بالکل بے سمجھے کہہ دیا۔

وہ ہنس دی ——— چاروں طرف مُسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں بکھر گئیں ———

بولی "کیا آپ اب بدلہ لے رہے ہیں ؟ یقین مانئے میں اپنے کل کے برتاؤ سے بہت ہی شرمندہ ہوں۔ کل تمام دن میں اپنے آپ کو کوستی رہی کہ میں نے ایسی بات کیوں کی۔ آخر آپ نے بُرائی ہی کیا کی تھی ——— "نمستے" کا جواب نمستے سے دینا ——— میرا اخلاقی فرض تھا ——— دیکھئے آپ بُرا نہ مانئے گا۔ سچ کہتی ہوں۔ میں کل کی بات کی معافی مانگنے آئی ہوں"

میں یہ غیر متوقع اور اچانک بات، سُن کر حیران ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں ——— ———
میں نے بے اندازہ مسّرت کو دباتے ہوئے صرف مُسکراتے ہوئے کہا۔
"جی کیا کہہ رہی ہیں ہم ——— وہ تو میں ......"
میں اچانک کسی خیال کے آنے پر، بلکہ کسی خاص مصلحت کے زیرِ اثر خاموش ہوگیا ——— میں اب اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی کمزوری نے بات کا رُخ پلٹ دیا تھا۔ میرا سر غیر ارادی طور پر فخر و ناز سے بلند ہوگیا اور میں نے متانت سے کہا۔ "جی، کوئی بات نہیں — اب یونہی پریشان ہو رہی ہیں ——— بیٹھئے نا ———" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے اشارہ کیا۔

وہ بہت ہی دلرُبا انداز سے بولی "جی بیٹھتی نہیں ہوں اِس وقت ...... میں نے کل کے اپنے روکھے پن کی معافی چاہی تھی۔ کیا آپ معاف نہیں کریں گے ؟"

میں نے مردانہ فطرت سے کام لیتے ہوئے فراخدلی کے انداز میں کہا۔ "جی، آپ تو مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ چھوڑیئے بھی اب بیتی باتوں کو ! کوئی دوسری بات کیجئے ———"

وہ قدرے سنجیدہ گی اور جذباتی انداز میں بولی "کیا آپ واقعی جارہے ہیں۔ کل آپ دہلی جانے کو کہہ رہے تھے نا ؟"

"جی نہیں، اب چند دن کے لئے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ خیال ہے، اگلے ہفتے تک ......" ہمارے گھر کا دروازہ کھٹ کھٹ کر رہا تھا اور وہ یہ کہہ کر چل دی "اچھا۔ پھر ملوں گی — اور پچھلی باتیں بھول جائیے گا" — میں نے دروازے کی طرف مڑکر دیکھا ننھی سنبل — باہر نِکل رہی تھی — میں منہ میں بڑبڑایا "ہشت۔ کیا اسی دونت تجھے دروازہ کھٹکھٹانا تھا"۔ وہ کافی دُور کھیتوں کے ساتھ ساتھ جارہی تھی۔ اُس کی اوڑھنی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ میرے کانوں میں اُس کے آخری الفاظ گونج رہے تھے — "اور پچھلی باتیں بھول جائیے گا" (طبع زاد)

قطعات

از

جنابِ نازش پرتابگڑھی

تصوّر

زہرہ سے پرے محفلِ ناہید کے اُس پار
ماضی نے مجھے جیسے پکارا ہے کئی بار
گونجا ہے کئی بار شبستانِ تصوّر
آئی ہے مرے کانوں میں پازیب کی جھنکار

یاس

زیست کو نازش پسینہ آگیا !
جانے کس عالم میں غم پہنچا گیا
یوں بجھا میری امیدوں کا چراغ
صبح کے تارے کا دِل تھرّا گیا

صنفِ نازک کے لکھے ہوئے ادب پارے

۱- کا سے کہوں من کی بات

برکھا رُت آگئی
جھومتی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھ کر
آنکھوں کی رُکی ہوئی ندی
چھلک پڑی
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ
کوئل کے سریلے راگ - اور
پپیہے کی پیہو پیہو،
سکھی :
اِس منوہر رُت میں
میرا من کِس کے لئے تڑپ رہا ہے
میری آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں
کِسی کو ڈھونڈ رہی ہیں
میرے ہونٹ کِسی کو من کی بات
سُنانے کے لئے پھڑک رہے ہیں
پر ـــ میری اچھی سکھی
تُو ہی بتا
یہ من کی بات کیسے سناؤں
کِس سے کہوں
پیتم تو اُس انجانے دیس میں
جا بسے ہیں
جہاں سے آج تک
کوئی لوٹ کر نہیں آیا

۲- مرجھایا ہوا دل

سکھی
تو پوچھتی ہے میں اُداس کیوں ہوں
غمگین کیوں ہوں
میری آنکھوں سے دن رات
بہتی ہوئی جمنا ٹھہرتی کیوں نہیں
میرے افسردہ ہونٹوں پہ
مُسکراہٹ کیوں نہیں ناچتی
میری بھولی سکھی !
مُکھڑا من کا درپن ہے
او رجب دل ہی مُرجھایا ہوا ہو
تو چہرے پہ خوشی کیسی
ہنسنا ہنسانا کیسا

۳- ٹوُٹ گئی من کی بینا

اے ہمدم !
خدا کے لئے میرے دل کے ساز کو
نہ چھیڑ
تُو جن مسرت فزا نغموں اور ترانوں کا
متلاشی ہے
وہ اِس ٹوٹے ہوئے ساز میں کہاں ؟ (طبع زاد)

پروین جہاں رامپوری

۴- جوانی

جوانی
آکر
تیرے انتظار میں آنکھیں تھک گئیں
تیرے لئے ہر کلی کھِلنے کو بے قرار ہے
تُو آ ـــ کہ کلیاں کھلیں - پھُول بنیں
جوانی !
کِتنی مسرّت ہوتی ہے تیرا نام لیتے ہوئے
جب تُو آتی ہے، تو
دل و دماغ کی عجیب حالت ہو جاتی ہے
آنکھوں میں شرابی ڈورے پڑنے لگتے ہیں
رگ رگ میں مستی آجاتی ہے
کملائے ہوئے ہونٹ مُسکرانے لگتے ہیں
ارمان مچلنے لگتے ہیں
لچکتی باہیں ـــ اور
مخمور آنکھیں ـ ـ
کسی کو پانے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہیں
دِل میں اُمنگیں مچلنے لگتی ہیں
کاش تُو ہمیشہ ساتھ دے سکے (طبع زاد)

مسز نِرمل ترلوک

۵- پنگھٹ پہ لاگی یاریاں

ایک پردیسی
پنگھٹ پہ آیا
پیاس سے
اُس کے ہونٹ سوکھ گئے تھے
اُس نے
مجھ سے پانی مانگا

میں
لجاتی، شرماتی
اُس کے قریب گئی

اور
ڈول اُس کی طرف بڑھا دیا
پردیسی نے پانی پیا
اور
پھر
ہم دونوں کی نگاہیں ملیں
پھر
پردیسی چلا گیا
اور
ساتھ ہی ساتھ
میرا دل بھی
لیتا گیا
اب بھی میں
روز
پنگھٹ پر
اُس کی راہ دیکھا کرتی ہوں
شاید وہ
پھر آئے

۶۔ عورت

عورت
ایک ان بوجھی
پہیلی ہے
اُس کی ہنسی میں
رونا
اُس کے غم میں
خوشی
اُس کی "ہاں" میں نا
اور نا میں ہاں نہاں ہے
عورت
صرف
ایک بار
پیار کرتی ہے
عورت
ایک خوشنما پھول ہے
اور
ایک خوبصورت کانٹا بھی
جب اُسے دھوکہ دیا جاتا ہے
تو
وہ
بھیانک انتقام لیتی ہے
اور
جب اُس سے محبت
کی جاتی ہے
تو
وہ سراپا پیار بن جاتی ہے
عورت
امرت بھی ہے اور زہر بھی!
عورت ایک ان بوجھی پہیلی ہے

۷۔ بالم گھر آئے

میرے چھت کی منڈیر پر
ایک کبوتری
بیٹھی تھی
اداس ——— اداس
یکایک
اُس کا پیتم
اُس کے پاس
آ گیا
اور اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ
کھل اُٹھا
میرا دل
اندر ہی اندر
مچلنے لگا
کاش!
میرے بھی پیتم
یہاں ہوتے
اتنے میں دروازہ کھلا
میں نے مڑ کر دیکھا
میرے پیتم کھڑے
مسکرا رہے تھے! (طبع زاد)

قریشیہ خاتون افق

۸۔ لمحاتِ فرقت

تمہارے بغیر ——— یہ دن ——— یہ راتیں
یہ شامیں، کتنی اداس نظر آ رہی ہیں
ساری کائنات پر موت کی سی اداسی چھائی ہوئی ہے
یہ چاند ——— یہ تارے ——— اور کہکشاں کی یہ لکیریں ——— کیسی بے معنی اور بے جان نظر آتی ہیں ——— چاندنی میں وہ سرور نہیں۔
ہواؤں میں وہ کیف نہیں
فضاؤں میں وہ رومان انگیزیاں نہیں
کیسے اداس اور غمگین ایام ہیں یہ
کاش، فراق کی یہ لمبی گھڑیاں جلد ختم ہوں ——— دوری کی یہ صبر آزما مدت جلد جلد خوشی کے دن میں تبدیل ہو جائے۔
کاش ایسا ہو (طبع زاد)

نسیمہ مسعود

افسانہ

عورت کا کلنک

از
جناب اسحٰق ادیب

پردیپ کے کمرے میں لگی ہوئی سنہری فریم کی تصویر کو دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ میں نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے ضرور۔ لیکن دماغ پر بہت زور دینے کے بعد بھی یہ یاد نہ آسکا کہ کب اور کہاں دیکھا ہے۔ آخر پردیپ سے پوچھ ہی بیٹھا "یہ کس کی تصویر ہے؟"۔

اس نے رازدارانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ پھر ایک فخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا "جس کی آنکھوں میں مئے احمریں ہے۔ ہونٹوں میں امرت رس ہے۔ جس کی مسکراہٹ میں زندگی کی بہار ہے۔ جس کی آواز میں کرشن کی بنسی کے نغموں کی مٹھاس ہے۔ جس کی ہر ادائے مستانہ پر زمین اور آسمان جھومتے ہیں۔ جس کا پرتو میں چاند کی کرنوں میں۔ تاروں کی جگمگاہٹ میں، پھولوں کی پنکھڑیوں میں، کائنات کے ذرے ذرے میں دیکھتا ہوں۔ جس کی مدھر بانی کلیوں کے چٹکنے میں۔ ساون کی رم جھم میں۔ مست ہوا کے ترانوں میں، جھرنوں کی گنگناہٹ میں اور جھیل کی الھڑ لہروں کی سرگوشیوں میں سنتا ہوں ——" بولتے بولتے اس نے ایک کیف کے عالم میں آنکھیں موند لیں۔ اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جیسے کسی حسین خواب میں کھو گیا۔ پھر اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ ہلے۔ اور دو فور کیف سے تھرتھراتی ہوئی آواز فضا میں تیری: "یہ اس ہیرا کا عکس ہے۔ جس کا جواب آج پیش نہیں کیا جاسکتا ——!"

"ایں ——؟" میں چونک کر نفرت آمیز انداز میں بولا "لیکن یہ نام تو یہاں کی ایک رنڈی کا ہے؟"۔

"کیا بکتے ہو ——؟" اس نے کسی قدر بگڑ کر کہا: "اسے رنڈی مت کہو کلدیپ۔ ورنہ میں سمجھوں گا تم مجھے گالی دے رہے ہو۔ وہ میری زندگی ہے۔ میرے دل کی ملکہ ہے۔ میرے سکھ اور چین کی مالکہ ہے۔ میری دنیا ہے۔ ہیرا حقیقت میں ایک انمول ہیرا ہے ——!"

"ہیرا تو ہے —— لیکن کیچڑ میں لت پت ہو کر کیچڑ جیسا ہو گیا ہے پردیپ" میں اس کے بھولے پن پر ہنس کر بولا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ——؟" اس نے مجھ پر طنز کیا۔

"میرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم پاگل ہو گئے ہو۔ اس کا مجھے افسوس ہے ——!" میں نے ہمدردی کے لہجہ میں کہا۔

"اگر میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں تو بھی افسوس نہ کرو کلدیپ مجھے فخر ہے کہ میں ہیرا کی محبت میں پاگل ہوں" اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا: "البتہ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ کہ تم اس دولت سے محروم ہو۔ کاش تم بھی کسی کی محبت میں پاگل ہو سکتے۔ اور محبت کے اس تقدس کو سمجھ سکتے۔ جسے تم دیوانگی کہہ رہے ہو"

میں بے اختیار قہقہہ لگا کر بولا۔ "خوب، ایک رنڈی سے اور محبت۔ وہ بھی مقدس اور پاک؟۔ کیا بکتے ہو پردیپ؟۔ ایک بازاری عورت کے ساتھ جذبات پرستی کو محبت کا نام دے کر تم نے محبت کے تقدس کو اسی طرح ناپاک کر دیا ہے۔ جس طرح تمہارا ہیرا، گناہ کی گندگی میں آلودہ ہو کر مجسم گناہ بن گیا ہے۔ تم کو اب بھی پاگل نہ کہوں تو کیا کہوں؟۔ تم ان آنکھوں میں آب حیات دیکھتے ہو۔ جن سے زہر قاتل چھلکتا رہتا ہے۔ ان ہونٹوں میں امرت رس بتاتے ہو جن کا ڈسا ہوا زندگی کے آخری لمحات تک کراہتا رہتا ہے۔ تم اس مسکراہٹ کو زندگی کی بہار سمجھتے ہو جو ابروں کے بل سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ ایک رنڈی سے محبت کی امید رکھنا ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے کوئی پیاسا پتھر کی چٹان سے پانی کی دھار پھوٹنے کی آس لگائے۔ تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ تم ایک ایسی عورت سے محبت کرتے ہو جس کے آنسو اور مسکراہٹیں، نفرت اور محبت سب کاروباری چیزیں ہیں۔ سب کی قیمت صرف پیسہ ہے۔ اور پیسے کے علاوہ اس کی نظر میں کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں ——؟"

"یہ سب خرافات سوچنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی کلدیپ" وہ میرا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اور نہ کبھی اس کے لئے مہلت ہی ملی۔ تم کہتے ہو۔ وہ رنڈی ہے۔ لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ وہ عورت بھی ہے۔ ... سونا ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر بھی رہیگا تو ...سونا ہی ——!"

"تو کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ سونے کی چھری تمہارا گلا نہیں کاٹ سکتی۔ اس لئے کہ وہ سونا ہے۔ پردیپ تم جس چیز کو محبت سمجھ کر اپنے اندر پرورش کر رہے ہو وہ صرف ہوس کا نشہ ہے اور ہیرا جتنی تمہاری خاطر و مدارات کرتی ہے۔ وہ سب تمہارے پیسے کی وجہ ہے۔ انسان نشے اور لالچ کے ہاتھوں فہم و بصیرت سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ ایمان، دھرم، اچھے، بُرے اور نفع نقصان سب کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کہانیوں اور فلموں کے علاوہ حقیقی زندگی میں بھی تم نے کبھی کسی ویشیا کو کسی کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی قربانی کرتے بھی دیکھا ہے؟۔ ان کی نگاہیں تو بس جیب پر رہتی ہیں۔ جتنا وزن اس میں ہوگا۔ اتنی ہی اُن کی محبت کی حدیں بھی پھیلتی جائینگی!"

"بس کلدیپ ——!" وہ بگڑ کر بولا "بس اب اپنی نصیحتیں اپنے لئے محفوظ رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ اور میں کہے دیتا ہوں کہ اگر اُس کے خلاف کچھ کہنا ہے۔ تو مجھ سے بولنا چھوڑ دو"

اس نے یہ الفاظ کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ میں وہاں نہ بیٹھ سکا خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار پردیپ کے حالات سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ گھڑی گھڑی میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ جس کے گھر میں چندرا جیسی حسین و جمیل بیوی موجود ہے۔ وہ چندرا جس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ جس نے گھر میں آتے ہی اپنی نیک طینتی، سلیقہ مندی، خدمتگزاری اور شیریں زبانی سے خاندان کے علاوہ آس پاس کے لوگوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ جو گھر کو مندر اور شوہر کو دیوتا سمجھتی ہے۔ ایسی دیوی کو چھوڑ کر پردیپ ایک ننگ نسائیت بازاری عورت کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ وہ عورت جو سماج کی غلاظت اپنے اندر سمیٹے ہوئے گندی نالی کی طرح بہہ رہی ہے۔ جو سماج کے کوڑھیوں کے مُنہ کا اُگلا ہوا نفرت انگیز نوالہ ہے۔

اور اسی اُگلے ہوئے نوالے سے یہ پردیپ اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

گھڑی نے بارہ بجائے۔ اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی پردیپ کے کمرے کا دروازہ کھُلا۔ اور کسی کے باہر نکلنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے آواز دی "کون ہے ——؟"

"میں ہوں —— پردیپ ——!" پردیپ اس طرح بولا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔

"اتنی رات گئے کہاں چلے ——؟" میں نے پوچھا۔

وہ آہستہ سے سرک کر میرے کمرے میں آگیا۔ میرے قریب پلنگ پر بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولا "دوست ——! اس کے ہاں گئے بغیر نیند نہیں آ رہی ہے ——!"

"اس اندھیری اور طوفانی رات میں تنہا ڈرو گے نہیں ——؟" میں نے سوال کیا۔

"پریم خود ہی ایک اتنا بڑا طوفان ہے۔ کہ جس کے سامنے قیامت بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ کسی دوسری طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کے رات اور دن سب جدا ہیں۔ !" وہ کسی قدر تن کر بولا۔

میں اس کا جواب سُن کر حیران رہ گیا۔ جی میں آیا ذرا میں بھی چل کر دیکھوں تو وہ ہیرا کیسی ہے۔ جس نے پردیپ کی روح کو اس قدر مسحور کر رکھا ہے۔ لیکن ضمیر نے کہا۔ "وہی ویشیا ہے جس کے خلاف ابھی ابھی تو بہت کچھ کہہ چکا ہے۔ اور ٹھیک کہہ چکا ہے۔" ساتھ ہی دل نے کہا۔ "اُونہہ، صرف اُسے دیکھ لینے میں کونسا پاپ رکھا ہے۔ اور اگر کسی درجے میں پاپ ہوا بھی تو ایسے پاپ سے کون بچا ہوا ہے۔ پنڈت، مُلّا، اور لیڈر۔ کس نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے"

بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا "میں بھی تمہاری ہیرا کو دیکھنا چاہتا ہوں پردیپ —— کوئی ہرج تو نہیں ہے نا ——؟"

"اوہ —— چلو چلو ——!" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "ہرج کیا ہو سکتا ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے چلنے سے اس کی توجہ میری طرف سے کم ہو جائیگی۔ ایسا نہیں ہوگا تم اطمینان رکھو۔ تب ہی تو میں نے کہا کہ وہ ہیرا ہے —— معمولی عورت نہیں۔ اُسے تو رنڈی کے گھر میں پیدا کر کے قدرت بھی

پھتاتی ہوگی۔ اس کا تو اس ماحول میں دم گھٹ کر رہ جاتا اگر میں نے سہارا نہ دے دیا ہوتا۔ کیا کروں اس تنگ نظر سماج سے مجبور ہوں۔ ورنہ وہ تو اس کوچے کی ہوا سے بھی نفرت کرتی ہے۔ ——!" وہ ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ گیا۔

ہم دونوں ہیرا کے گھر پہنچے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی ننگی تلوار کی لپک میری آنکھوں میں کوند گئی۔ وہ لوچ دار کمان کی طرح خمیدہ ہوکر ایک دلربایانہ انداز سے بولی: "آداب بجا لاتی ہوں۔ آیئے تشریف رکھیئے ——!"

میں اُس کی مترنم آواز اور دلفریب حُسن سے زیادہ اُس کی جھکی جھکی نشیلی آنکھوں اور معصوم مسکراہٹ سے متاثر ہو رہا تھا۔ مجھے ندامت ہو رہی تھی کہ میں ایسے مقدس ہونٹوں اور معصوم و دلفریب آنکھوں کے متعلق کیسے نفرت آمیز اور گندے خیالات رکھتا تھا۔ اتنے میں پردیپ بولا: "پہچانتی ہو انہیں ——؟ یہ تمہارے ولیلا ہیں۔"

"میرے نصیب جو آپ نے غریب خانے کی عزت بڑھائی ——"
پھر پردیپ سے مخاطب ہوکر تشکر آمیز انداز سے بولی: "یہ آپ کی نوازش ہے۔ ورنہ ہماری دنیا میں یہ سُہانا رشتہ کہاں نصیب ہوتا؟" اور پھر طشتری سے پان اٹھا کر عروس نو کی طرح شرماتی لجاتی اور جھکی جھکی نگاہوں سے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے پان لیتے ہوئے پردیپ سے کہا: "میں ایسی بھابی پاکر فخر محسوس کر رہا ہوں۔"

"میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔" ہیرا آنکھوں سے مسکراتی ہوئی بولی "لیکن اس شرط پر کہ آپ ان کے ساتھ روزانہ غریب خانے پر تشریف لاکر عزت افزائی فرماتے رہیں ——!"

"انہیں گانا تو سناؤ ——!" پردیپ نے ہنس کر کہا۔ "پھر آنے کی سفارش نہ کرنی پڑے گی۔ یہ خود ہی ——!"

ہیرا چونک کر بولی: "ابھی ابھی سازندوں کو بلاتی ہوں۔"
آواز دیتے ہی سازندے آ پہنچے۔ سارنگی کی آواز کے ساتھ مل کر ہیرا کی سامعہ نواز اور کیف پرور آواز کا جادو فضا پر چھا گیا۔ میں تو جیسے ہیرا کی آواز کی لے میں جذب ہو رہا تھا۔ اور پردیپ تو گویا مدہوش سا ہوگیا۔

گانے کے بعد کچھ دیر بات چیت کرتے رہے۔ جب واپسی کیلئے اٹھنے لگے تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میں اپنا سب کچھ ہیرا کی نذر کر چکا ہوں۔ اپنی روح، اپنا دل، اپنی جان، غرض سب کچھ!

کسی نہ کسی طرح گھر آیا۔ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند نہیں آئی۔ ہیرا کی موہنی صورت اور دلکش ادائیں آنکھوں میں گھومتی رہیں۔

صبح بھی ہوگئی۔ اور پورا دن بھی اُسی بے قراری میں گذر گیا۔ کسی پہلو چین نہ آتا تھا۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ شام ہوئی۔ سورج ڈوبا۔ دھندلکا چھایا۔ آسمان میں تارے چھٹکنے لگے۔ میرا اضطراب دیوانگی کی حد کو پہنچنے لگا۔

میں سارے خیالات سے بے پرواہ ہوکر پردیپ کے پاس پہنچا۔ اور کچھ شرماتے شرماتے بولا: "کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے ہو؟"

"نہیں تو —— کہو کیا بات ہے۔؟" وہ چونک کر بولا۔

"یہی کہ ——!" میں نے کچھ رُک کر کہا۔ "جانے کیوں طبیعت بہت بے کیف ہو رہی ہے۔ چلو ذرا بازار کی طرف گھوم آئیں۔ اور اگر کوئی ہرج نہ ہو تو ہیرا کے ایک دو گانے بھی سنوا دینا۔ بھئی خوب گاتی ہے۔ اور اگر چاپلوسی نہ سمجھو تو اب تو اس کی شرافت اور اخلاق دیکھ کر میں بھی یہ کہنے پر خود کو مجبور پا رہا ہوں کہ واقعی رنڈی کے گھر میں پیدا کرکے قدرت نے غریب پر ظلم کیا ہے ——!"

پردیپ تو جیسے تیار ہی بیٹھا تھا اچھل کر بولا: "اوہ —— چلو بھئی چلو۔ طبیعت کی بے کیفی کی تو جیسے ہیرا خاص طبیب ہے ——"
اور ہم چل پڑے۔

اس رات مجھے ہیرا کے دروازے میں قدم رکھتے ہوئے پہلے دن کی سی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ پھر اسی مترنم آواز اور بھولی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال ہوا۔ آج باتوں میں بے تکلفی کے ساتھ ہنسی مذاق کی بھی چاشنی تھی۔ بلکہ گانا کم ہی ہوا۔ اس کی باتوں ہی میں وہ نغمہ اور رس تھا کہ ذوق سماعت جھوم جھوم اٹھا۔ اس روز میں دل میں اور زیادہ خلش لیکر لوٹا۔

اب میری یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ ہر آن ہیرا میری آنکھوں میں بسی رہتی تھی۔ ہر دن شام کے انتظار میں کٹتا۔ لیکن ہر شام کو اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ضمیر تنبیہہ کرتا "وہاں نہ جاؤ۔ وہ رنڈی ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ساری آبرو خاک میں مل جائے گی۔ شریفوں کی نگاہوں سے گر جاؤ گے۔ دنیا میں عزت کا کوئی مقام نہ رہے گا۔"

لیکن ہیرا کی آنکھوں کا تصور ضمیر کی آواز پر غالب آجاتا۔ اور

میں آستانِ حسن پر سر جھکا دیتا۔

پھر گاہے گاہے یہ خیال بھی پیدا ہونے لگا کہ ہیرا کے ہاں جانا صرف اسی لئے بُرا ہے کہ وہ لنڈی ہے؟۔ اگر وہ کسی شریف آدمی کے ساتھ زندگی کا رشتہ قائم کرلے تو ــــ؟۔ پھر میں اپنے آپ ہی جھنجھلا اُٹھتا۔ اُونہہ، آخر میں اس کے متعلق یہ سب سوچتا کیوں رہتا ہوں۔ وہ میری ہے کون؟۔ لیکن اس کیوں اور کون کا نہ تو مجھے جواب ملتا نہ میں اس کے متعلق سوچے بغیر رہ سکتا۔ بڑھتے ہوئے محبت کے طوفان کو میرا دل روک نہ سکتا تھا۔

اب میں پردیپ سے چھپ کر تنہا اور دن کے اُجالے میں بھی ہیرا کے گھر جانے لگا۔ حالانکہ یہ خیال بھی میرے پیچھے لگا رہتا تھا کہ کسی دن پردیپ نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا؟۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے میری اس خیانت سے اس کے دل پر کتنی چوٹ لگے گی؟۔ اور اگر سوال کر بیٹھا کہ جس کے خلاف لکچر دیا کرتے تھے۔ اب اسی کی پوجا کیسے شروع کردی۔ تو کیا اور کس مُنہ سے جواب دوں گا؟۔ لیکن ساتھ ہی اندر سے کوئی بول اُٹھتا۔ جواب دینے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ کوئی تمہارا آقا ہے؟ بہت ہوگا بولنا چھوڑ دے گا۔ اس سے تمہارا بگڑ کیا جائے گا؟۔ اور ساتھ ہی ضمیر پکار اُٹھتا۔ بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ بچپن کی اس دوستی کا جنازہ نکل جائے گا۔ جس میں زمانے کی گردش اور بڑے بڑے حادثات بھی فرق نہ ڈال سکے۔ لیکن یہ تمام چیزیں ہیرا کی بے پناہ محبت کی تہوں میں دَب کر رہ گئیں۔ اور میں اُسی طرح پردیپ سے چھُپ کر اس کے یہاں آتا جاتا رہا۔

ایک دن کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ہیرا کے گھنگھریالے اور کالے کالے بالوں کے گچھے بار بار بدمست بھنوروں کی طرح اُس کے پھول سے گالوں پر آ رہے تھے۔ اور وہ اپنی مہندی لگی ہوئی یاقوتی انگلیوں سے بار بار جھنجھلا جھنجھلا کر اُنہیں جھٹک رہی تھی۔ بالوں کی یہ پُر لطف چھیڑ اور ہیرا کی دلربایانہ جھنجھلاہٹ دیکھتے دیکھتے جانے کس جذبے کے ماتحت میرے مُنہ سے نکل گیا: "آخر جو چیز سب کے لئے عام ہے اُس سے ان غریبوں ہی کو کیوں محروم رکھنا چاہتی ہو ــــ؟"

میں نے تو مذاق سے کہا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ ہیرا کے نازک اور حساس دل پر اس کا اتنا اثر ہوگا؟۔ یکایک اس کا چہرہ افسردہ ہوگیا اور اس کی جھکی ہوئی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے موتیوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے بے اختیار اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اپنی ہتھیلی سے اس کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر پشیمانی کے انداز میں بولا: "ہیرا ــــ مجھے معاف کردو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے معصوم دل پر میرے اس مذاق کا اتنا گہرا اثر ہوگا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اپنے پہلو میں اس قدر شریف اور حساس دل رکھتے ہوئے تم ایسے ماحول میں اتنے دنوں سے کس طرح زندگی گزار رہی ہو ــــ؟"

"زندگی ــــ؟" وہ میری گود میں سر ڈالے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی بولی: "زندگی نہیں گزار رہی ہوں کلدیپ بابو۔ بلکہ اپنے پچھلے جنم کا پاپ بھوگ رہی ہوں۔ آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں اس جہنم میں کس طرح جی رہی ہوں۔ لیکن کیا کروں؟ پیٹ اور ضروریات سے مجبور ہوں۔ جوانی میں کون مرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے دو بار خودکشی کی کوشش کی۔ مگر عین وقت پر کوئی نہ کوئی پہنچ گیا۔ یہ ذلیل زندگی اور اس کا کفارہ جانے کب تک بھگتنا پڑے گا؟ کوئی نہیں ملتا جو مجھے سہارا دے کر گناہ کے اس تاریک ماحول سے باہر نکال لے ــــ!"

اس نے یہ سب باتیں کچھ اس انداز سے سِسک سِسک کر کہیں کہ میرا دل بھر آیا۔ اور میں تو اُسے بلاشرکت غیرے اپنا بنا لینے کے لئے بے تاب ہوگیا۔ میں نے اُسے پیار سے بھینچتے ہوئے اُس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "ہیرا کیا تم سچ کہتی ہو؟۔ کیا تم واقعی اس مصیبت کی دنیا سے نکلنے کے لئے تیار ہو؟"

"مجھ سے تو یہ سوال کرنا ایسا ہی ہے کلدیپ بابو جیسے اندھے سے کوئی پوچھے دو آنکھیں لوگے؟" اس نے ہچکی لیتے ہوئے کہا: "یوں تو ہزاروں روپے ماہوار کماتی ہوں اور عیش و عشرت سے کھیلتی ہوں لیکن اس گناہ کی کمائی سے جمع کی ہوئی دولت میری آنکھوں میں سانپ اور بچھو سے کم نہیں۔ مجھے تو آسانی سے کھانے پہننے اور ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی کہیں ٹھکانا ہوجاتا۔ تو میں اس سارے عیش و عشرت پر لات مار دیتی جس کے لئے مجھے اپنی آبرو اور عزت فروخت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن آہ ــــ ایسے میرے نصیب کہاں ــــ؟ سماج نے مجھ پر ذلت کی مُہر لگادی ہے۔ دنیا میرے بزرگوں کا پرائشچت مجھ سے چاہتی ہے ــــ!" اور وہ پھر رو پڑی۔

میں نے فوراً جیب سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "یہ لو آج سے تمہیں اپنی پاک مسکراہٹوں کو گناہوں میں آلودہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جلد ہی میں تمہیں

اس معصیت کی بستی سے بھی نکالنے کا انتظام کروں گا — ؟
"کلدیپ بابو —— !" کہکر اس نے اپنی تشکر آمیز آنکھیں میرے پیروں پر رکھدیں۔

اُس دن میں گھر واپس آیا۔ تو خوشی سے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اب محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے دنیا کی سب سے بڑی نیکی سے سورگ میں اپنے لئے جگہ خرید لی ہے۔ اور ساتھ ہی ہیرا جیسی شریف حسینہ کو اپنا لینے کے خیال سے میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ایک دو بار یہ خیال بھی آیا کہ پردیپ اس کے پاس جائے گا اور وہ یہ کہکر اس سے پردہ کرنے لگے گی کہ "نہیں پردیپ بابو اب میں نے اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہے۔ آج سے جسم کا سودا نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں" تو پردیپ کیا کہے گا ؟۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس بات سے تسکین بھی ہو جاتی کہ میں نے ہیرا کی زندگی بھی تو سنوار دی ہے۔ جو پردیپ نہیں کر سکا تھا۔

رہ رہ کر ایک خوشی کی لہر میرے سارے جسم میں دوڑ جاتی تھی ہر لحظہ یہ خیال مجھے گدگدا رہا تھا۔ کہ اب ہیرا کا سب کچھ میرے لئے اور صرف میرے لئے ہے۔

ان دنوں پربھات فلم کمپنی کا "پردیسی" موتی محل ٹاکیز میں قبولیت عام حاصل کر رہا تھا۔ شام کو میں نے سوچا۔ آج ہیرا کیساتھ چل کر یہ فلم دیکھوں گا۔ اب اُسے دوکان سجا کر بیٹھنا تھوڑا ہی ہے۔ جو عدیم الفرصتی کا حیلہ کریگی۔

لیکن اس کے گھر پہنچ کر میری ساری اُمنگوں پر اوس پڑ گئی چبوترے پر بیٹھی ہوئی ملازمہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا: "بی بی کہہ گئی ہیں کہ بابو آئیں تو کہہ دینا میں ایک جگہ نوید میں جا رہی ہوں۔ انتظار نہ کریں۔ شاید میں دیر سے لوٹوں —— !"

ایک مرتبہ تو میرا دل مرسا گیا۔ لیکن کرتا کیا ؟۔ آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل پڑا۔ پھر خیال ہوا تنہائی میں تو ہیرا کی یاد ستائے گی —— چل کر سینما ہی میں بیٹھ جاؤں۔ دو ڈھائی گھنٹے تو آسانی سے کٹ ہی جائیں گے۔ اور واپسی میں اس کے گھر کا چکر بھی اور لگا لوں گا —— ہو سکتا ہے اسے جلد ہی فرصت مل جائے۔ اور اس وقت تک وہ بھی واپس آجائے۔ مجبوری ہی سے تو گئی ہو گی۔ اس کا بھی جی وہاں لگتا تو ہو گا نہیں۔

میں ٹکٹ ہی خرید رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چونک کر دیکھا۔ پردیپ کہہ رہا تھا "خوب ملے یار۔ ایک ٹکٹ اور لے لو۔ بس دیکھنے کی چیز ہے"

ایک مرتبہ تو تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ چلو ساتھ مل گیا۔ اچھا ہی ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا کہ اب واپسی میں بھی پردیپ ساتھ رہے گا۔ پھر ہیرا کے گھر کیسے جا سکوں گا۔ بہرحال ٹکٹ لے کر ہال میں داخل ہوئے۔ کسی فلم کا ٹریلر چل رہا تھا۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ ٹٹول کر ہم دونوں بیٹھ ہی رہے تھے کہ بغل کی کرسی سے کسی کی سرگوشی سنائی دی: "اچھا — تو آج تم نے ایک اور بھولا شکار پھانس ہی لیا۔ ہو بڑی شاطر ؟"

اور ساتھ ہی ایک مترنم کھلکھلاہٹ گونج اٹھی۔ اتنے میں ٹریلر ختم ہو گیا۔ اور ہال اچانک ایک لمحے کے لئے روشنی سے جگمگا اٹھا۔ میری متجسس آنکھوں پر جیسے کسی نے انگارہ ڈال دیا۔ ہیرا ایک آدمی کے کندھے پر سر رکھے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی: "ہیرا چار پانچ سو روپئے والوں کو شکار نہیں سمجھتی۔ ایسے بیوقوفوں سے تو صرف تمہاری شراب اور سینما کا خرچ کبھی کبھی اینٹھ لیا کرتی ہوں —— !"

میں دونوں کے قہقہوں سے چونکا تو ہال میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور فلم چل رہی تھی۔ مجھے اس گندگی کے کیڑے کی موجودگی میں ہال میں بیٹھنا گناہ معلوم ہونے لگا۔ میں نے پردیپ کو ٹٹول کر اٹھانا چاہا۔ لیکن اس کی کرسی خالی تھی۔ میں تیزی سے اٹھ کر باہر نکلا۔ دیکھا پردیپ ایک کھمبے سے ٹیک لگائے گردن جھکائے کھویا ہوا کھڑا تھا۔ جونہی میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جیسے گہری نیند سے چونک کر میری طرف دیکھتا ہوا بولا: "اُف —— تم نے کچھ دیکھا۔ ؟ —— چڑیل مجھ سے عرصے سے ڈیڑھ سو روپئے ماہوار وصول کر رہی تھی اور کہتی تھی کہ تمہارے سوا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا حرام سمجھتی ہوں۔ اُف ری عورت —— !"

"عورت نہیں پردیپ —— عورت کا کلنک کہو —— !"
اس کے سوا میرے منہ سے اور کچھ نہ نکل سکا۔ میں پردیپ سے کچھ کہنے کے لائق تھا بھی کب ؟"

(مدھوکر کے ہندی افسانے سے)

یک کرم فرما کے نام

از:- جناب سحرؔ فتح پوری

مجھ سے یہ گلہ ہے کہ بداخلاق ہوں میں
کاش اُس دردِ نہانی کو سمجھ سکتے تم
جس کی شورش مجھے کر دیتی ہے اکثر بیتاب
میری نوخیز اُمنگیں ہیں صداقت آمیز!
میرے مشرب میں محبّت ہے محبّت کا جواب
ہیں بداخلاق؟ نہیں یہ کبھی ممکن ہی نہیں
آؤ سمجھا دوں تمہیں کشمکشِ قلبِ حزیں
یہ جہاں آہ جو ہے جلوہ گہِ مکر و فریب
ایک مرکز پہ نہیں جس کی کسی شے کو قرار
کیا تعجّب ہے کہ دونوں کو پریشاں کر دے
اس کی ناپاک طبیعت کے بنیں ہم بھی شکار
میں جو الطاف و عنایات سے گھبراتا ہوں
اک اسی تلخ حقیقت سے لرز جاتا ہوں
دامِ اُلفت میں اگر کر کے گرفتار مجھے
تم بچھڑ جاؤ گے اِک روز تو پھر کیا ہوگا؟
آج گو باعثِ جمعیّتِ خاطر ہو، مگر
مجھ کو تڑپاؤ گے اِک روز تو پھر کیا ہوگا؟
زندگی میری غمِ ہجر میں گھٹ جائے گی
پاسِ اخلاق میں دُنیا مری لُٹ جائے گی!

غزل

از:- جناب الطاف مشہدی ایڈیٹر ”ہم لوگ“

جہاں مستور وہ پردہ نشیں ہے
نظر والوں سے پوشیدہ نہیں ہے

تہِ گردوں کئی موسےٰ ہیں لیکن
حریمِ طُور میں جلوہ نہیں ہے

ہٹا لو آستاں راہوں سے میری
ابھی ناواقفِ سجدہ زمیں ہے

یہ سانسیں اور یہ سانسوں کے ٹکڑے
ابھی سب کچھ تھا اب کچھ بھی نہیں ہے

مری خاموشیاں عینِ تکلّم
تبسّم سے مرا گریہ حسیں ہے

بجُز غم کون ہے الطافؔ اپنا
میں سب کا ہوں مرا کوئی نہیں ہے

وہ کتابیں جو آپ کو ضرور پڑھنی چاہئیں!

بیگمات اودھ کے خطوط یہ رنگین رومانی خطوط کیا ہیں؟ تاریخ واجد علی شاہ کا ایک رنگین عکس، اودھ کے ایک حسین تاریخی دور کا حسین مرقع، شہنشاہی عیش پرستی اور عشق و محبت کی منہ بولتی تصویر، یہ خطوط لکھنؤ اور لندن کے عجائب خانوں میں قلمی نسخوں میں محدود تھے۔ اب ان کو بڑی جانفشانی سے یکجا کر کے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ہر لائبریری کیلئے یہ کتاب ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ دیدہ زیب جلد رنگین گرد پوش۔ قیمت صرف دو روپے۔

تصویریں جناب محمد امین شرقپوری کے تازہ افسانوں کا بہترین مجموعہ جو نئی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ ان افسانوں میں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کی اس عمدگی سے تصویر کھینچی گئی ہے کہ آپ ان افسانوں کو بار بار پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ جلد و گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت صرف دو روپے۔

زنجیریں جناب محمد امین شرقپوری کے ان افسانوں میں قہقہے بھی ہیں۔ اور آنسو بھی۔ اردو کے بلند پایہ رسائل نے "زنجیریں" افسانوں کی بہترین کتاب قرار دی ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکے ہیں۔ اب تیسرا ایڈیشن خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ جلد اور ڈسٹ کور سے مزین۔

قیمت صرف دو روپے

جھنکاریں جناب محمد امین شرقپوری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ۔ ان افسانوں میں ادبی لطافتیں بھی ہیں اور آرٹ کی نئی قدریں بھی۔ ہر افسانہ ایک گونجتی ہوئی جھنکار ہے۔ جس میں تلوار کی تڑپ، پازیب کی موسیقی اور زنجیر کی جگر پاش صدا ہے۔ جو آپ کے دل و دماغ میں گونجتی رہے گی۔ دوسرا ایڈیشن دلکش صورت میں شائع ہوا ہے۔ مجلد ڈسٹ کور سے مزین۔ قیمت صرف دو روپے۔

پتنگے جناب محمد امین شرقپوری کے سترہ افسانوں کا مجموعہ جس کا ہر افسانہ فن افسانہ نگاری کا بہترین شاہکار ہے۔ اردو کے چوٹی کے رسائل نے شاندار ریویو کئے ہیں۔ اب تک چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

مجھے تم سے محبت ہے جناب نقی نور کے افسانے اپنے انداز بیان میں کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی زبان، پاکیزہ جذبات، درد بھرے احساسات اور انقلاب انگیز موضوعات، دلگداز رومان اور پلاٹ کے اعتبار سے نادر و نایاب چیز ہیں۔ چوتھا ایڈیشن۔ قیمت ڈھائی روپے۔

جام و مینا بلند پایہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا بہترین انتخاب جس میں دور وسطیٰ کے تمام اہل قلم کے افسانے موجود ہیں "جام و مینا" میں حضرت خواجہ حسن نظامی، حضرت مولانا سالک، منشی پریم چند، حضرت جوش، حضرت ایم۔ اسلم، نذر سجاد حیدر صاحبہ، پنڈت سدرشن، جناب افسر میرٹھی اور دیگر بلند پایہ افسانہ نگاروں کے شاہکار درج ہیں۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ڈھائی روپے

چھالے یہ افسانے منسوب ہیں سوسائٹی کے ان معصوم اور گنہگاروں کے نام جنہوں نے بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر گناہ کئے۔ ان خطاکاروں کے نام جو بے گناہ ہیں۔ لیکن جنہیں بے گناہی کے باوجود سوسائٹی کے ظالمانہ قوانین نے سزا دی۔ ان بیواؤں کے نام جن کی دوسری شادیاں نہیں کی گئیں۔ اور انہوں نے فطری بھوک سے مجبور ہو کر گناہ کی زندگی گزاری۔ ان حوادث روزگار کے ہاتھوں ستائی ہوئی مظلوم دوشیزاؤں کے نام، جنہیں جبر و ظلم کے شکنجے نے اپنی عصمت قربان کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ خوشنما مجلد سرورق، سفید کاغذ، حسین کتابت، عمدہ چھپائی۔ ۲۵۶ صفحے۔

قیمت صرف تین روپے۔

ملنے کا پتہ :- رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

تندرست آنکھیں

آپ نہیں جانتے مگر جاننا چاہیئے

ایک مفید معلوماتی مقالہ

از

جناب ڈاکٹر آر ایس اگروال ایم بی بی ایس

تہذیب اور تمدّن کی ترقّی کے اِس زمانے میں آنکھوں کے امراض روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ جا بجا شفا خانے قائم ہیں۔ ماہرینِ امراضِ چشم کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے اور اُن کو ہر قسم کی سہولتیں میسّر ہیں۔ پھر بھی کوئی گھر ایسا نہیں جہاں آنکھوں کا کوئی مریض موجود نہ ہو۔ ہائی سکولوں اور کالجوں میں چشمہ لگانے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں جب اونچی جماعتوں میں پہنچتے جاتے ہیں تو انہیں چشمہ کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر یہ اندازہ کر لیا جائے تو بے جا نہیں کہ ہمارے خواص و عوام آنکھوں کی حفاظت کے علم سے بے بہرہ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ آنکھیں چیزوں کو دیکھنے کے لئے کس طرح استعمال کرنی چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ لوگ دیکھنا ہی نہیں جانتے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو آنکھوں کا صحیح "طریقہ استعمال" بتاؤں۔

پلک پلکیں دیکھنے میں ایک بڑا حصّہ لیتی ہیں۔ عام طور پر اوپر کی پلکیں ہمیشہ کچھ جھکی ہوئی اور آنکھیں آدھی کھلی ہوئی رکھنی چاہئیں۔ اوپر یا سامنے کی طرف دیکھتے وقت پلکیں اوپر نہیں اٹھانی چاہئیں۔ بلکہ ٹھوڑی کو اونچا کرنا چاہیئے۔

پلک جھپکانا کسی لفظ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھئے۔ لفظ کی سیاہی پھیکی پڑنے لگے گی۔ اب ذرا پلک مارئیے اور دیکھئے، پہلے کی طرح صاف دکھائی دینے لگا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ پلک مارنا ایک قدرتی فعل ہے، اور اس کی وجہ سے ہماری آنکھوں کی حفاظت ہوتی ہے اور ہم اپنی آنکھوں کو غیر معمولی دباؤ سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو پلک مارنا بھی ایک آرٹ ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اس آرٹ سے واقف نہ ہوں۔ اس لئے ذرا ایک ننھے بچّے کو دیکھئے کہ وہ کس طرح آنکھیں کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یہ بچہ آپ کو پلک مارنے کا قدرتی طریقہ سکھا سکتا ہے۔ پلک مارنے میں اوپر کی پلکوں کو اتنا نیچے گرانا چاہیئے کہ پلکیں آنکھ کی پتلی کو ڈھک لیں۔ اس کے بعد پھر پلک اٹھائیں۔ ایک منٹ میں کم سے کم دو بار پلکیں جھپکانی چاہئیں۔

پڑھنا پڑھتے وقت کتاب ٹھوڑی سے نیچے رکھئے۔ تاکہ پڑھتے وقت پلک کو اونچا نہ اٹھانا پڑے، اور ایک سطر پڑھنے میں دو بار ضرور پلک مارنا چاہیئے۔ لیٹے ہوئے بھی بڑی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے، لیکن سر کو اونچا رکھنا اور بار بار پلک مارنا ضروری اور لازمی ہے۔ پڑھتے وقت پلک نہ مارنا ایک بڑی بھاری غلطی ہے۔ جس کی احتیاط ضروری ہے۔ بہت باریک حروف روزانہ پڑھنے سے بینائی چشم بڑھتی ہے۔

لکھنا لکھتے وقت نظر ہمیشہ قلم کی نوک پر رکھنی چاہیئے اور قلم کی نوک کے ساتھ ساتھ نظر کو چلانا چاہیئے اور ساتھ ہی ساتھ پلک مارتے رہنا چاہیئے۔ لکھتے وقت زیادہ تر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ پچھلے لفظوں کو بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ اس سے بچئے۔

سینا بہت سی عورتوں کو تھوڑی دیر تک سینے پرونے کا کام کرنے سے آنکھوں پر اتنا زور پڑتا ہے کہ اُن کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پلک بہت دیر میں مارتی ہیں اور اپنے کام کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہتی ہیں۔ انہیں جلدی جلدی پلک مارتے رہنا اور سوئی کی رفتار کے ساتھ ہی ساتھ نظر کو گھماتے رہنا چاہیئے۔ جب سوئی اوپر جائے تو نظر بھی اوپر جانی چاہیئے، اور جب سوئی کپڑے کے نیچے جائے تو نظر بھی نیچی ہونی چاہیئے۔ اس طرح سوئی کے ساتھ ساتھ نظر کو گھمانے سے آنکھوں پر زور نہیں پڑے گا اور کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

سینما بینی عام طور پر سینما آنکھوں کے لئے نہایت نقصان دہ سمجھا جاتا ہے اور در اصل سینما نے بہت سی آنکھوں کو کافی نقصان بھی پہنچایا ہے اور اس سے نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن سینما کو نظر کی تیزی کا ذریعہ بھی بنایا جا سکتا ہے سینما دیکھنے سے نقصان پہنچنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ انہیں آنکھوں پر زور ڈال کر اور غلط طریقہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر اس غلط عادت کو ترک کر دیا جائے تو نظر ہمیشہ بڑھے گی اور اگر اسی طرح سینما دیکھنے کی عادت زیادہ دنوں تک جاری رکھی جائے تو بہت سی آنکھوں کی خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں۔

نہایت آرام کے ساتھ سیدھے بغیر جھکے ہوئے بیٹھئے اور اُوپر کی پلک کو کچھ جھکا ہوا اور تھوڑی اُوپر کو اُٹھی رکھئے اور پلک بار بار بھی جھپکاتے رہنا چاہیئے۔ سینما دیکھنے میں جو عام طور پر غلطی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اُوپر کی پلک کو اونچا اٹھائے رکھتے ہیں اور پلک نہیں جھپکاتے۔ اِن مختصر ہدایات کے بعد اب ہم آپ کو آنکھوں کی حفاظت اور بینائی کی کمزوری دُور کرنے کے چند قدرتی طریقے بتاتے ہیں۔

سورج کا علاج آنکھوں کے متعدد امراض کو دُور کرنے میں سُورج بہت مدد کرتا ہے۔

آنکھیں بند کر کے آرام کے ساتھ سُورج کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ جائیے۔ آہستہ آہستہ بدن کو ایک طرف سے دوسری طرف ہلاتے رہو۔ اس طرح دس منٹ سے تیس منٹ تک کرتے رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے صبح و شام کا وقت اچھّا ہے۔ کیونکہ اُس وقت سُورج کی کرنوں میں تیزی نہیں ہوتی۔ جب دھوپ کی تیزی سے تکلیف معلوم ہو، تو اس علاج کو فوراً بند کر دیجیئے۔ اس کے بعد دھوپ سے اٹھ کر سائے میں آجانا چاہیئے۔ اور ٹھنڈے پانی سے آنکھیں دھو ڈالنی چاہئیں۔

دن میں ایک بار آنکھوں کا دھونا بہت ہی فائدہ مند ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آنکھوں میں آہستہ آہستہ ٹھنڈا پانی ڈالنا چاہیئے۔ (پانی زور سے نہیں ڈالنا چاہیئے) یا آئی گلاس کو، جو دوا بیچنے والوں کے یہاں پانچ چھ آنے میں دستیاب ہوتا ہے، پانی سے بھر لیں اور آنکھوں کے پاس لے جا کر اور آنکھوں کو نیچے جھکا کر اُس پانی میں بار بار کھولیں اور بند کریں۔ اِس طرح ایک ایک آنکھ کو دو منٹ تک دھونا چاہیئے۔

پامنگ ہر ایک انسان کو اس بات کا تجربہ ہوگا کہ آنکھیں تھک جانے پر تھوڑی دیر کے لئے بند کر دینے سے نظر صاف ہو جاتی ہے اور آنکھوں کو آرام ملتا ہے، لیکن آنکھیں بند کر لینے پر بھی پلکوں سے روشنی چھن کر آنکھوں میں جاتی ہے۔ اُس کو اندر نہ جانے دیا جائے تو آنکھوں کو اور بھی زیادہ آرام ملتا ہے۔ یہ عمل بند آنکھوں کو ہتھیلی سے ڈھک لینے سے ہو سکتا ہے لیکن ہتھیلی کو آنکھ پر اس طرح رکھنا چاہیئے کہ آنکھ کے ڈھیلے پر ذرہ بھی دباؤ نہ پڑے۔ اس عمل کو پامنگ کہتے ہیں۔

بند آنکھوں کو ہتھیلی سے ڈھک کر کسی بالکل سیاہ چیز یا کسی پسندیدہ چیز مثلاً پھول یا ندی میں تیرتی ہوئی کشتی یا ہوا میں تیرنے والے کالے بادل وغیرہ کا دھیان کرنا چاہیئے اور دماغ میں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ چیز ہمارے سامنے ہے بعض لوگ اُس وقت کسی خاص پیاری چیز کا دھیان کرنا پسند کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر چاقو کا، لڑکے کھلونے کا اور ماں بچّے کا۔

پامنگ دو منٹ سے پانچ منٹ یا اس سے زیادہ دیر تک کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی دُور کی نظر کمزور ہے تو پامنگ کرنے کے بعد سنیلین ٹیسٹ چارٹ بارہ فٹ کی دُوری پر رکھ کر پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیئے اور اگر نزدیک کی نظر کمزور ہے، یعنی پاس کی چیزیں پڑھنے یا دیکھنے میں دقّت ہوتی ہے تو ریڈنگ ٹیسٹ ٹائپ کو پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ اس طریقہ سے نوّے فی صدی مریضوں کو پہلی ہی بار میں فائدہ ہو جاتا ہے۔ مستقل فائدے کے لئے کچھ مدت اسے لگاتار کرنا چاہیئے۔

کیف و نشاط

از

جناب پنڈت دیا کرشن گردش

نواب ممدوٹ اور شری پرتھوی سنگھ آزاد تو کیف و نشاط کے دشمن ہیں - ایک نے مغربی اور دوسرے نے مشرقی پنجاب میں تمام کیف خانوں اور نشاط کدوں کو مقفل کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور

مے سے غرضِ نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

کے معتقد اب شاید محلِ دل ہی سے کی مسندِ زنگین پر لکھنؤ کے نوابوں کی لاڈلی چینا بیگم کو لا بٹھائیں - لیکن جناب خوشتر نے "بیسویں صدی" میں کیف و نشاط کی جو بزم آراستہ کر رکھی ہے - اُس میں ممدوٹ کی "آبکاری گسٹاپو" اور پرتھوی سنگھ آزاد کے "امتناعی" ناصحوں کا گذر نہیں۔ حاجی لق لق اس بزم میں ساقی گری کرتے رہے۔ "زاہد تنگ نظر" نے لق لق کے لئے لاہور کو چڑیا گھر بنا ڈالا - بیچارہ اب کھلی اڈانوں کے لئے بیتاب بار بار حسرت بھری نظریں سوئے فلک اٹھاتا اور رہ رہ کر کلکتا ہے اور جب اسے اپنے قفس کی تیلیاں پروں اور پنجوں کی قوت پر غالب دکھائی دیتی ہیں - تو کھسیانا ہو کر اپنی منقار مولانا ظفر علی خان کی ٹیبل کے پیپر ویٹ پر گھسنے لگتا ہے -

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دُنیائے ادب میں دختِ رز نامعلوم کب سے ذریعۂ نشاط چلی آرہی ہے - علامہ کیفی ادبی دُنیا کے جغرافیہ میں مملکت سرشار پر انگلی رکھ دیں گے - سرشار مرحوم شاید دورِ خیّام کی طرف اشارہ فرماتے لیکن بسا اوقات آزاد کے "قریب المرگ" اور ممدوٹ کے مرحوم میکدوں سے باہر کی حسین و جمیل واردائیں بھی بحرِ نشاط میں کشتی سے کا نعم البدل بن جاتی ہیں - چند سال ہوئے - سوئیٹزرلینڈ کا ایک سائنسدان کایا کلپ کا گُر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ارشاد ہوا - عورت کا دودھ بڈھوں کو جوان بنا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے - جناب سالک نے نسخہ پڑھا تو حیرت سے مہا بھارت کے سرورق کا "شری گنیش آئینہ" بن گئے۔ آپ نے "انقلاب" کی وساطت سے اہلِ مغرب کو پیغام دیا کہ "اب گئو شالائیں بند کر کے" استری شالائیں" کھولئے - جہاں پانچ سے پندرہ سیر تک دودھ دینے والی عورتیں بندھی ہوں۔ "دار الشفا" لاہور کے مہتمم کو مار اللحم کی بوتلوں اور اُس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا" کو اپنی برقی کو بیوں اور برفپوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر رنگ دھڑنگ گھومنے والے سنیاسیوں کے عطیوں کی فکر دامنگیر ہو اٹھی - لیکن جنابِ مبارک مسرور ہو اُٹھے کہنے لگے - کمپنی بہادر کی آمد سے ہندوستان میں بہادر شاہ، ٹیپو اور سراج الدولہ کی حکومتوں کے قدم اُکھڑ گئے تھے اور اب اس "سفید پری" کی آمد پر ہمیں ہندوستان کی "تاک زادی" کو طلاق دینا پڑے گی۔ میں نے دیکھا، اس "زنِ افرنج" کے تصوّر ہی سے مبارک میاں کے چہرے کی آدھی جُھریاں دُور ہو گئی تھیں -

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

للّہ رام لال مہاجن مرحوم (خدا اُن کی رُوح کو جوارِ رحمت میں جگہ دے) ہمیشہ عالمِ صحافت کی بے کیفیوں میں کیف و نشاط کی تلاش رہی - جنوری کی ایک سہانی صبح کو ناگہانی زکام کی مانند گندمی رنگ کا بالشت بھر لمبا مہاجن ٹیاؤں ٹیاؤں کی سفف بوس صداؤں کے درمیان اُن کے گھر وارد ہوا - آپ مست و بے خود ہو اُٹھے - دفتر میں دوستوں نے ضیافت طلب کی - ایک دوست نے ساغر و مینا" کو "آنکھوں میں تو دم ہے" کے مرحلہ تک سامنے رکھنے کا تقاضا کیا۔ آپ نے کہا - ننھے مہاجن کی ٹیاؤں ٹیاؤں سا کیف "ناؤس آف لارڈز" اور "وہائٹ ہاؤس" میں کہاں ہے کوشک جالندھری کے کانوں خدا جانے کہاں سے بھنک پڑ گئی - دوسرے ہی دن سے لیٹ دفتر آنے لگے - استفسار پر فرمایا کمبخت مہاجن پر رشک آتا ہے - شب بیداری کی ہفتوں لمبی مشق کے باوجود مجھے ننھے کوشک کی آواز سنائی نہیں

دی۔ سوچا تھا۔ دو روپیہ روز بچت ہو جائے گی اور ٹمری برپوری کے "تلخابہ" سے دوامی نجات لیکن قدرت بھی تو سود خوار مہاجنوں پر مہربان ہے۔ بیچارے مسلمانوں سے اسے کد ہے۔ مولانا وکالت پاس کرچکے تھے۔ کوشک کی بیچارگی پر خاکسارانہ انداز میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یہ سند پیش کردی ع

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اور ساری مجلس بے اختیار جھوم اٹھی۔

* * * * * * * * *

سارسوں کے حسین جوڑے کی طرح کلو اور لداخ کے درمیان کی برفپوش پہاڑیوں سے رحمت اور راجو اپنے تنہا چٹانی آشیانے سے نیچے اُترے اور مہاجرین کے ایک قافلے کے ساتھ لاہور آ پہنچے۔ میاں بیوی نے مال روڈ کی ایک عالیشان کوٹھی میں قیام کیا۔ راجو اور رحمت دونوں نے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ دوسری منزل کے ایک کمرے میں میز پر آئینہ پڑا تھا۔ رحمت نے سوچا "یہ تو میرے والد مرحوم کی تصویر ہے"۔ دس سال پہلے اُن کا ایسا ہی چہرہ تھا مونچھیں، داڑھی کی تراشش، لباس سب کچھ ایسا ہی۔ اس کمرے میں یہ تصویر کیسے آ پہنچی؟ رحمت نے آئینہ چھپا کر الماری میں رکھ دیا۔ وہ صبح و شام دونوں وقت دبے پاؤں کمرے میں آتا۔ دوزانو ہو کر اپنے "والد" کی تصویر دیکھتا اور چلا جاتا۔ روز روز کی آمد و رفت سے راجو کے دل میں سنبہات کا .... طوفان اٹھا۔ ایک دن اُس نے رحمت کی غیر حاضری میں آئینہ تلاش کر لیا۔ "سمجھ گئی"۔ راجو نے اپنے دل میں کہا۔ "کسی دوسری عورت کی تصویر اس نے یہاں لا رکھی ہے۔ عشق ہو گیا ہے اسے"۔ اور جب وہ نیچے پہنچی، جرمنی اور برطانیہ کے درمیان چھڑ گئی۔ دُور مار توپوں سے لے کر دی۔ ہم تک تمام اسلحہ استعمال ہوا۔ لاہول کا ملّا جمالؔ شورش کر ساتھ کی کوٹھی سے جھگڑا چکانے آ پہنچا۔ "خدا غارت کرے۔ اس حالت کو پہنچ کر بھی تم جدل سے باز نہیں رہ سکتے"۔ جمالؔ نے ڈپٹ کر کہا۔

"بوڑھا ہونے کو آیا ہے۔ مگر عشق سر پہ اب بھی سوار ہے۔ اوپر کے کمرے میں ایک ڈائن کی تصویر اس نے چھپا رکھی ہے اور تنہائی میں اُس کے بوسے لیتا ہے"۔ راجو تیز ہو کر بولی۔

"عورت کی نہیں میرے والد غفار کی تصویر ہے۔ دیکھ لیجئے آپ"۔ رحمت نے کہا اور دو منٹ میں اُس نے آئینہ لا کر ملّا جمالؔ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تم دونوں غلطی پر ہو۔ یہ عورت کی تصویر نہیں۔ یہ تمہارے باپ کی تصویر بھی نہیں۔ یہ تو کسی مسجد کے امام کی تصویر ہے۔ اسے میرے پاس رہنے دو"۔ ملّا نے دو جملوں میں جھگڑا چکا دیا۔

کالج کے تین چار لڑکے شورش کر وہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ لکھنا بے سود ہے کہ ملّا کا فتویٰ سن کر وہ اپنی ہنسی کس حد تک ضبط کر سکے ہوں گے۔

* * * * * * * * *

سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر راجہ محمد افضل خان رندی میں نہ پرہیزگار زیبد اور بلانوشی کے درمیان اگر خطِ مستقیم کھینچ دیا جائے تو کہا جا سکے گا کہ آپ کا ذوقِ سلیم اس خط کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ آپ عدالت میں تشریف فرما تھے۔ ایک مہاجر کمہار فریاد لے کر حاضر ہوا اور رونی صورت بنا کر درخواست ٹیبل پر رکھ دی۔

ڈپٹی کمشنر نے کاغذ اٹھایا۔ مضمون کا عنوان تھا "ظلم، ظلم، ظلم"۔ راجہ صاحب نے مظلوم کے چہرے کی طرف دیکھا "خدا نے تین سو سال کے بعد مسلمانانِ ہند کو آزادی اور وطن سے سرفراز کیا۔ مگر وہ اب بھی اپنے ظلم رسیدہ بھائیوں پر جور و تعدی سے باز نہیں آتے"۔ راجہ صاحب نے سوچا۔ مہاجر کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ ظلم کا سہ حرفہ تین بار لکھا گیا تھا۔ جیسے یک آتشہ مطمئن کر سکتی ہو، اُسے سہ آتشہ سے مطلب؟

مہاجر کے فرمایا دِ مجسم چہرے سے نگاہ ہٹا کر آپ نے درخواست پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا "شعبۂ بحالیات کے کارکنوں کو مجھ غریب مہاجر سے عداوت ہے جس مکان میں انہوں نے مجھے ٹھہرایا ہے۔ وہاں سفید و سیاہ مرمر کے پتھر لگے ہیں۔ اس چکنے فرش پر میرے گدھوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ کل ایک گدھا اپنی بیوی سے آنکھ مچولی کھیلتے گر پڑا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ خدارا مجھے شعبۂ بحالیات کے اس ظلم سے بچایا جائے"۔

راجہ صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے زندگی میں پہلی بار بن پیئے انہوں نے مقام رندی کو چھو لیا ہو۔ وہ بے اختیار ہنس پڑے۔ مہاجر نے کہا "مجھ پر ظلم ہوا اور جناب ہنستے ہیں"۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ سوچ رہا ہوں۔ افسر بحالیات کو دار پر کھینچوں یا پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت تیرے مکان کی چار دیواری کے اندر گدھوں کی بے موسمی آنکھ مچولی کو خلاف قانون قرار دے ڈالوں"۔

اُن کی آواز میں مے کی شوخی لہرا رہی تھی ٭٭

۴۴

۴۴ نواب ممدوٹ اور جناب آزاد نے میکدوں پر تو قفل لگا دیئے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ کیف و نشاط کی دوسری راہوں کو بند نہیں کر سکیں گے [illegible]

عظیم الشان اردو کتابوں کا بہترین ذخیرہ

اپنے ذوق کی کتابیں منتخب فرمائیے

دورِ حاضر کے بہترین ناول

کتاب	مصنف	قیمت
عذرا	صالحہ عابد حسین	۴-۸-۰۰
غبن	منشی پریم چند	۵-۰-۰۰
بیوہ	〃	۲-۸-۰۰
واردات	〃	۲-۴-۰۰
نشانِ راہ	رشید اختر ندوی	۳-۸-۰۰
کانٹوں کی سیج	〃	۳-۸-۰۰
تلخیاں	〃	۳-۸-۰۰
نسرین	〃	۴-۰-۰۰
تشنگی	〃	۳-۸-۰۰
زہر ملا آبِ حیات	سدرشن	۲-۰-۰۰
یوسف نجمہ	عبد الحلیم شرر	۲-۸-۰۰
اسرار دربار حرام پور	〃	۱-۸-۰۰
غائب دان دلہن	〃	۱-۱۲-۰۰
مینا بازار	〃	۱-۱۲-۰۰
لو ایک قصہ سنو	بشیر محمد اختر	۱-۴-۰۰
سلسلے	اشرف صبوحی	۲-۰-۰۰
بن باسی دیوی	〃	۳-۰-۰۰
گودی دتا صر	خان محبوب طرزی	۲-۰-۰۰
شہزادی شب نور	〃	۱-۸-۰۰
نرگس	ایم اسلم	۲-۸-۰۰
نکہت	قیسی رامپوری	۲-۸-۰۰
شکست	کرشن چندر	۳-۰-۰۰
جہاں آرا	ظفر قریشی	۲-۸-۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
گردش	مجنوں گورکھپوری	۱-۸-۰۰

افسانوں کے لاجواب مجموعے

کتاب	مصنف	قیمت
خواب و خیال	منشی پریم چند	۲-۸-۰۰
ایک گرجا ایک خندق	کرشن چندر	۳-۸-۰۰
رام چرچا	پریم چند	۲-۸-۰۰
رقاصہ	ایم۔ اسلم	۱-۸-۰۰
آوارہ	خلیل جبران	۱-۸-۰۰
تازیانے	الطاف مشہدی	۲-۴-۰۰
لیلیٰ کی کُتیا	خان محبوب طرزی	۲-۰-۰۰
جام و مینا	حکیم یوسف حسن	۲-۸-۰۰
جھروکے	اشرف صبوحی	۲-۸-۰۰
ویرانے	احتشام حسن	۲-۸-۰۰
سُرخ مکان	مسعود	۳-۰-۰۰
آوارہ گرد کے خطوط	ش منظر پوری	۲-۸-۰۰
راز کی باتیں	سید ذو الفقار علی	۲-۸-۰۰
بے پر کی	آوارہ	۲-۱۲-۰۰
منجدھار	ناظم سیتاپوری	۲-۸-۰۰
نئی کروٹ	شہزادہ ایاز	۱-۸-۰۰
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	۱-۱۲-۰۰
اور بنسری بجتی رہی	دیویندر ستیارتھی	۳-۰-۰۰
بھابی جان	فضل حق قریشی	۲-۸-۰۰
چوٹیں	عصمت چغتائی	۲-۸-۰۰
میٹھی کہانیاں	پریم پجاری	۳-۰-۰۰
کربلا (ڈرامہ)	منشی پریم چند	۲-۸-۰۰

طنز و مزاح

کتاب	مصنف	قیمت
ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۱-۸-۰۰
نورتن	شوکت تھانوی	۲-۸-۰۰
وغیرہ وغیرہ	〃	۳-۰-۰۰
دنیائے تبسم	〃	۲-۸-۰۰
لاہوریات	〃	۱-۱۲-۰۰
مونڈی کاٹے	〃	۱-۸-۰۰
شیخ جی	کوثر چاندپوری	۱-۱۲-۰۰
کیلے کا چھلکا	سندباد جہازی	۲-۰-۰۰
خان صاحب	ظریف لکھنوی	۱-۸-۰۰

ادبی، علمی، اصلاحی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
بات چیت	صالحہ عابد حسین	۱-۱۲-۰۰
گنجہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	۳-۰-۰۰
تہذیب کے تازیانے	سدرشن	۱-۱۲-۰۰
مقالات	اسلم جیراجپوری	۲-۸-۰۰
بیوی محبت کیوں کرے؟	مس صابرہ	۲-۸-۰۰
مجاہدِ مراکش	عبد الوہاب	۳-۸-۰۰
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	۳-۸-۰۰
گورکی کے افسانے	گورکی	۱-۴-۰۰

سیاسی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ہندوستان کا مستقبل	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۳-۸-۰۰
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں	جواہر لال نہرو	۳-۸-۰۰
ہندوستان کا اتحاد	جواہر لال نہرو	۳-۸-۰۰
پیتھک لارنس سے	دیویندر ناتھ	۳-۰-۰۰

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی

مشرقی مغربی کشیدہ کاری رسالہ سے دوگنا سائز امریکن طرز کی خوبصورت جلد، ڈیڑھ سو سے زائد بہترین کشیدہ کاری کے ڈیزائن تکیہ کے اشعار، چادروں کے کونے، گریبان، بیلیں، ہر قسم کے انگریزی بیل بوٹے اور خوشنما پھول، میز پوش، فلاور باسکٹ کے حسین ترین ڈیزائنوں سے مزین ہے۔ کشیدہ کاری کی بہترین کتاب ہے۔ بچیوں کے جہیز میں ضرور دیجئے۔ اس کتاب کی ڈرائنگ دہلی کے ایک ایسے نامور آرٹسٹ نے کی ہے جو فن کشیدہ کاری کے بہترین ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مختصر سے عرصے میں تین ایڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اب چوتھا ایڈیشن اردو ہندی مشترکہ دونوں زبانوں میں رسالہ "بیسویں صدی" کے دوگنے سائز پر شائع کیا گیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

رضیہ کراس اسٹچ کراس اسٹچ ورک کے لئے ایک بے حد خوشنما کتاب۔ اکثر مشرقی بہنوں کو کراس اسٹچ کے کام سے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ کراس اسٹچ کا فن کشیدہ کاری کے سلسلے میں ایک مرغوب فن ہے اور سلیقہ مند خواتین کراس اسٹچ سے بہت شوق رکھتی ہیں۔ محترمہ رضیہ سلطانہ صاحبہ نے کراس اسٹچ کی ایک ایسی مفید کتاب تیار کی ہے، جسے دیکھ کر آپ پھڑک اٹھیں گی۔ ایسی ایسی بیلیں، دامن، کونے اور مرکز آپ کو اس کتاب میں ملیں گے کہ آپ دیکھ کر محو حیرت ہو جائیں گی۔ مشرقی مغربی کشیدہ کاری کی طرح یہ مفید کتاب بھی رسالہ سے دوگنے سائز پر شائع ہوئی ہے مضبوط، خوبصورت جلد، قیمت صرف چار روپے

رضیہ ماڈرن فیشن بک فیشن کی وبا سب سے پہلے لندن، پیرس، امریکہ کی خواتین میں نمودار ہوئی۔ اس کے بعد پنجاب کی خواتین نے اسے اختیار کیا اور ہوتے ہوتے یہ فیشن تمام ہندوستان میں پہنچ گیا۔ چنانچہ مشرقی بہنوں نے فیشن ایبل کپڑے تیار کرنے پر لاکھوں روپیہ برباد کر دیا۔ محترمہ رضیہ سلطانہ صاحبہ چمن دہلوی نے فیشن ایبل کپڑے تیار کرنے کے لئے یہ کتاب تیار کی ہے۔ اس میں ڈھائی سو قسم کے فیشن ایبل کپڑے تیار کرنے کی ترکیبیں مع نقشہ جات درج کی ہیں، اور ہر لباس میں خواتین اور بچوں کی قلمی تصویریں اس لباس کے ساتھ بنا دی گئی ہیں۔ تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ فیشن ایبل خواتین اس کتاب کو بے حد پسند کریں گی۔ نمونہ کے مطابق فیشن ایبل کپڑے گھر ہی پر تیار ہو سکتے ہیں۔ بڑا سائز، خوبصورت اور مضبوط جلد، قیمت صرف چار روپے

رضیہ کا شاہی دسترخوان جب دہلی میں غدر پڑا اور دہلی کے باکمال کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بسینہ اہل کمال لوگوں میں چلے آرہے تھے، غدر کے فاقوں سے تنگ آکر ان اہل کمال لوگوں نے اپنے صدیوں کے رازوں کو کوڑیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ "رضیہ کا شاہی دسترخوان" بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جو مغل بادشاہوں کے شاہی باورچی ... سے حاصل کی گئی تھی۔

قیمت صرف ۳½ روپے۔

اقبال کا نظریہ پاکستان	اقبال	۰-۶-۰
نظر بند	چھبیلداس	۱-۸-۰
چنگاریاں	″	۱-۸-۰
سبھاش بابو کے ساتھی	امداد صابری	۳-۰-۰
لال قلعہ کا تاریخی مقدمہ	″	۳-۴-۰
دہلی چلو	شورش کاشمیری	۳-۰-۰
آزاد ہند فوج کا البم	امداد صابری	۳-۰-۰
جواہر لال کی کہانی	محمد رحیم دہلوی	۵-۸-۰

مذہبی کتابیں

مسلمانوں کا روشن مستقبل	طفیل احمد	۶-۸-۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	مولانا اشرف علی تھانوی	۴-۸-۰
اسلام کیسے شروع ہوا	عبدالواحد سندھی	۲-۴-۰
اسلام کیسے پھیلا؟	″	۱-۱۲-۰
دوزخ کا کھٹکا	مولانا احمد سعید	۲-۴-۰

نظم، غزل، گیت

نئی دنیا کو سلام	سردار جعفری	۳-۰-۰
سنبل و سلاسل	جوش ملیح آبادی	۴-۸-۰
شعلہ و شبنم	″	۵-۰-۰
نقش و نگار	″	۳-۸-۰

ملنے کا پتہ:- رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

جناب خوشتر گرامی پرنٹر و پبلشر نے الامان پریس ترکمان گیٹ دہلی سے چھپوا کر دفتر رسالہ بیسویں صدی چرخے والان دہلی سے شائع کیا۔

فروری

فروری سنہ ۱۹۴۹ء

سالانہ قیمت
خاص نمبر سمیت
پانچ روپے

ششماہی قیمت
تین روپے

ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں جن کی قیمت ڈیڑھ روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

پتہ:۔ رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

سالنامہ بیسویں صدی

دوسروں کی نظر میں

جناب پنڈت ہری چند اختر ایم۔اے:۔

آپ کے ذوقِ نظر اور حسنِ انتخاب نے سالنامہ کی صورت میں ایسا دیدہ زیب و معنیٰ نواز مرقع پیش کیا ہے کہ بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔

جناب یزدانی جالندھری:۔

یوں تو آپ کا حسنِ ذوق ہمیشہ نئے نئے پھول کھلانے کا عادی ہے لیکن موجودہ حالات میں کہ آپ اپنا سب کچھ لاہور میں گراں جذبات کے سیلِ خون افروز کی نذر کر آئے ہیں، ایسا نظر نواز سالنامہ شائع کرنا آپ ہی کا کام ہے جس کا حسنِ ظاہر و باطن کرشمہ دامن دل می کشد کے مصداق دل و نگاہ کے لئے سامانِ دلکشی ہے۔

جناب مہر لال سونی ضیا ایم۔اے:۔

خاص پرچے ترتیب دینے کا آپ کو ایک خاص سلیقہ آتا ہے اور اُس معیار پر یہ نمبر صحیح اترتا ہے۔ نظمیں اور افسانے سب بہت خوب ہیں۔ واقعی یہ پہلا سالنامہ ہے جس میں مجھے اشتہارات کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ دعا گو ہوں کہ پڑھنے والے اسے اسی طرح پسند کریں جس طرح آپ نے اسے شائع کیا ہے۔۔۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

جناب سلام مچھلی شہری:۔

اگر میں سینرز کے جملے کو اپنانا چاہوں تو یہ کہوں گا کہ "سالنامہ آیا، ذہنی دنیا میں ہلچل مچ گئی اور پھر تمہارے رسالے نے ادبی دنیا کو فتح کر لیا"۔ بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ اس سالنامے کی ہر چیز پر الگ الگ لکھوں مگر ۔۔۔ ری میری ذہنی الجھنیں! پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ایسے میں جبکہ دنیا نئی ہے، ہندوستان نیا ہے اور مادرِ وطن کا ذہنی شعور نیا ہے "بیسویں صدی" کا یہ سندر روپ بھی ہر اعتبار نیا اور دلکش ہے ——— دلکش ہی نہیں پُرعظمت اور با وقار بھی۔

جناب آسی رام نگری:۔

سالنامہ نظر نواز ہوا۔ ظاہری سج دھج، مندرجات کے معیار و تنوع اور دلکشی و دلآویزی کے اعتبار سے آپ کی یہ دلکش و دلآویز پیشکش بیش از بیش تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔ مندرجات میں معیار کی بلندی اور دلکشی کا ایسا امتزاج بہت کم جگہ ملتا ہے۔ اس ضخیم شمارہ خاص کا ہر صفحہ آپ کے نکھرے ستھرے مذاق کا آئینہ دار ہے۔۔۔۔۔

جناب بشیر ملاہوی:۔

سالنامہ جلوہ بار ہوا علم و ادب، شعر و سخن کے اس سحر آفریں مجموعے کو دیکھ کر آنکھیں فرطِ حیرت و مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور ——— اس دامانِ باغبان و کفِ گل فروش سالنامہ کی نکہت بیزیوں سے دماغ و دل معطر ہو گیا ——— حیران ہوں کہ کن کن اصناف کی مدح سرائی کروں۔ اگر سرورق آپ کی جدتِ طبع کا شاہکار ہے تو دوسری طرف سے افسانوں، غزلوں اور نظموں کا بلند معیار آپ کے ذوق اور "بیسویں صدی" کے شاندار مستقبل کا آئینہ دار ہے۔۔۔۔

جناب رام لال:۔

جب سے آپ دہلی آئے ہیں۔ ہر ماہ "بیسویں صدی" کا ایک نیا ہی رنگ دیکھا ہے۔ بالکل نیا -- اور آج نئے سال کا سالنامہ ایک جدا ہی رنگ میں دیکھا ہے۔ اس رنگ نے کن کن نگاہوں کو خیرہ نہ کیا ہوگا! لکھنے والوں کی صف میں وہی لوگ ہیں جنہیں سب جانتے ہیں، سب چاہتے ہیں۔ چند قیمتی اضافے اس کی شان کو دوبالا کئے ہوئے ہیں۔ تصاویر کا ہجوم اور "کچھ اپنے بارے میں" کی باتیں افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔۔۔۔

جناب فراعلی خنجر لکھنوی:۔

سالنامہ بصیرت نواز ہوا۔ بہت خوب اور روایاتِ سابقہ کا حامل ہی نہیں بلکہ کافی بڑھ چڑھ کر حسنِ ظاہر دیدہ زیب اور محاسنِ باطنی روح نواز۔ خدا مبارک کرے۔۔۔۔

جناب ام۔ امام

سالنامہ توقعات سے بڑھ چڑھ کر نکلا۔ مضامین کی رنگا رنگی

اور تنوّع دیکھ کر کون ہے جو آپ کے ذوقِ انتخاب کی داد نہ [illegible] اور پھر جب ایک ہی پرچے میں پروفیسر کنہیا لال کپور، شؔن مظفر پوری، سلام مچھلی شہری، محمد یونس احمر، قمر ہاشمی، سالک الہاشمی، یزدانی [illegible] اور سرشار صدیقی جیسے ادبا اور شعرا کا اجتماع ہو، تو پھر اُس کے معیار کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے "بیسویں صدی" [illegible] ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

جناب دت بھارتی :۔

سالنامہ خوب ہے۔ اگر تعریف کی ضرورت ہے تو میں کہوں گا ع

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی

جناب قیصر جمالی بی۔اے ایڈیٹر "انجمن"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی حسین دوشیزہ اپنے گیسوؤں کو اپنے شانوں پر پھیلائے میرے سامنے بیٹھی ہو، اور جب اُس نے اپنے بکھرے ہوئے گیسو سمیٹ لئے تو مجھے معلوم ہوا، ارے یہ تو سالنامہ "بیسویں صدی" تھا

محترمہ قریشیہ خاتون آفق مظفر پوری

موجودہ گرانی کے دور میں اتنا ضخیم پرچہ اتنی کم قیمت میں نکالنا آسان کام نہیں ......

روزانہ "ملاپ" نئی دہلی :۔

سالنامہ [illegible] امتیازی اور روائتی شان ہیں ہندوستان و پاکستان کے سرکردہ ادبا، بلند پایہ شعرا۔ مضامین نگاروں کے معیاری مضامین شائع ہوئے ہیں..... سالنامہ [illegible] کا حسین مرقع ہے......

روزانہ "ویر بھارت" دہلی :۔

سالنامہ "بیسویں صدی" بلاشبہ بے نظیر ہے..... اس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور ادیبوں کے بلند پایہ مضامین شامل ہیں....

روزانہ "تیج" دہلی :۔

مضامین کا انتخاب بہت خوب ہے۔ خوشتر صاحب کے نیتر و نشتر در حقیقت مرہم کا اثر رکھتے ہیں۔ سالنامہ کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "بیسویں صدی" کی [illegible] کا [illegible] ہے۔

ہفتہ وار "جیتر" دہلی

"بیسویں صدی" [illegible] کے ماہناموں میں ہے یوں تو اس کا ہر پرچہ شاندار اور دلچسپ مثال آپ ہوتا ہے مگر اس نے جو سالنامہ شائع کیا ہے وہ تو ایک یادگار چیز ہے.....

تیر و نشتر

از

خوشتر گرامی

امریکہ میں ایک چوبیس سال کے نوجوان نے ۱۸ برس کی میم صاحبہ کو دُلہن بنانے کی ٹھان لی - مزہ یہ ہے کہ اِن دونوں شمعِ محبت کے پروانوں کو نوخیز جوڑوں سے بھی زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس مخالفت میں شادی کی اجازت دینے والے حکام سے بھی زیادہ سرگرمی خود ہونے والی دُلہن کے بیٹے نے دکھائی جس کی عمر صرف تریسٹھ سال ہے۔ اُسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ میں ایک ایسے شخص کو اپنا (سوتیلا ہی سہی) باپ نہیں بنا سکتا جو عمر میں میرے پوتے کے برابر ہے -

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ بچّہ مرد کا باپ ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ابتدا بچپن سے ہوتی ہے، اس لئے بڑی عمر والے لوگ گویا اپنے بچپن کی اولاد ہوتے ہیں۔ اس شادی سے یہ کہاوت سو فیصدی درست ثابت ہو گئی ——— لیکن وہ ہم مشرق والوں کا سوال اب بھی حل نہیں ہوا کہ پہلے مرغی عالمِ وجود میں آئی یا انڈہ ؟

* * * * * * * *

فرید کوٹ میں تقریر کرتے ہوئے مہاراجہ پٹیالہ نے فرمایا کہ "جو لوگ ہندوؤں اور سکھوں کو الگ الگ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ ہمارے اصل دشمن ہیں - نیز سکھوں کو اس قسم کے نعروں سے گمراہ نہ ہونا چاہئے کہ پنتھ خطرے میں ہے، کیونکہ پنتھ ہرگز خطرے میں نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی اُسے تباہ کر سکتا ہے"

پنتھ کو کبھی خطرہ نہیں لیکن نعرہ لگانے والوں کی لیڈری کو تو خطرہ ہے - اور جب لیڈری خطرے میں ہو تو پنتھ، مذہب، دھرم، ملک، قوم بلکہ خدا بھی خطرے میں ہوتا ہے - بس اگر آپ اس قسم کے نعرے بند کرنا چاہتے ہیں تو نعرے لگانے والوں کو تحریری یقین دلا دیجئے کہ آپ میں سے ہر شخص کا مہینے میں ایک مرتبہ کہیں نہ کہیں جلوس نکال دیا کریں گے اور کچھ نہ کچھ ماہانہ بھی ملتا رہے گا - پھر دیکھئے کیا امن چین سے گذرتی ہے

* * * * * * * *

مشرقی پنجاب کی حکومت نے شرنارتھیوں کی حالت معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی - اُس کے صدر لالہ بھیم سین سچر نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "لاکھوں شرنارتھی روز بروز موت کے منہ میں جا رہے ہیں یتیم بچے، ودھوا عورتیں اور بیمار آدمی بہت ہی بُری حالت میں زندگی گذار رہے ہیں"

یہ صورتِ حال نہ صرف بھارت ورش کی شان کے شایاں نہیں بلکہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نیز اُن کانگریسیوں کیلئے بھی بے حد شرمناک ہے جن پر آزادی ملنے کے بعد ملک اور اہلِ ملک کی فلاح و بہبود کی تمام تر ذمّہ داریاں عاید ہوتی ہیں - اور افسوس یہ ہے کہ اُن میں سے اکثر و بیشتر اِن ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی بجائے خود غرضی، خویش پروری حتیٰ کہ منافع بازی اور بلیک مارکیٹ تک سے ملوث ہو کر اہلِ وطن کے لئے مصیبت اور کانگرس کے لئے بدنامی اور کمزوری کا باعث بن رہے ہیں -

* * * * * * * *

جنرل موہن سنگھ نے ایک تقریر میں فرمایا کہ "شرنارتھی دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور نام نہاد قومی نیتا عیش کر رہے ہیں ہمیں عوام کی حالت سنوارنے کی کوشش کرنی چاہئے"

جرنیل صاحب کے ارشاد کی صداقت سے اِن نام نہاد قومی نیتاؤں کو بھی انکار نہیں - صرف لفظ "عوام" کے معنوں کی وسعت کے متعلق ذرا اختلاف ہے - آخر عوام میں خود یہ لیڈر لوگ، اِن کے رشتہ دار، رشتہ داروں کے رشتہ دار، رشتہ داروں کے رشتہ داروں کے رشتہ دار، پھر اُن کے دوست، دوستوں کے دوست، دوستوں کے رشتہ دار، دوستوں کے دوستوں کے رشتہ دار سبھی شامل ہیں۔ پس یہ پہلے قریب کے عوام یعنی اپنی اور اپنے پشت در پشت رشتہ داروں اور دوستوں کی حالت سنوار رہے ہیں - اس کے بعد عوام کی باری بھی

آجائے گی۔ آپ تو خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اخباری اطلاع ہے کہ مشرقی پنجاب کی حکومت نے رشوت ستانی کے خلاف جو مہم جاری کر رکھی ہے، اُس کے نتیجہ کے طور پر کئی افسر اور کلرک ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔

لیکن جو لوگ اہلِ حکومت سے قریب تر ہیں اگر اُن کے اعمال کی تحقیقات ہو، تو شاید اِس سے بھی موٹے موٹے پلے ہوتے تنکھر ہاتھ آئیں۔

⁂ ⁂ ⁂

بابو پرشوتم داس ٹنڈن فرماتے ہیں کہ آج سکھ مسلم لیگ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں!

تو کیا ہم یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ اِس میں قصور کس کا ہے؟ کیا کانگرسی لیڈر اور کانگرسی حکومتیں فرقہ پرست سکھوں کو اہمیت دے کر اور قوم پرست سکھوں کو نظر انداز کر کے وہی صورت حالات پیدا نہیں کر رہیں جس کی بدولت مسلم لیگ طاقت ور ہوتی گئی تھی اور قوم پرست مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا؟ مصیبت یہ ہے کہ

آپ کو چاہنے والوں کی بھی پہچان نہیں

⁂ ⁂ ⁂

بعض اخبارات کی تحریروں میں یہ عجیب و غریب بات پائی جاتی ہے کہ جب وہ ہندوستان یا اس کے کسی صوبے میں رشوت ستانی یا کسی اور بُرائی کا ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو ساتھ ہی پاکستان کا ذکر بھی کر دیتے ہیں کہ وہاں یہ خرابی اور بھی زیادہ زوروں پر ہے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی نکٹا کسی دوسرے شخص کی ناک کٹی ہوئی دیکھ کر مطمئن بلکہ خوش ہو جائے یا کوئی شخص اپنے نمونیا کے مریض باپ کے علاج معالجہ سے صرف اِس لئے بے پروا ہو جائے کہ محلے میں ایک اور شخص کا باپ بھی نمونیا سے جاں بلب ہے۔ کوئی پوچھے پاکستان میں رشوت کی گرم بازاری ہندوستان میں عمالِ حکومت کی بدکرداری کے لئے کیونکر وجہ جواز بن سکتی ہے۔ پاکستان کو اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ پہلے اپنے گھر کی خبر

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

⁂ ⁂ ⁂

ہندوستان کی تقسیم جن غیر قدرتی وجوہ کی بنا پر اور جس غیر قدرتی انداز میں ہوئی، اُس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تباہی آئی اور ابھی تک اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ لیکن ملک کے دونوں حصّوں کے تعلقات کی قانونی صُورتیں اِس تباہی میں بے حد افسوسناک بلکہ دردانگیز اضافہ کر رہی ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ مشہور و معروف ادیب اور شاعر حضرت یزدانی جالندھری بمبئی میں تھے کہ انہیں پاکستان سے اُن کے والد کی علالت کی اطلاع ملی۔ انہوں نے پاکستان جانے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بمبئی کی پولیس نے پوچھ تاچھ کے بعد جواب دیا کہ چونکہ آپ صرف تین سال سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ اس لئے ہم آپ کو ہندوستان کا باشندہ تسلیم نہیں کر سکتے۔

گویا ۱۹۴۷ء کی "قیامت" میں جن لوگوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ کر تمام مشکلات اور گوناگوں خطروں کے باوجود یہاں سکونت اختیار کی انہیں اپنی وطنیت کے بارے میں مزید ثبوت بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔ یزدانی صاحب نے لاکھ سر مارا، تمام متعلقہ افسروں کے آستانوں پر جبہ سائی کی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ——— اور ستم بالائے ستم یہ کہ اِدھر ضابطے کی کارروائی ختم نہیں ہوئی اور اُدھر اُن کے والد صاحب بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترستے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو گئے ——— یزدانی صاحب بیچارے اِس ضابطہ پرستی سے تنگ آکر دہلی آگئے۔ خدا جانے اِس قسم کے کتنے واقعات ہر روز پیش آتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ متعلقہ حکام صرف ضابطہ کے الفاظ کے پیچھے بھاگنے کی بجائے عقل و دانش سے کام لیا کریں۔ کیونکہ یہی ایک چیز انسان کو دیگر مخلوق سے ممتاز کرتی ہے +

فرمائش

افسانہ

از

پروفیسر مس کرشنا کماری ایم۔ اے

کمار تنہائی سے گھبرا کر سرہانے رکھی ہوئی ٹیبل سے ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اُس میں بھی اُس کا جی نہ لگا۔ وہ سوچ رہا تھا دو ہی گھنٹوں میں میری یہ حالت ہوگئی، اور ابھی ایک رات ہی نہیں۔ پُورے بیس دن پڑے ہیں۔ آخر لوگ ہوٹلوں میں ساری زندگی کس طرح گذار دیتے ہیں؟

اُس نے کتاب سرہانے رکھ دی، اور ایک کسل آمیز انگڑائی لے کر کروٹ بدلی ہی تھی کہ اُس کی آنکھیں دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ اُسے معلوم ہوا جیسے آج چودھویں کا چاند بھی رات گذارنے کے لئے اسی ہوٹل میں اُتر آیا ہے۔ دروازے میں کھڑی ہوئی لڑکی ایسی معلوم ہو رہی تھی، جیسے کسی مصوّر نے قدِ آدم تصویر بنا کر فریم میں لگا دی ہے۔

لڑکی کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دیر سے دروازے پر کھڑی ہے، اور اکیلا کمرہ اور رات کا وقت ہے، اِس لئے نہ اندر قدم رکھنے کی ہمّت ہو رہی ہے اور نہ کمار کو متوجہ کرنے کا کوئی مناسب طریقہ ہی سمجھ میں آ رہا ہے۔

ایک لڑکی کو اِس طرح گھورنے پر کمار چونک کر آپ ہی آپ جھینپ سا گیا اور جھٹکے سے اُٹھ کر پلنگ کے نیچے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "تشریف لائیے ——— میرے لائق کوئی خدمت؟"

کمار کی بوکھلاہٹ دیکھ کر لڑکی کے باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ لانبی لانبی پلکیں ایک بار اُٹھیں، اور دُوسرے ہی لمحے جھک گئیں۔ سہمتے ہوئے پیروں سے وہ شرماتی سمٹتی کمرے میں آ کر کمار کے سرہانے رکھی ہوئی ٹیبل کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اِس شعلۂ حسن و شباب کو اتنے قریب دیکھ کر کمار بھڑکتے ہوئے چراغ کی لو کی طرح تھرتھرا اُٹھا۔ پھر اپنے کو سنبھالتے ہوئے بہ مشکل بولا۔ "تشریف رکھئے ———!"

لڑکی کے چہرے کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔ اور سانس شاید احساسِ تنہائی سے غیر معمولی طور پر تیز تھی۔ ایک غیر مرد کی موجودگی، رات کا وقت، اکیلا کمرہ۔ اُسے بیٹھنے کی ہمّت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے دس روپے کا ایک نوٹ کمار کو دکھاتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ "جی نہیں ——— آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گی، ہو سکے تو دس روپے کا چینج دے دیجئے۔ بہت ضرورت ہے۔"

اور کمار کو اِس طرح دیکھنے لگی، جیسے اُس کے چہرے میں کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔

لڑکی کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں نوٹ کانپ رہا تھا اور کمار کی نگاہیں اُس کی نرم و نازک اُنگلیوں، گوری باہیں اور کلائی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اِتنے میں جھجکی جھجکی نگاہوں سے لڑکی نے پھر کہا۔ "شاید چینج آپ کے پاس بھی نہیں ہے ———؟"

"اوہ ———!" کمار نے چونک کر کہا۔ معاف کیجئے گا۔ ہاں ——— آپ کو چینج چاہیے نہ؟" اُس نے پلنگ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس کھینچ کر تالا کھولا اور اُس میں سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر لڑکی کے سامنے ٹیبل پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ "چھانٹ لیجئے اِن میں سے اپنی پسند کے۔"

کمار کے اِس جملے نے لڑکی کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ بکھیر دی۔ وہ اپنی فطری شوخی کو دباتے ہوئے نہایت سادگی سے بولی۔ "پہلے بھاؤ تو طے کر لیجئے۔ کتنے سیر بکیں گے یہ نوٹ ———؟" اور اپنی ہنسی کو روکنے کے لئے اُس نے ہونٹ دانتوں سے دبا لئے۔

"کتنے سیر ———؟" کمار نے بھی چٹکی لی۔ "آپ سے مول بھاؤ کیا کرنا ہے آپ کی نگاہوں میں جو کچھ جچے لے لیجئے۔"

"میری نگاہوں میں تو اب تک ایک بھی نہیں جچا ———!" وہ ایک پانچ کا اور پانچ نوٹ ایک ایک کے اُٹھاتے ہوئے معنی خیز انداز سے بولی۔ "لیکن کیا کروں ضرورت سے مجبور ہوں۔"

"بہر حال یہی میرے لئے کیا کم خوشی کی بات ہے کہ مجھ سے آپ کی۔۔" کمار نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اِس پُر معنی کنائے پر لڑکی کا گلابی چہرہ سُرخ ہو گیا اور شرماتی ہوئی سی بولی۔ "اچھّا شکریہ۔ چلوں۔ کافی دیر ہوگئی ———!"

"لیکن ٹھہرئے تو۔" کمار جیسے کسی رنگین خواب سے چونک کر بولا۔ "اپنا تعارف تو کراتی جائیے۔ کون جانے مجھے بھی اپنی کسی ضرورت سے مجبور

ہو کر آپ کو تکلیف دینی پڑے۔ یہ دُنیا ہے نا ——"

وہ اپنی ہنسی دباتی ہوئی بولی "میں بھی اسی ہوٹل کے کمرہ نمبر آٹھ میں ٹھہری ہوں!"

"آپ بھی میری طرح تنہا ہیں یا آپ کے ساتھ —— ؟"

"جی ہاں —— میرے بڑے بھائی بھی ہیں!" اُس نے جلدی سے کہہ دیا۔

"تو کیا آپ بھی امتحان دینے کے لئے اِس شہر میں آئی ہیں —؟"

کمار کے اِس سوال پر لڑکی کا چہرہ یکایک اُداس ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں جیسے کوئی کہانی اُبھر آئی۔ وہ بھرے ہوئے گلے سے بولی۔ "امتحان دینے نہیں، پناہ لینے آئی ہوں۔" اور اُس کی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئیں

"کیا میں کچھ تفصیل سُن سکتا ہوں؟" کمار نے ہمدردانہ انداز سے کہا "میں جانتا ہوں آپ کو تکلیف تو ہوگی ضرور۔ لیکن مصیبت جتنی بیان کی جاتی ہے اُتنی ہی ہلکی ہوتی جاتی ہے۔"

لڑکی نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "میری کہانی تو بہت دُکھ بھری اور لمبی ہے۔ صرف اتنا سن لیجئے کہ میں نواکھالی کے جہنّم میں جلے ہوئے ایک ہرے بھرے باغ کی ایک کلی کی راکھ ہوں، جو حالات کے طوفان کے ساتھ ساتھ اُڑتی اُڑتی یہاں تک آگئی ہے۔ میرے پتا جی کا پیولائٹ بینک لُٹ گیا۔ مکان میں آگ لگا دی گئی۔ میری چھوٹی بہن، ماں اور پتا جی اُسی میں جل کر راکھ ہو گئے۔ صرف ہم دونوں بھائی بہن جو کالج ہوسٹل میں رہتے تھے، کسی طرح بچ بچا کر نکل آئے ہیں۔ بھائی بھی صدمے سے بیمار پڑ گئے ہیں۔ کون جانے وہ بھی کب ساتھ چھوڑ —— " اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی

کمار اُس کی کہانی سُن کر اور اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور بھرے ہوئے گلے سے تسلّی دیتا ہوا بولا "خیر جیسی بھگوان کی مرضی صبر سے کام لیجئے۔ استقلال اور صبر مصیبت کے سب سے بڑے ساتھی ہیں۔ آج سے مجھے اپنا خادم سمجھئے۔ کبھی کسی طرح کا تکلّف نہ کیجئے۔ میرے لائق جو کام ہو بے تامل یاد فرمایئے۔ دُکھ کے دن سدا نہیں رہتے۔ اِس میں شک نہیں کہ اتنا بڑا انقلاب اور اُس کا اتنا بھیانک ردّ عمل شاید ہی کسی ملک کی تاریخ میں ملے۔ لیکن آفرین ہے اپنے مدبّر اور مستقل مزاج ناخداؤں کو اور سلامت رہیں وہ بازو جنہوں نے اِس طوفان کا کلیجہ چیر کر دیش کی ناؤ کو کنارے لگا دیا ہے۔ یوں تو ہر طوفان کے بعد کچھ دیر تک ہیجان رہتا ہے، لیکن اب ہم اور آپ سب خطرے سے باہر ہیں۔ شر اور فساد کے بھوت کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ امن و امان کے دیوتا کی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ بیتی باتوں کے لئے صبر کیجئے اور اب حوصلے سے کام لیجئے۔ بھگوان نے چاہا، تو قابل باغبانوں کی آبیاری سے انقلاب کا روندا ہوا ہمارا باغ پھر جلد ہی شاداب ہو جائے گا۔ اور نئی نئی کونپلوں اور حسین و خوش رنگ پھولوں سے پُر بہار بن جائے گا۔ میں آخر میں آپ سے ایک بار پھر عرض کروں گا کہ اپنی کسی تکلیف میں مجھے بھولئے گا نہیں۔"

"کب تک ٹھہریں گے آپ اِس ہوٹل میں —؟" لڑکی نے آنچل کے کونے سے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً بیس دن!" کمار نے جواب دیا "میں یہاں سیکنڈ ایر کا پرائیویٹ امتحان دینے آیا ہوں"۔

"آپ کا امتحان کب شروع ہو رہا ہے؟"

"کل صبح ہی پہلا پرچہ ہے۔"

"تب تو میں نے آپ کے قیمتی وقت کے تیس منٹ ضائع کر کے بہت بڑا گناہ کیا!" وہ ہاتھ جوڑ کر نہایت لجاجت سے بولی "معاف کیجئے گا —— اچھا نمستے ——" اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"ذرا سنئے تو ——!" کمار نے اُسے چند منٹ اور روکنے کے خیال سے کہا۔ "دیکھئے تو میں باتوں میں ایسا کھویا کہ نام بھی پوچھنا بھول گیا!"

"میرا نام —— ؟" جیسے وہ بھی جانا نہ چاہتی ہو۔ تیزی سے مڑ کر پھر ٹیبل کے پاس آکر ایک کتاب اُلٹتی پلٹتی ہوئی شرما کر بولی "میرا نام تو ریکھا ہے کمار بابو!" اور مُسکرا دی۔

"اِیں —— ؟" کمار چونک پڑا "میرا نام آپ کو کس نے بتا دیا —؟" وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"آپ کی کتاب کے سرورق نے!" ریکھا نے اُس کے نام پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

"خیر اچھا ہی ہوا جو آپ کی طرح مجھے اپنے منہ سے اپنا نام نہیں بتانا پڑا۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ جب میں خود ہی آپ کے سامنے موجود ہوں تو پھر میرے نام کو اِس طرح گھورنے کی کیا ضرورت ہے —؟"

ریکھا نے شرما کر جھٹکے سے کتاب ٹیبل پر رکھ دی اور تیزی سے کمرے سے باہر ہو گئی۔ کمار کو محسوس ہوا جیسے کوئی رنگین خواب دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھ کھُل گئی ہو۔ اُسے کمرہ اور بھیانک معلوم ہونے لگا۔ جیسے ریکھا اُس کا سب کچھ اپنے ساتھ لیتی گئی ہو۔ رات کے دس بج رہے

تھے۔ صبح امتحان تھا اور کتاب چھونے کو اُس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

اتنے میں ہوٹل کا ملازم کھانا لے کر آگیا۔ کمار اُسے ٹیبل پر رکھنے کا اشارہ کر کے پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا، جیسے کوئی جھنجھوڑ کر کہہ رہا ہو" دیوانے! تو امتحان دینے آیا ہے۔ اپنے مستقبل اور زندگی کی بنیاد مضبوط کرنے! یہ ہوائی محل کیوں تیار کرنے لگا؟ اپنی بھلائی چاہتا ہے تو فوراً یہ ہوٹل چھوڑ دے۔ ابھی۔ اسی وقت"! لیکن ساتھ ہی اُسے معلوم ہوا، جیسے ریکھا سامنے کھڑی جھکی جھکی پلکوں سے کہہ رہی ہے "کمار بابو! مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ تم نے تو کہا تھا مجھے اپنے دُکھ سُکھ کا ساتھی سمجھو۔ کیا اتنی جلدی بھول گئے اپنی بات؟ کیا مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ آخر تو مرد ہو؟"

کمار نے اُسی ہوٹل میں رہ کر مطالعہ کرنے اور امتحان دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کتاب لے کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیکن وہ تو ریکھا کو اپنی آنکھوں میں لے کر سونا چاہتا تھا۔ کتاب میں اُس کا جی کہاں لگتا؟ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہا" آہ ریکھا تم یہ کیا کر گئیں"! اور ریکھا لفظ کے ساتھ ہی حُسن و شباب کی پیکر ریکھا جیسے اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور حسین تصوّرات اور رنگین خیالات نے اُسے تھپک کر جلد ہی ریکھا کی یاد کی آغوش میں سُلا دیا۔

اُس نے دیکھا، جیسے ریکھا اٹھلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی ہے اور اُس کے سرہانے کھڑی کہہ رہی ہے "کمار بابو! یہ آپ نے مجھے کیا کر دیا؟ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی کسی پہلو چین ہی نہیں آتا"! کمار نے جھپٹ کر اُس کا آنچل پکڑ لیا اور کھینچ کر بٹھانا ہی چاہا تھا کہ "جھن" کی آواز کے ساتھ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ٹیبل کلاتھ کا کونہ اُس کے ہاتھ میں تھا اور ٹیبل کی ساری چیزیں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر صبح تک اُسے نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدلتا رہا، لیکن کسی طرح رات ختم ہی ہونے میں نہ آتی تھی۔

بار بار اُس کی آنکھوں میں وہی خواب گھومتا۔ اور بار بار اُس کے دِل میں گدگدی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے ریکھا کا آنچل اب بھی اُس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اُسے کھینچنا چاہ رہا ہے۔ وہ شرما کر سمٹی جا رہی ہے۔

آخر صبح ہو گئی۔ اور وہ نہ تو سو سکا اور نہ پڑھ ہی سکا۔ کالج کا وقت ہو گیا تھا۔ تھکا ہوا سا بستر سے اُٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر کتابیں لے کر چل پڑا۔

ہوا کے پروں پر بیس دن گذر گئے۔ ریکھا اور کمار کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ اُن کی زندگی کے بیس دِن کب گُم ہو گئے۔ اس عرصے میں کمار ریکھا کو اپنے بہت قریب محسوس کرنے لگا۔ ریکھا بھی اُس کے سامنے آکر جیسے کچھ سکون سا محسوس کرنے لگتی۔ کمار ہر ملاقات میں اپنی محبت کے مدھر گیت ریکھا کے کانوں میں گنگناتا رہتا۔ ریکھا بھی اُس سے بہت متاثر ہوتی معلوم ہوتی۔ لیکن کمار کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اُس میں اور اُس کے گیتوں میں کس کا عکس دیکھتی ہے اور دراصل اُس کے کان کس کے نغموں سے معمور ہیں؟

وہ ریکھا کو اپنے خوابوں کی رانی سمجھتا تھا، لیکن اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ ریکھا کے سپنوں کا راجا کوئی اور ہے۔ ریکھا کمار کے دِل میں بس گئی تھی، لیکن کمار ریکھا کے دِل میں جھانک کر اُس میں بسنے والے کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس طرح ریکھا کے خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اُسے یہ محسوس ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ریکھا کے خیالات میں کوئی اور بسا ہوا ہے۔ وہ ریکھا کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتا رہتا تھا اور ریکھا اُسے دیکھ دیکھ کر اپنی مدت کی پیاسی آنکھوں کی تشنگی کو سکون دینے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

اب ریکھا کے بھائی کی صحت کسی قدر سنبھل چکی تھی۔ آہستہ آہستہ چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لئے بار بار آنے جاتے کمار اور ریکھا کا بھائی ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر صبح و شام جب تینوں ایک ساتھ ٹہلنے کے لئے باہر نکلتے تو دیکھنے والے سمجھتے کہ یہ سب ایک ہی کنبے کے افراد ہیں۔

کمار کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ریکھا کو چھوڑ کر جانے کے خیال سے بھی کانپ اُٹھتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال لگا ہوا تھا کہ گھر والوں کو دیر ہونے کی کیا وجہ بتائے گا۔ اس لئے کئی دن تک سوچنے کے بعد اُس نے دبی زبان سے ریکھا کے بھائی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اب آپ کی صحت بھی سنبھل چکی ہے اور زیادہ دنوں تک ہوٹل کے اخراجات برداشت کرنا بھی آپ کے لئے ناممکن ہے۔ کیوں نہ آپ لوگ میرے ساتھ گھر چلے چلیں۔ بھیا کہیں نہ کہیں آپ کو مناسب ملازمت بھی دلا دیں گے۔ ورنہ اس طرح زندگی کے دن کب تک اور کیسے گذریں گے؟ آپ میری پیشکش کو قبول کر لیں اور میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیں۔

بات معقول تھی۔ اوّل تو گریش خود ہی جانتا تھا کہ بغیر کچھ کئے اب

زیادہ دنوں تک اخراجات کی ناؤ نہیں چل سکتی - دوسرے جوان بہن کو ساتھ ساتھ لئے ٹھوکریں کھاتے کھاتے تنگ آچکا تھا - پھر اُس کی شادی کی فکر اُسے اُدھ مارے ڈال رہی تھی - وہ سوچنے لگا ۔ ایک زمانہ تھا کہ پتا جی کی زندگی میں سینکڑوں جگہ سے رشتے آتے تھے ، لیکن اس نے ٹھکرا دئے تھے اور آج تو ہم اِس حال میں ہیں کہ یہ راضی بھی ہو جائے تو کون پوچھے گا - پھر کب تک ایسے ایسے اس طرح ہوٹلوں اور دھرم شالاؤں میں گھوماتا پھروں گا - یہ سب سوچ کر اپنی رضامندی کے ساتھ ساتھ اُس نے ریکھا سے بھی رائے لے لینی ضروری سمجھی - ریکھا بھی بھائی کی مجبوریاں جانتی تھی اور کمار میں اپنے کسی بھولے ہوئے خواب کی جھلک بھی دیکھتی تھی - اس لئے دبی زبان سے "جیسی آپ کی مرضی" کہہ کر خاموش ہو گئی -

سامان درست کرتے ہوئے گھر کی طرف چلنے کا خیال آتے ہی کمار کو یاد آنے لگا کہ کس کس نے کن کن چیزوں کی فرمائش کی تھی - ماں نے کہا تھا "بیٹا! نارائن پور جا رہے ہو ، تو میرے لئے ایک بڑی رامائن لیتے آنا" منجھلی بہن شیلا نے ایک پاؤنڈ ہری اُون کی فرمائش کی تھی - چھوٹے بھائی نے انگریزی ٹوپی مانگی تھی - اور جب کمار نے اپنے بڑے بھائی کمل سے خود ہی پوچھا تھا کہ بھیا ، آپ کے لئے نارائن پور سے کیا لاؤں گا ؟ تو اُن کے جواب دینے سے پہلے ہی شوخ اور معصوم لیلا نے بڑھ کر کہا تھا "میں بتا دوں؟ بڑے بھیا کے لئے ایک اچھی سی اور پڑھی لکھی بھابی لانا نہ بھولئے گا" سب ہنس پڑے تھے - اور کمل نے لیلا کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا "ٹھہر تو جا ، بھابی منگانے والی نٹ کھٹ لڑکی !" لیکن لیلا مچل کر رو پڑی تھی اور ماں کی گود میں بیٹھ کر بولی تھی "نہیں ، میں تو بھابی لوں گی - کمار بھیا ، اگر بھابی لانا بھول گئے تو میں تم سے کبھی نہ بولوں گی !"

ننھی بہن کے آنسو دیکھ کر دونوں بھائیوں کا دل بھر آیا تھا اور شادی کے نام پر ہمیشہ بگڑ جانے والے کمل نے بھی اُسے گود میں اُٹھاتے ہوئے ہنس کر کہا تھا - "اچھا بھئی کمار ! میری لیلا رانی کے لئے بھابی ضرور لیتے آنا چاہے اور سب کی فرمائش بھول جائیں ، لیکن میری ننھی سی بہن کی اچھی سی بھابی نہ بھولنا !"

سوچتے سوچتے یکایک چونک کر اُس نے سامان چھوڑ دیا اور بازار چلا گیا - اُس نے ماں کے لئے ایک بڑی رامائن خریدی - شیلا کی ہری اُون اور منّو کی انگریزی ٹوپی بھی مل گئی ، لیکن لیلا کی بھابی کا خیال آتے ہی وہ اداس ہو گیا اور سوچنے لگا - اُس کا بچپن ہی سہی لیکن جب سب اپنی اپنی چیزیں پا کر ہنس ہنس کر سب کو دکھاتی پھریں گی تو میں لیلا کو کیا دے کر اُسے روکوں گا ؟ کیا جواب دوں گا اُس معصوم بچی کو ؟ وہ کیا جانے کہ بھابی بازار سے خریدنے کی چیز ہے یا نہیں ؟

اسی خیال میں وہ کچھ اُداس سا بازار سے لوٹ کر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا ریکھا پہلے ہی تیار ہو کر آچکی تھی اور اُسے دیکھتے ہی کسی قدر مچل کر بولی "خوب —— ابھی آپ بازار ہی گھوم رہے ہیں اور گاڑی کا وقت ہوا جا رہا ہے - لطف یہ کہ حضرت کا سامان بھی آدھا بکھرا پڑا تھا - کس کی یاد آگئی تھی جو اس طرح چھوڑ کر بھاگے تھے ؟" پھر اُس کے ہاتھوں میں کچھ سامان دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی - "ذرا دیکھوں تو کس کس کی فرمائشیں پوری کی گئی ہیں ؟"

کمار نے بڑھ کر چھوٹے بھائی کی انگریزی ٹوپی اُس کے سر پر رکھ دی اور ہنستا ہوا بولا "یہ رہی منّو کی فرمائش' اور یہ ہری اُون شیلا بہن کی ہے - رامائن ماتا جی نے مانگی تھی اور رہ گیا باقی اپنے استعمال کا ہے "

ریکھا نے باری باری سب سامان دیکھنے کے بعد ہنستے ہوئے معنی خیز انداز سے پوچھا - "اچھی طرح یاد کر لیا تھا نا ، اور کسی کی کوئی فرمائش بھولے تو نہیں —— ؟"

کمار یکایک اُداس ہو گیا - اُس کے سامنے بھابی کے لئے مچلتی ہوئی بھولی لیلا کی تصویر آگئی - اُس کا چہرہ اُتر گیا - وہ ریکھا کی طرف دیکھتا رہ گیا - ریکھا اس سوال پر اُسے یکایک اُداس ہوتے دیکھ کر پریشان ہو گئی - وہ سوچنے لگی - شاید میرے اس مذاق سے ان کے کسی اَن دیکھے زخم پر ٹھیس لگ گئی ہے اس لئے نہایت لجاجت سے بولی - "معاف کیجئے گا - شاید میں کوئی تکلیف دہ سوال کر بیٹھی !"

" نہیں ریکھا ، میں اپنی مجبوری پر اُداس ہو گیا - میں نے سب کی فرمائش کی چیزیں تو خرید لیں ، لیکن اپنی سب سے چھوٹی بہن کی فرمائش میرے بس کی نہیں تھی - اُس نے سب کو فرمائش کرتے ہوئے دیکھ کر چلتے چلتے کہا تھا کہ بڑے بھیا کے لئے ایک اچھی سی اور پڑھی لکھی بھابی ضرور لیتے آئیے گا - ورنہ آپ سے کبھی نہ بولوں گی !"

" تو کیا بھابی بازار بھر میں نہیں ملی ؟" ریکھا نے شوخی سے مسکرا کر پوچھا -

اسی لئے تو اُداس ہوں ریکھا —— !" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا -

" آپ بھی لیلا ہی جیسی باتیں کر رہے ہیں کمار بابو ! بھابی بھی کوئی دکان پر ملنے کی چیز ہے ، جس کے نہ ملنے سے آپ اتنے مایوس ہو گئے ہیں ؟ چلئے بھی میں

چل کر لیلا کو مناؤں گی"۔

"تو کیا میں یقین کر لوں کہ آپ لیلا کی فرمائش پوری کر دیں گی؟" وہ پُرامید انداز سے بولا۔

ریکھا کی شرمیلی آنکھوں نے جیسے جھک کر اُسے اطمینان دلا دیا۔ کمار نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو یہ سنبھالئے چابی اور مہربانی کر کے میری کتابیں صندوق میں سجا دیجئے۔ اتنے میں میں سفر کے لئے کپڑے بدل لوں"

صندوق کھولتے ہی ریکھا کی آنکھیں ایک تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ اُس نے اُسے اُٹھا لیا اور بار بار ایک نگاہ اُسے اور ایک نگاہ کمار کو دیکھنے لگی۔ اُس سے مشابہت تو بہت کچھ تھی، لیکن بالکل اُسی کی تصویر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکی اور خود کو بہت سنبھال کر بولی۔ "یہ تصویر ——— آپ کی تو نہیں ہے۔ یہ آپ کے کوئی رشتے دار ہیں کیا؟"

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے کمار نے اپنی ٹائی باندھتے ہوئے ریکھا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ہاں —— آں —— یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ انہیں کے لئے تو ممی سلا بھابی تلاش کر رہی ہے اور یہ ہیں کہ شادی نہ کرنے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔ کھڑے کھڑے کہتے کہتے تھک کر خاموش ہو گئے اور آپ ہیں کہ جانے کس کے سپنے دیکھتے رہتے ہیں!"

ریکھا تصویر کو گھورتے ہوئے بولی۔ "یہ کبھی شیل پاڑی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے ہیں؟"

"ہاں —— اب سے دو سال پہلے وہیں تو تھے۔ لیکن آپ یکایک وہاں سے بھی بے وجہ استعفا دے کر چلے آئے۔ عجیب آدمی ہیں حضرت! ——— ارے اب تو خود ہی چل کر دیکھئے گا۔ ایسا نہیں ہیں، لیکن رہتے ہیں جیسے ہمیشہ آسمان اور زمین کے بیچ میں کھوئے ہوئے ——— !" پھر جیسے کچھ چونک کر بولا۔ "ہاں —— آپ نے انہیں کہیں دیکھا ہے کیا؟"

کمار کی باتیں سُن کر ریکھا کی آنکھوں سے بے اختیار دو بوند آنسو ٹپک کر تصویر پر گر پڑے۔ اور کمار کی موجودگی سے بے پروا ہو کر اُس نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ اور ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ آنکھیں بند کر کے ماضی کے سہانے سپنے میں کھو سی گئی۔

کمار سب کچھ سمجھ گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ لیلا کی فرمائش پوری ہو گئی پھر بھی وہ ریکھا اور کمل کی کہانی کی تفصیل جاننے کے لئے بیتاب تھا لیکن پوچھتا کس سے؟ ریکھا تو جیسے تصویر کو سینے سے لگائے کہیں بہت دور کھو گئی تھی وہ برسوں پہلے کا ایک خواب دیکھ رہی تھی:۔

اُس کے اسکول کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے ماموں کے ہاں سے رخصت ہو کر دہلی، آگرہ اور متھرا وغیرہ گھومنے کے بعد اپنی ماں کے ساتھ پھر شیل پاڑی واپس جا رہی تھی۔ جھینا اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تھی۔ اور وہ دروازہ پکڑے کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ کمل نے آکر اُسی کمپارٹمنٹ میں داخل ہونا چاہا۔ ریکھا نے راستہ روکے ہوئے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔ "مہاشے جی ——— کوئی اور ڈبہ تلاش کر لیجئے۔ اس میں دھنسنے کی کوشش بیکار ہے۔"

کمل نے اندر کی خالی جگہ کو دیکھا اور صرف ایک نگاہ ریکھا پر ڈال کر خاموشی سے دوسرے ڈبے کی تلاش میں چلا گیا۔ اُس کی اس خاموش شکایت سے ریکھا بہت متاثر ہوئی تھی، لیکن وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ چکا تھا کہ وہ آواز بھی نہ دے سکی۔

سفر کی تکان، کھانے اور سونے کی بے اصولی اور جگہ جگہ کا پانی پینے کی وجہ سے گھر پہنچ کر ریکھا بیمار پڑ گئی۔ اسکول کھلے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ سولہویں دن وہ داخلے کے لئے عرضی لے کر ہیڈ ماسٹر کے آفس میں گئی، تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زبان گنگ ہو گئی اور قدم دروازے ہی پر زمین میں اس طرح گڑ سے گئے کہ نہ تو وہ آگے ہی بڑھ سکی اور نہ پلٹ کر بھاگ ہی سکی۔ اتنے میں کچھ آہٹ محسوس کر کے کمل نے آنکھیں اُٹھائیں اور پہلی ہی نگاہ میں اُسے پہچانتے ہوئے نہایت تپاک سے کہا۔ "تشریف لائیے۔ فرمائیے۔ کیسے تکلیف کی؟"

ریکھا نے جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ کانپتے ہونٹوں سے کہا۔ "میں۔ دسویں میں —— داخل ہونے کی درخواست لے کر حاضر ہوئی ہوں"۔

"اوہ ——— !" کمل نے میٹھی چٹکی لی۔ "میں تو سمجھا تھا کہ جب آپ ٹکٹ لے کر بھی گاڑی میں دھنسنے نہیں دیتیں تو یہاں تو میں بلا ٹکٹ آیا ہوں!" پھر ہنس کر اُسی دن کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ "کماری جی! سیٹیں بالکل بھر گئی ہیں۔ میں آپ کو کہاں دھنساؤں؟ کوئی اور اسکول تلاش کر لیجئے!"

ریکھا زمین میں گڑی سی جا رہی تھی۔ شرم سے اُس کے کانوں تک سُرخی دوڑ گئی۔ وہ مُڑ کر کمرے سے بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ کمل نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہر جائیے۔ میں سمجھ گیا۔ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ میں جھینا ہائی اسکول سے تبدیل ہو کر آپ ہی کے اسکول کا چارج لینے آ رہا ہوں۔ ورنہ آپ اسٹیشن پر میرے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرتیں۔ اور اگر وہاں آپ سے وہ غلطی ہو بھی جاتی تو داخلے کے لئے اتنا لیٹ نہ آتیں۔ بہرحال آپ نے مجھے گاڑی میں گھسنے نہیں دیا تھا۔ لیکن میں آپ کو اسکول سے مایوس نہ جانے دوں گا!" پھر اُس کی پشیمانی سے لطف اُٹھاتے ہوئے اُس نے ہنس کر کہا۔ "لیکن تعجب تو یہ ہے کہ میں جھینا اسٹیشن

پیدل آکر وقت پر یہاں پہنچ گیا اور آپ گاڑی میں بیٹھ کر بھی بیس دن بعد پہنچیں؟

ریکھا کو اسکول میں جگہ مل گئی اور وہی ریکھا جس نے کمل کو سرکاری گاڑی میں داخل نہیں ہونے دیا تھا، اسے اپنے دل میں لبھانے پر مجبور ہو گئی اور اس چھوٹے سے واقعے نے آہستہ آہستہ ایسی کہانی کا روپ دھار لیا جو اسکول تو اسکول باہر کے لوگوں کی زبانوں پر بھی پھیل کر رہی۔

ریکھا کے باپ نے اُس کا اسکول جانا بند کر دیا، لیکن چھپکے چھپکے ملنا نہ بند کر سکے۔ آخر کسی آنے والے کلنک کے خوف سے وہ ایک دن اپنا پورا کنبہ لے کر شیل باڑی سے ریوتی نگر چلے گئے۔

ریکھا کو تو انہوں نے کمل سے دُور کر دیا۔ لیکن کمل کے خیال کو ریکھا سے دُور نہ کر سکے اور کمار کی زبانی یہ معلوم کر کے کہ وہ اب بھی کسی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں ریکھا کا دھندلا خواب پھر رنگین ہو اُٹھا۔

کمار بابو! ابھی تک آپ تیار نہیں ہوئے؟" برآمدے میں بھائی کی آواز سن کر ریکھا چونک گئی اور کچھ آنسو اندر ہی اندر پی گئی۔ کچھ آنچل میں جذب کرتی ہوئی سنبھل کر کھڑی ہو گئی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی "کمار بابو! سچ مچ ابھی ہم لوگ یہیں ہیں! بارہ بج گئے؟ دیکھئے بھیا بھی تیار ہو کر آ گئے۔" اور پھر دونوں کھوئے ہوئے سے باہر نکل آئے۔ کمار کے چہرے پر رنج اور خوشی کے ملے جلے جذبات کھیل رہے تھے۔

گاڑی اسٹیشن پر ایکی تھی کسی طرح ٹکٹ لے کر بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ ریکھا کے خیالات گاڑی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑ لگا رہے تھے اور وہ کبھی ہنسی کی بات پر بھی کھوئی ہوئی سی خاموش رہ جاتی۔ کبھی معمولی سی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور یہی حال قریب قریب کمار کا بھی تھا۔

شام ہوتے ہوتے وہ سب گھر پہنچ گئے۔ سب کی فرمائش کی چیزیں تو صندوق میں بند تھیں، لیکن لیلا دروازے کے باہر ریکھا کو دیکھتے ہی چلا اٹھی "بھائی!" اور دوڑ کر ریکھا سے لپٹ گئی۔ ریکھا کا دل خوشی سے ناچ اٹھا لیکن شرم سے دوہری ہو گئی۔ اُس نے سچ مچ کی دلہن کی طرح جلدی سے گھونگھٹ کھینچ لیا اور بھولی لیلا کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔

کمار سب کو چھوڑ کر سیدھا ماں کے کمرے میں پہنچا اور راماین اُن کو دیتا ہوا ہنس کر بولا "لو ماں ——— اب تمہیں صرف راماین ہی پڑھنا رہ بھی جائے گا۔ گرہستی تو بھابی سنبھال لیں گی؟" پھر ماں کا استعجاب دُور کرنے کیلئے اُس نے ساری باتیں انہیں سمجھا دیں۔

ماں بڑے بیٹے کی زندگی سدھرنے کے خیال سے خوش تو ہو ہی گئی تھیں۔ جب باہر نکل کر انہوں نے ریکھا کو دیکھا تو اُن کا دل خوشی سے بھر گیا۔ جیسے اُن کے تصوّر کی بہو مجسّم ہو کر سامنے آگئی ہو۔

"ماتا جی پرنام" کہہ کر ریکھا اُن کے پیر چھونے کے لئے جھکنے ہی والی تھی کہ انہوں نے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بھر بھرے ہوئے گلے سے بولیں "پرم سوبھاگیہ وتی رہو بیٹی!" ——— اور اُسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ریکھا کے بھائی کی سمجھ میں اب تک یہ معمّہ نہیں آ رہا تھا وہ گھبرایا ہوا سا سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کمل کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے اور کھو سا گیا۔ اُس کے پردۂ تخیّل پر دو برس پہلے کے واقعات اُبھر آئے۔ لیکن اُس وقت غصّے کے بجائے اُسے ایک طرح کا اطمینان ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے جس بوجھ کے ڈھونے کے خیال سے وہ اب تک پریشان تھا، اُسے خود کسی نے اُتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

کمل کا یہ حال تھا کہ اُس کے پاؤں جہاں تھے وہیں جم گئے تھے ——— آنکھیں ریکھا کے بھائی پر لگی ہوئی تھیں اور بہت کوشش کرنے پر جوں ہی اُس کے مُنہ سے نکلا "آپ ———؟"

ماں کے کمرے سے کمار نکلتا ہوا بولا "جی - آپ ہی نہیں اور بھی ہیں! بھیا چل کر دیکھ لو میں نے تو لیلا کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذرا تم دیکھ کر بتاؤ کہاں تک کامیاب ہوا ہوں!" اور اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ماں کے کمرے میں لے گیا۔

کمار اب بھی اکثر بھابی کی بجائے ریکھا کو "فرمائش" کہہ کر چھیڑا کرتا ہے اور وہ مسکرا دیتی ہے۔

سری متوالا کی ہندی کہانی سے اخذ

معضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ حاشیہ چھوڑ کر لکھا کریں اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمہ پر لفظ غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں، اور یہ بے حد نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمہ پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ پتہ: ایڈیٹر رسالہ "بیسویں صدی" دہلی کافی ہے۔

اُن کی آمد پر

از
جناب نازش پرتاب گڑھی

پردیس سے وہ لوٹ کے آئیں گے گھر کو آج
سب رنگ و بُو سمیٹ کے گلشن سے لاؤں گی
سو سو طرح سے خانۂ ویراں سجاؤں گی

قوس و قزح کے رنگ سے رنگوں گی بام و در
بے تاب بجلیوں سے میں دیپک جلاؤں گی
لاؤں گی آج شیشۂ مہتاب چھین کر
بزمِ فلک سے ساغرِ انجم منگاؤں گی!
تارِ نفس سے گوندھ کے لاؤں گی ایک ہار
پھولوں سے آنسوؤں کے، میں گجرا بناؤں گی
شبنم کی آرسی میں جو دیکھوں گی میں جمال
اپنی ادا پہ آپ ہی میں جھوم جاؤں گی
جس وقت جھونپڑے میں قدم "اُن" کے آئیں گے
ناچوں گی اور ناچ کے اک گیت گاؤں گی
ہو گی نصیب دولتِ دیدار جس گھڑی
خود کو بھی فرطِ شوق سے میں بھول جاؤں گی
کردوں گی میں نثار یہ گل ہائے اشکِ سُرخ
"اُن" کی نظر سے کوئی اشارا جو پاؤں گی
جب مائلِ نیاز "وہ" ہوں گے تو اے سکھی!
روٹھوں گی میں کبھی تو کبھی مان جاؤں گی
پلکوں پہ لے کے گوہرِ خوشش تاب آؤں گی
ہاتھوں پہ رکھ کے دِل کو بھی نذر لاؤں گی

پردیس سے وہ لوٹ کے آئیں گے گھر کو آج

دستک

افسانہ

از

جناب شمس مظفرپوری

ایسی ہی ایک رات تھی، خاموش اور چاندنی میں نہائی ہوئی۔ یہ آج سے ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ سارا گاؤں سو چکا تھا۔ میں اپنے مکان کی انگنائی میں لیٹا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ آسمان کا رنگ بالکل صاف تھا۔ اُس کی نیلی پیشانی پر چودھویں کا چاند جھومر کی طرح دمک رہا تھا۔ آدھی رات جا چکی تھی۔ بوڑھا پڑوسی رہ رہ کے کھانسنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی کہیں سے کُتّے کے بھونکنے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں گاؤں کے کُتّے خاموش رہ کر آرام کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اندھیری راتوں میں چور چکار سے گاؤں والوں کو خبردار رکھنے کے لئے اُنہیں پہرہ دینا پڑتا ہے۔

صُبح مجھے پردیس جانا تھا۔ اِس لئے وہ رات میرے لئے بہت قیمتی تھی۔ میرا ننّھا بھائی جس سے میں بے حد محبّت کرتا ہوں، باتیں باتیں کرتے کرتے میرے پاس ہی سو گیا تھا۔ میری بیوی اب تک جاگ رہی تھی۔ آج اُسے جاگنا ہی چاہیئے تھا۔ گاؤں کی بیویاں پردیس جانے والے شوہر پر معمول سے زیادہ مہربان ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کی محبّت میں اتنی جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بات بات میں آنسو بھر لاتی ہیں۔ اور پل پل میں اُن کا دِل اتھل پتھل ہو جاتا ہے۔ پھر میری بیوی تو بہت ہی جذباتی ہے۔ اُسے تو جیسے محبّت کا دورہ پڑنے لگتا ہے ایسے موقعے پر۔ لیکن جب سے اُس کی گود بھر گئی ہے، وہ اِس بات کو شدّت سے محسوس کرنے لگی ہے کہ میرے ساتھ اُس کی گرمجوشیاں کم ہو گئی ہیں۔ اُسے مجھ سے اِس قدر پیار ہے کہ اگر اُس کے بس میں ہوتا تو وہ سارے زمانے کا پیار چھین کر مجھ پر نچھاور کر دیتی۔ لیکن آج اُس کا پیار اندر ہی اندر گھُٹ رہا تھا۔ شام سے ہی بچّے کو بُخار آ گیا تھا۔ آج تو خیر بُخار کا بہانہ تھا۔ ورنہ ویسے بھی اُس نے ایسے ضدّی اور سرکش بچّے کو جنم دیا ہے کہ ہر وقت ناک میں دم کئے رکھتا ہے۔ بچّے سے محبّت تو اتنی کہ بس چلے تو سینے میں سمو لے۔ لیکن جب اُس کے رونے اور مچلنے سے زچ ہو جاتی ہے تو جھنجھوڑ کر زمین پر پھینک دیتی ہے۔ آج بچّے نے بھی رونے اور نہ سونے کی قسم کھالی تھی۔ وہ بستر سے الگ ہوتی نہیں کہ بچّے نے رونا شروع کر دیا۔ جو عورت اپنے بچّے اور شوہر دونوں سے انتہا پسندانہ محبّت کرتی ہو۔ اُس کی جان کبھی کبھی کیسی مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔ مجھے رہ رہ کے اپنی بیوی پر ترس آ رہا تھا۔ اِس وقت جو جذبہ اُسے بیقرار کئے ہوئے تھا مجھے اِس کا احساس تھا۔ وہ ضرور سوچ رہی ہوگی کہ اگر آج کی رات وہ اپنی محبّتوں کا اظہار نہ کر سکی تو نہ جانے میں اُس کے بارے میں کیا خیال لے کر پردیس جاؤں گا۔ معلوم نہیں پردیسی سے لوگ اِس قدر محبّت کیوں کرنے لگتے ہیں؟ اور گاؤں میں تو جس کی طرف کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا ہو وہ بھی جب پردیس جانے لگتا ہے تو لوگ بڑی محبّت سے پیش آتے ہیں۔ پردیسی بننے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔

میری بیوی بدستور اپنے لاڈلے اور سرکش بچّے کو تھپکیاں دے رہی تھی اور بچّوں کی آنکھ مچولی کھیلنے والی نِندیا کو بُلانے کے لئے کوئی گیت گُنگُنا رہی تھی۔ کوئی ادھورا اور ٹوٹا پھوٹا گیت، کیونکہ میری بیوی کی آواز میں تو پنجاب کے گیتوں کی کھنک اور بنگال کے نغموں کا رس ہے، لیکن اُسے گانے سے شوق نہیں۔ اِس وقت میں اپنی بیوی ہی کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ شاید یہ کہ اگر اتنی بھولی اور سیدھی عورت کسی اکھّڑ اور تُند مزاج مرد کے پالے پڑ جاتی تو بچاری کا کیا حال ہوتا؟ میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوں۔ گاؤں میں بھی میرا رہن سہن شہریوں جیسا ہے۔ کبھی کبھی اونچے قسم کے شہری مجھ سے ملنے میرے گاؤں آجایا کرتے ہیں اور میں خود بھی مُلک کے بڑے بڑے شہروں میں گھوما پھرا ہوں۔ لیکن میری بیوی شہری اصطلاح میں گنوار ہے۔ پڑھنا لکھنا اُسے بالکل نہیں آتا۔ گو وہ میری کتابوں کا احترام بھی مجھ سے کم نہیں کرتی۔ لباس اور آرائش کے نئے پُرانے فیشن سے بالکل ناآگاہ۔ پھر بھی میں اُسے کبھی احساسِ کمتری میں مُبتلا ہونے نہیں دیتا۔ نہ اپنے شہری پن کو اُس کے دیہاتی پن پر ترجیح دیتا ہوں اور نہ اپنے پڑھے لکھے ہونے کا اُس پر رعب ڈالتا ہوں۔ بلکہ میں اُس کے ساتھ اِس طرح پیش آتا ہوں، گویا میں اُس کا شوہر نہیں، عاشق ہوں۔

شاید میری ان ہی باتوں نے اُسے اس قدر موہ لیا ہے۔ عورت جب اچھی ہونے پر آتی ہے تو کتنی اچھی ہو جاتی ہے۔

میں اپنے پڑھے لکھے بے تکلف دوستوں میں گاہے گاہے اُسے اندھی گونگی اور بہری کہا کرتا ہوں۔ لیکن میرے کہنے میں کسی بیزاری یا تحقیر کا پہلو نہیں ہوتا، بلکہ محض اُس کی سادگی اور معصومیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ ایک بار میرے ایک دوست نے جو اُس کا رشتہ دار بھی ہے، از راہ مذاق میری یہ بات اُس کے کان میں ڈال دی اور اُسے غلط سلط مطلب سمجھا کر بدگمان کر دیا۔ وہ کئی روز تک چُپ چاپ رہی اور عجیب بے چارگی و کمتری کے انداز میں مجھ سے پیش آتی رہی۔ وہ جذباتی ضرور ہے، لیکن شکوے شکایت کی بات آسانی سے زبان پر نہیں لاتی۔ اور جب میری اُس کی کوئی بات ہو تب تو وہ اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ جہاں چاندنی میلی ہوئی اور میں سمجھ جاتا ہوں کہ چاند پر ابر آگیا ہے۔ جہاں جبین پر شکن پڑی اور میں یقین کر لیتا ہوں کہ شیشے میں بال آگیا ہے۔ اُسے مجھ سے یہی توقع رہتی ہے کہ کھوئی کھوئی طبیعت اور اُمڈی اُمڈی آنکھوں کا حال میں خود ہی پوچھ لوں گا۔ اور اُس کی یہ توقع ہمیشہ پوری ہوتی ہے۔ اور جب اس بار میں نے "چُپ" اور اُداسی کی سراغ رسی کی تو وہ عادت کے مطابق آنکھوں کو جل تھل کر کے بولی "آپ میرا مذاق اُڑاتے ہیں دوستوں میں۔ میں تو گلے کا ڈھول ہوں۔ پھرتے آیئے ناکہیں سے میم اپنے لئے ——— سب دکھاوے کی باتیں ہیں ———"

میں کانپ ہی تو گیا، اُس کی بھری ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر۔ کم بخت دوست کے بچّے کو کیا معلوم کہ اس عورت کے احساسات کتنے نازک اور لطیف ہیں۔ وہ تو بالکل ایسی ہے کہ اِدھر نظر لگی اُدھر میلی ہوئی۔ ایسی عورت کے دل میں بدگمانی جتنی جلدی گھر کرتی ہے، اُتنی ہی دیر سے جاتی ہے۔ پُورے دو گھنٹے تک امرت کے گھونٹ پلانے پڑے۔ تب جا کر کہیں اس زہر کا اثر زائل ہوا۔

میری بیوی کی گنگناہٹیں ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید گنگناتے گنگناتے خود بھی سو گئی، اچھا ہے۔ بچاری کب سے پریشان تھی نٹ کھٹ بچّے کے مارے۔ آج اُس نے نیا سنگھار حذب کیا تھا۔ یہ اُس کی عادت ہے۔ جس دن میں کہیں جاتا ہوں، یا کہیں سے آتا ہوں اُس دن وہ اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنتی ہے، ہر طرح کی سج دھج کرتی ہے۔ یہ بات جیسا کہ مجھے یقین ہے، اُس نے بڑی بوڑھیوں سے سیکھی ہے۔ اُس دن تو اُس کا رنگ رُوپ چوتھی نہانے والی دُلہنوں کی طرح نکھر جاتا ہے۔ اور میں اُسے بڑی عاشقانہ نظروں سے دیکھا کرتا ہوں۔ آج اُس نے شام کو پان بھی کھایا تھا۔ وہ پان کبھی نہیں کھاتی اور جب کھاتی ہے تو بڑا بھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے ہونٹ خون کی طرح دمک اُٹھتے ہیں۔ بچّے کی اچانک علالت نے سارے رنگ رس کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ بچاری ذرا دیر بیٹھ کر بات بھی تو نہ کر سکی مجھ سے۔ وہ سمجھ رہی ہو گی کہ اُس کا رُوپ سنگار اکارت گیا، لیکن اُسے کیا معلوم کہ میری نگاہیں اُس کے ایک ایک سنگار کی داد دے چکی تھیں۔ یوں تو وہ نہارنے کی کم اور محسوس کرنے کی زیادہ ہے۔

اچانک پیچھے سے نرم اور شرمیلی آواز آئی۔

"سو گئے آپ؟"

میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہ میرے سرہانے کھڑی عجیب ادا سے ساڑی کا آنچل مسل رہی تھی۔ ہوا کی ایک نازک لہر اُس کے بالوں سے چنبیلی کی خوشبو چُرا کر میری سانس میں گھول گئی۔

میں نے کہا "بھلا آپ جاگ رہی ہوں اور غلام سو جائے"۔

وہ ہنس پڑی اور جیسے اُس کا آنچل موتیے کے پھولوں سے بھر گیا۔ میرے ایک فقرے نے اُسے نہال کر دیا۔ وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میرے بالوں سے کھیلنے لگی، جو چاندنی میں چمک رہے تھے۔ پھر وہ اپنے مخصوص لجیلے پن کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ بڑی سادی سادی باتیں بچوّں جیسی۔ بڑی گھلاوٹ ہے اُس کی آواز میں۔ اُس وقت تو وہ مجھے پُرانے زمانے کے قصّے کہانیوں والی عورت معلوم ہو رہی تھی۔

رات ختم ہو گئی۔ باتیں ختم نہ ہو سکیں۔ وہ آنکھوں میں نیند کا خمار لئے چائے بنانے لگ گئی۔ اور میں سامانِ سفر درست کرنے لگا۔ ناشتہ اور چائے کے بعد میں بہت دیر تک گھر کے بچّوں کو پیار کرتا رہا۔ باہر بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ سامان لد چکا تھا۔ میں نے باپ کی آنکھوں میں ایک المیہ سکوت اور چہرے پر ملال پایا۔ میری دو بہنیں سائبان میں میری طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھیں۔ اِن لڑکیوں کو بھائی کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ اِن کے سارے گیت بھائی کی محبّتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اِن کی آنکھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی تھیں ——— "بھیّا! ہمارے لئے تمہاری انگنائی تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ اب کے واپس آ کر ہمارے ہاتھوں میں مہندی ضرور لگوا دینا"۔ اور میری نگاہیں جیسے یہ کہہ کر جھک گئیں ——— "اچھا، اچھا! پنچھیو، اپنی سہیلیوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے گیت یاد کر لیں۔ اب کے ساون میں یہ حویلی گیتوں سے ضرور گونجے گی۔ اِس انگنائی سے گیت اور قہقہوں کا چشمہ ضرور پھوٹے گا۔

—— ضرور ——" اور اُسی دم میں ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میری نگاہ بیوی کی طرف اُٹھی جو چوکھٹ پر کھڑی کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی محبت اُس کے دل سے چھلک کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ رات اُس نے کہا تھا "لوگ پردیس جا کر کتنے کٹھور اور نرموہی ہو جاتے ہیں! ——" پھر میری آنکھوں نے کسی اور کو ڈھونڈا —— میری ماں۔ لیکن وہ تو مر چکی تھی اُس کی جگہ میری پھوپھی کھڑی تھی۔ جس نے اپنے سوتوں کا دودھ پلا پلا کر مجھے پالا تھا۔ بہت مشفق، بہت مہربان، بالکل ماں کی طرح۔ میرا دل بھر آیا۔ پھوپھی نے آگے بڑھ کر بلائیں لیں اور پیشانی چومی۔ میں نے جب دروازے کی طرف قدم اُٹھایا تو چپکے سے بولی "دیکھ لیا ہے نا اپنی بہنوں کو! پرایا دھن ہو چکی ہیں۔ بھائی برادری اور رنڈوے پڑوس میں چرچے ہیں" اور میں نے مسکرا کر جواب دیا "ہاں ہاں، دیکھ لیا ہے میں نے۔ سُن لیا ہے میں نے"

جب بیل گاڑی چل پڑی تو باپ نے لپک کر کہا "بیٹا لگان کی تاریخ سر پر آ گئی ہے۔ جاتے ہی انتظام کر دینا۔ بھولنا نہیں۔ بس جاتے ہی —— "

اور میں نے جواب دینا چاہا تو میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

گاڑی گاؤں کے اونچے نیچے مکانوں سے نکل کر کھیتوں میں آ گئی پھر قبرستان آیا۔ یہاں گاؤں کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے یہ سرحد زندگی اور موت کا سنگم ہو۔ ہاں، یہاں سے موت ہی تو شروع ہوتی ہے۔ زندگی کی رونقیں اور شادابیاں قبرستان کے اُس پار رہی تو رہ جاتی ہیں۔ جب میں پردیس کو نکلتا ہوں۔ باپ، بیوی، بچّہ، بھائی بہن اور پھوپھی۔ کھیت، باغ اور مویشی۔ اور گاؤں کے کبھی نہ ختم ہونے والے رشتے ناتے۔ بس یہی تو کائنات ہے میری زندگی کی۔ یہاں سب کچھ ہے میرے لئے۔ صرف ایک چیز نہیں ہے۔ روپیہ ——! اور اسی کے لئے میں دیس بدیس مارا پھرتا ہوں روپیہ سب سے بڑا ہے۔ اگر کتابوں میں لکھی ہوئی جنّت زمین پر ہوتی تو اُس میں بھی سب سے بڑا روپیہ ہوتا۔ کس نے ایجاد کیا تھا روپیہ! جہاں سے روپیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے وہیں سے انسانیت کے جسم میں زہر کی پہلی بوند داخل ہوتی ہے۔

گاڑی چلی جا رہی تھی، ریتلی سڑک کے ناہموار سینے پر دو گہری لکیریں کھینچتی ہوئی۔ پہیّے کا ہر چکر مجھے مسرّتوں سے دُور اور دُکھ درد سے قریب کر رہا تھا۔ دوسرے گاؤں کا پہلا مکان علاقے کے سب سے بڑے ساہوکار کا ہے۔ دوہرے بدن اور مکّار آنکھوں والا ساہوکار۔ جس کے گوشت پر سوّر سے بھی زیادہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور جس کے چہرے پر خون ہی خون جھلکتا ہے۔ یہ خون نمناؤں کا ست نہیں۔ اس کی خوراک ہی خون ہے جس طرح ماہی گیر اپنا جال پھینکتا ہے۔ اسی طرح اُس نے بھی سارے علاقے پر اپنا جال پھینک رکھا ہے۔ وہ ڈوری کھینچتا رہتا ہے۔ سونے اور چاندی کے ٹکڑے سارے علاقے کی خوشیاں، ور راحتیں اُس کے مکان میں سمیٹ سمیٹ کر لاتے رہتے ہیں۔ یہ مکان بہت مستحکم ہے۔ اس کی چھتوں اور دیواروں میں آہنی سلاخیں بچھی ہوئی ہیں اور اس کی بنیاد میں سونا پگھلایا گیا ہے۔ آندھی، برسات اور زلزلہ سب بیکار ہیں اس کے آگے۔ آندھی پھوس کے چھپّروں کو اُلٹ جاتی ہے۔ برسات مٹّی کی دیواروں کو گھلا گھلا کر ڈھا جاتی ہے۔ زلزلہ پھوس کے چھپّروں اور مٹّی کی دیواروں کو زیر و زبر کر جاتا ہے، لیکن یہ مکان اپنی جگہ پر صحیح سالم کھڑا رہتا ہے۔ رنگ و روغن پھیکا پڑ جاتا ہے تو قلعی کی نئی تہیں چڑھ جاتی ہیں۔ سرکی ہوئی اینٹیں جڑ جاتی ہیں اور پھٹی ہوئی دیوار مُند جاتی ہے۔

مجھے ساہوکار سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور میرے دماغ کی رگیں جیسے آگ کی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ التی پالتی مارے چبوترے پر ننگے بدن بیٹھا تھا۔ اس کے باپ نے میری دادی اور ماں کا ہار سنگار لوٹ کر اپنی دولت میں اضافہ کیا تھا اور اس نے میری بیوی کی آرائش و زیبائش چھین کر سونے کے ڈھیر کو اونچا کیا ہے۔ اگر اس کا بس ہوتا تو وہ تن کے لتّے بھی نوچ لیتا —— خود غرض! ہلکی اور تازہ دھوپ میں اُس کا جسم کُندن کی طرح دمک رہا تھا۔ چہرے کی سُرخی میں سونا پگھل رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میرے خیالات کا چکر پہیّے کے چکّر سے زیادہ تیز تھا۔ ایک چھوٹے سے گڑھے میں اٹک کر گاڑی زور سے ہچکولا کھا گئی۔ دماغ کو جھٹکا لگا اور خیالات کے آبگینے ٹوٹ گئے۔ تھوڑی دیر تک جذبات میں ہلچل رہی۔ "ڈسٹرکٹ بورڈ" کی اونچی اور کشادہ سڑک پر پہنچ کر ذرا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

سامنے سے دو راہگیر عورتیں تھکے تھکے قدم اُٹھاتی آ رہی تھیں۔ منہ اندھیرے گھر سے نکلی ہوں گی۔ کہیں دُور جانا ہوگا انہیں۔ جوان عورت کے سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی، اور ادھیڑ عورت کے ہاتھ میں ایک پوٹلی۔ جوان عورت کی مانگ سندور سے بھری ہوئی تھی اور چہرے پر تیل چپچپا رہا تھا۔ سندور سہاگ اور جوانی کی علامت ہے۔ اس لئے وہ سہاگن بھی تھی اور جوان بھی۔ کپڑے بوسیدہ سہی، رنگت میلی سہی، لیکن وہ اتنی ہی سہاگن تھی جتنی ساہوکار کی بیٹی اور بہو۔ لیکن اُس کا شوہر اُسے سونے کی

کٹوری میں دودھ نہیں پلاتا ہوگا۔ اُس کی چمکدار آنکھوں سے دل کی روشنی پھوٹ رہی تھی، اور ہلتے ہوئے ہونٹوں سے گیت برس رہا تھا۔ —— ایک ان دیکھی روشنی اور ایک ان سنا گیت۔ اُس کی ایک اجنبی سی نگاہ میری طرف اٹھی اور مرعوب ہو کر جھک گئی۔ بوڑھی عورت زور زور سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ گھر گرہستی کی باتیں۔ اُن کے کھردرے پاؤں کو نرم اور مرطوب ریت میں دھنستے دیکھ کر مجھے اپنے سینے میں گدگدی محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی بان نے ہلکے سُروں میں "بارہ ماسا" گانا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر، کیا دیکھ کر یکایک اُس کی طبیعت میں ترنگ آ گئی تھی۔ بڑی بھدّی اور بےسُری آواز تھی کم بخت کی۔ جی چاہا کہ منع کر دوں۔ پھر خیال آیا کہ کیوں اس کے ذوق کو مجروح کیا جائے۔ یہی تو چند تہہ خانے ہیں ان کی خوشیوں کے۔ جہاں تک ساہوکار کی سُرنگ نہیں پہنچ سکتی۔ ورنہ باقی سب کچھ موت ہی موت ہے ان کے لئے۔ میری طرح ان کا سرمایۂ مسرت بھی محدود ہے۔ بیوی کی مسکراہٹ۔ بھائی بہنوں کا پیار، باپ کی شفقت اور پھوپھی کی ہمدردیاں اور چند بےربط گنگناہٹیں۔ کبھی کبھی تو زندگی کے ان ٹوٹے پھوٹے سہاروں کی طرف سے بھی دل کھٹا ہو جاتا ہے اور موت پیاری محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن میں جھنجھلا کر پھر سنبھالا لیتا ہوں۔ موت شکست ہے۔ شکست کی تلخی زندگی کی تلخی سے زیادہ بدذائقہ ہے۔ امرت کی اوس پی کر زہر کا سمندر میٹھا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اُس کا زہریلا پن تو کم ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح زہر گھٹتا رہے گا امرت بڑھتا رہے گا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی دن امرت کے بادل ٹوٹ کر برس جائیں۔ میری کمزور زندگی کا مضبوط حوصلہ پھر موت کو للکارنے لگتا ہے۔

گاڑی تیسرے گاؤں سے نکل کر چوتھے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اسٹیشن تھا۔ گاڑی بان "بارہ ماسا" گاتے گاتے تھک کر چپ ہو چکا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف نگاہ کی آخری پہنچ تک دھان کے ہرے پودے لہلہا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ببول کے درخت کے نیچے ایک بکرے کو ذبح کر کے اُلٹا لٹکا دیا گیا تھا اور اُس کے قریب ہی ایک تندرست کتّا زمین پر بہے ہوئے گاڑھے خون کو بڑی رغبت سے چاٹ رہا تھا۔ کتّا کتنا خوبصورت اور صحت مند تھا! روئیں میں ہمواری اور چمک۔ جسم بھر پور اور موزوں۔ وہاں جو لوگ کھڑے تھے۔ اُن سب سے یہ کتّا زیادہ تندرست اور خوش منظر تھا۔ چند کمزور کتّے الگ کھڑے چمکتے ہوئے لہو کو للچائی نظر سے دیکھ رہے۔ ان کی ذرا سی حرکت پر بھی شہ زور کتّا دانت نکوس کر غرّانے لگتا تھا۔ یہ کتّا اس قدر تندرست اور خوبصورت اس لئے تھا کہ اُس نے مذبح میں پرورش پائی تھی۔ وہ صرف خون چاٹتا تھا۔ غذا دُن کا سَت۔ بالکل ساہوکار کی طرح۔ یہ دونوں خون پیتے تھے۔ ایک جانور کا دوسرا انسان کا۔ لیکن کہتے ہیں کہ مذبح کے کتّوں کی عمر تھوڑی ہوتی ہے۔ کیونکہ خون کی نامطلوب فراوانی سے ان کے پھیپھڑے سڑ جاتے ہیں۔ ساہوکار کے پھیپھڑے بھی سڑ جائیں گے۔ جو خون وہ سونے کی نلکی کے ذریعے کشید کرتا ہے، وہ صالح نہیں۔ اُس میں دُکھ درد کا زہر ہے۔

گاڑی بان نے اچانک للکارا بھر کر دونوں بیلوں کی دُم مروڑ دی۔ اور گاڑی ڈھلوانی ہوئی تیز بھاگنے لگی۔ میرے خیالات کے تانے بانے بھر اُلجھ گئے۔ میں نے پان کی پیک پھینک کر گاڑی بان سے کہا۔ "ابھی ٹرین آنے میں کافی دیر ہے۔ گھبراہٹ کاہے کی ہے؟"

گاڑی بان بولا۔ "یہ بات نہیں بابو صاحب۔ ذرا دیکھئے نا پچھم میں!"

میں نے نگاہ اُٹھائی تو کچھ ڈر سا گیا۔ کئی میل دُور جہاں کھیتوں کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ سیاہ گھنیری بدلیاں بڑی ہیبت ناک شکل لئے اُٹھ رہی تھیں۔ جیسے کالے بادلوں کے پہاڑ زمین سے آسمان کی طرف اُٹھ رہے ہوں۔ ہوا ساکت ہو گئی تھی اور پھیلتے ہوئے بادلوں کی آغوش میں طوفان امنڈ رہا تھا۔ ایک تاریکی پچھم سے پورب کی طرف لپک رہی تھی۔ دھوپ بھاگ رہی تھی اور تاریک سایہ اس کا تعاقب کر رہا تھا —— یہ باتیں مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے کل کی ہوں

گاڑی بان نے پوچھا۔ "آگے چلوں یا پیچھے موڑوں؟"

میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ آگے اسٹیشن تھا اور پیچھے گاؤں گاڑی بیچوں بیچ پھنس گئی تھی۔ طوفان تھا کہ اب آیا اور اب آیا۔ میں نے کہا۔ "طوفان سر پر آ گیا ہے۔ بس سامنے پُل پر گاڑی روک دو۔" اسی دم ہوا کا ایک تیز اور بےچین جھونکا دھان کے کھیتوں میں سرسراتا ہوا کہیں دُور جا کر ناپید ہو گیا۔

ابھی ہم پُل تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ طوفان نے ہمیں آ لیا۔ گاڑی بان نے بڑی تیزی سے جوتا اُتار دیا اور ہم دونوں پہیّے کی اوٹ میں دبک گئے۔ اُف کتنی گرج اور گونج تھی اس طوفان میں۔ جیسے فلک کے سینے میں صدیوں کا محبوس طوفان یکبارگی اپنا راستہ پا گیا ہو۔ سڑک کے کنارے تاڑ اور املی کے پیڑوں کو ہوا اس طرح مروڑ رہی تھی، جیسے یہ

جڑ سے اکھڑ کر فضا میں اُڑ جائیں گے۔ رفتہ رفتہ آندھی کا زور کم ہوا تو موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کی ریت کیچڑ بن گئی اور کھیتوں میں پانی گرنے کی گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔ بارش کے زور میں اتنا قہر و غضب تھا، جیسے ہمیشہ بے وقت برسنے والے بادل کھیتوں اور کسانوں سے انتقام لے رہے ہوں۔ بارش کے ساتھ ننھے ننھے اولے بھی پڑنے لگے۔ ہم دونوں سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگے تھے۔ ہاتھ پاؤں میں جھرجھریاں پڑگئی تھیں۔

ایک گھنٹہ کے بعد بارش تھم گئی۔ گاڑیبان بُری طرح کپکپا رہا تھا۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ "گھبراؤ نہیں۔ اسٹیشن پہنچ کر خوب گرم گرم چائے پئیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں چل کر کپڑے بدلیں گے۔"

گاڑی بان بولا۔ "بابو صاحب، گھر لوٹ چلئے۔ نہ جائیے۔ اب کے سفر کا شگون کچھ اچھا نہیں۔"

میں نے گیلی سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔ "یہ کوئی بات نہیں۔ میں نے زندگی میں کبھی قدم آگے بڑھا کر پیچھے نہیں ہٹایا، اور یہ طوفان! یہ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ میں سفر نہ کروں تب بھی آتے ہی رہیں گے۔"

میری شاعری تو گاڑی بان کی سمجھ میں کیا آئی ہوگی، لیکن میرا مطلب وہ ضرور سمجھ گیا اور خاموش ہوگیا۔

اسٹیشن پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں کپڑے بدلے گیلے کپڑوں اور بستر کو ہوا میں پھیلا دیا۔ پھر تین چار پیالیاں چائے کی پی گئیں۔ دوپہر تک تیز دھوپ نکل آئی۔ کپڑے اور بستر گیلے ہو جانے سے دوپہر کی ٹرین چھوڑ دینی پڑی۔ رات کی گاڑی سے روانہ ہوگیا۔

گھر کی جدائی بہت شاق گذر رہی تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ گھر چھوڑ کر پردیس جانا میرے لئے بہت ہی معمولی بات تھی۔ کسی نے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے میرے چہرے پر میل نہیں دیکھا تھا۔ میں تو بچپن سے ہی سفر اور پردیس کا عادی ہوں، لیکن اس بار میں اپنے آپ کو کچھ کمزور کمزور سا محسوس کر رہا تھا۔ یا تو گھر والوں سے زیادہ محبت ہوگئی تھی یا حوصلہ چھوٹ رہا تھا۔ آج میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب کے واپس آکر کہیں نہیں جاؤں گا۔ گاؤں کے آس پاس ہی معمولی روزگار کا کوئی دھندا کر لوں گا۔

ٹرین اُڑی جا رہی تھی۔ انجن اور پہیوں کا شور جیسے مجھے سمجھا رہا تھا کہ حرکت زندگی ہے، سکوت موت ہے۔ لوگ بڑی تنگی کے ساتھ گٹھ مٹھ ہو کر بیٹھے تھے۔ میری بنچ کے پرلے سرے پر ایک لڑکی بھینچ بھینچ کر آدھ مری ہوئی جا رہی تھی۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے کبھی اپنے بوڑھے ساتھی کو دیکھنے لگتی، اور کبھی دوسرے مسافروں کو۔ ایک آدھ اُچٹتی جھجکتی نگاہ میری طرف بھی آ جاتی تھی۔ مجھے تو اُس پر اتنا ترس آیا کہ پلکوں پر بٹھا لینے کو جی چاہا۔ لیکن اس وقت میری پلکوں سے زیادہ قابلِ قدر لکڑی کی سیٹ تھی جس کے صرف چند انچ میں وہ ربڑ کی طرح بھنچی ہوئی تھی۔ اُس کی شرمیلی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آگئی۔ پھر بیوی یاد آئی، پھر بھائی، پھر باپ —— پھر سارا گھر —— سارا گاؤں اور ساہوکار۔ اور پھر اگلے ساون کی رُت کا سماں نگاہوں میں پھرنے لگا۔ کھڑکی سے باہر ڈھلی ہوئی چاندنی میں نہ جانے میری آنکھوں نے کس طرح یہ دیکھ پایا کہ میری بہنیں اپنی کسی سہیلی سے سرگوشی کر رہی تھیں —— شاید یہ کہ اب ساون میں —— ہاں اب کے ساون میں ہماری حویلی گیت اور قہقہوں سے گونجے گی۔ اور حویلی کے پچھواڑے مہندی کا پیٹر لنڈمنڈ ہو جائے گی —— اور پھر جیسے سہیلی کی آنکھیں یہ سُن کر بھر آئیں۔

انہیں پریشان اور دُکھ بھرے خیالات میں سفر ختم ہو گیا۔ ایک دن اور دو راتوں کا تھکا دینے والا سفر۔ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہی کسی نے میرے کان میں کہا۔ "لگان کی تاریخ سر پر آگئی ہے۔" اور دوسرے کان میں کسی نے کہا۔ "بھائی برادری اور ٹولے پڑوس میں چرچے ہیں۔" میں تیزی سے لپک کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ تین چار منٹ کے بعد شہر میں داخل ہو گیا۔ گیتوں اور قہقہوں کی دُنیا میں۔ ہر طرف گیت اور قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے بھی اپنے گھر اور اپنی بہنوں کے لئے گیتوں کی چند تانیں اور قہقہوں کی چند لڑیاں خریدنی تھیں —— گیت اور قہقہے —— ذرا دیر کے لئے میرا دماغ گیت اور قہقہوں سے بھر گیا۔

—— اور آج پُورے ڈیڑھ سال کے بعد میں اپنے گاؤں واپس آیا ہوں۔ وہی گھر ہے، وہی انگنائی ہے، وہی پلنگ ہے، وہی بستر ہے، وہی رات اور وہی چاندنی ہے۔ ساون آیا تھا، گذر گیا۔ دوسرا ساون آیا، وہ بھی گذر گیا اور اب تیسرے ساون کا انتظار ہے۔ میری جھولی گیت اور قہقہوں کی اشرفیوں سے اب تک خالی ہے۔ میرا دل زخمی ہے اور دماغ سو گیا ہے۔ میری رُوح خون میں نہائی ہوئی ہے اور جذبات جھلس گئے ہیں۔ میں ایک سال تک آگ اور خون کی ندی میں تیر تا رہا ہوں۔ پہلے ملک غلام تھا اب آزاد ہو گیا ہے۔ پہلے گیت اور قہقہوں کا اجارہ انگریز کے پاس تھا۔ اب وہ ٹھیکہ ملک کے بڑے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔۔

انہوں نے تمام گیت اور قہقہوں کو اپنے محلوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اب تو ہر طرف موت کے راگ سنائی دیتے ہیں۔ جب ملک کے اونچے ایوانوں پر آزادی کا پرچم لہرایا گیا تھا اُس وقت بھی گیت اور قہقہے ناپید ہو چکے تھے۔ چیخیں اور کراہیں فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔ فرنگی جادوگر نے نہ جانے کونسا منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا کہ دانت کاٹی روٹی کھانے والے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ میں نے انسان کا لہو کتوں کو چاٹتے دیکھا ہے۔ میں نے انسان کی لاش گِدھوں کو نوچتے دیکھا ہے۔ میری آنکھوں نے شیرخوار بچوں کو دودھ کے قطروں اور پانی کے گھونٹ کو ترس ترس کر دم توڑتے دیکھا ہے۔ نسوانی حرمت و تقدّس کو شہوانیت کے مقتل پر تڑپتے دیکھا ہے۔ میں نے ہوا اور پانی میں خون کی بو سونگھی ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے کہیں بہتر یہ تھا کہ کسی کی چمچماتی ہوئی تلوار میرے سینے کے پار ہو جاتی۔ یہ ذرا دیر کی اذیّت ہے، لیکن جو کچھ میری یادداشت کو بچھو کا ڈنک بن کر ڈستا رہتا ہے وہ ایک مستقل درد ہے۔ روح کی مستقل پھانس ہے۔ ایک ایک دن میں کئی کئی بار مرتا ہوں۔ اب مرتے مرتے تھک گیا ہوں۔ میں اپنے ذہن پر سے موت کی پرچھائیں ہٹا کر زندگی کے نقش و نگار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں گھبرا کر اپنے گاؤں بھاگ آیا ہوں۔ ذرا یاد دھندلی پڑ جائے گی تو پھر کسی دیس نکل جاؤں گا —— گیت، قہقہوں اور نقش و نگار کی تلاش میں۔

میرا بچہ میرے سینے پر سو گیا ہے۔ میرا ننّھا بھائی سائبان میں اپنی بہنوں کے پاس سو رہا ہے۔ میرا بچہ جو ابھی صرف تین چار الفاظ کے فقرے بول سکتا ہے، سونے سے پہلے نہ جانے کیا کیا کہتا رہا ہے۔ وہ بالکل اپنی ماں کی طرح باتیں کرتا ہے۔ رک رک کر سوچ سوچ کر۔ آج شام کو وہ بہت رویا ہے۔ اُس کی کبوتر جیسی وحشی آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں۔ اُسے اپنی ماں یاد آگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اُس کی ماں مر گئی۔ آج سے کئی مہینے بیشتر وہ اچانک نہیں مر گئی۔ وہ تو آہستہ آہستہ، انچ بہ انچ موت کی دلدل میں دھنستی رہی۔ دریا کی لہریں ساحل کو کاٹتی رہیں۔ موت کی ریتی زندگی کی گردن پر چلتی رہی۔ اُس کا مرض اپنی دوا کا انتظار کرتا رہا۔ جس طرح میں اپنی بہنوئی کے لئے گیت اور قہقہے نہ خرید سکا، اُسی طرح میرا باپ اپنی بہو کے لئے آبِ حیات نہ لا سکا، لیکن مجھے تو وہ آج بھی زندہ محسوس ہوتی ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس مکان کے ایک ایک کونے سے اُس فرشتے کی مشکبو لپٹیں پھوٹ رہی ہیں۔ آج بھی ہوا کی کوئی نازک سی مہکی ہوئی لہر میری سانس میں گھل جاتی ہے۔ میں نے آج بھی اُسے البیلے پن کے ساتھ، ہنس کی طرح اس انگنائی میں چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر گئی۔ وہ کسی ان دیکھے دیس کو سدھار گئی۔

میں زیادہ دیر تک حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔ وہ مر چکی ہے۔ میرا بچہ بھی یہی کہتا تھا۔ اُسے گھر والوں نے بتایا تھا کہ تمہاری ماں تمہارے باپ کو بلانے چلی گئی ہے۔ لیکن آج ایک بہت بڑی حقیقت اُس کے ننھے سے دماغ میں بھی سما گئی۔ میری بیوی مر گئی، لیکن ساہوکار زندہ ہے۔ اُس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سُرخ اور صحت مند نظر آتا ہے۔ اُس نے اپنے مکان پر ایک اور منزل کھڑی کر لی ہے۔ لیکن انسانیت کے کرب اور سوز سے آسمان کی تہوں میں انگارے دہک اٹھے ہیں اور زمین کی چھاتی میں جوالا کھول رہی ہے۔ انگارے برسیں گے اور جوالا پھٹے گی۔ میرا دماغ ایک دھمک محسوس کر رہا ہے۔ اس دھمک کے پیچھے مجھے گیت اور قہقہوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ انسان کا ذہن بھی عجیب ہوتا ہے مجھے رہ رہ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری سانس گھٹ رہی ہے، میری نبض چھوٹ رہی ہے اور گلے میں ایک چیخ باہر نکلنے کے لئے جگر کاٹنے لگتی ہے۔ اُسی دم مجھے سنائی دیتا ہے، جیسے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے اور میں چونک پڑتا ہوں۔

(طبع زاد)

تم بھی آجاؤ

زلفِ شبگوں کو بصد انداز لہراتی ہوئی
مسکراتی گل جہاں پر کیف برساتی ہوئی
آئی ہے مشاطۂ شب رقص فرماتی ہوئی
چاندنی کے ساز پر کوئی غزل گاتی ہوئی
گنگناتی اور نظر سے پھول برساتی ہوئی — تم بھی آجاؤ مری خلوت کو مہکاتی ہوئی

ہر دھندلکا چاندنی کے فیض سے پر نور ہے
یہ جہانِ رنگ و بو نظروں میں مثلِ طور ہے
ان جواں لمحوں میں ہر شئے بیخود و مسرور ہے
ذرّہ ذرّہ اک خمارِ بیکراں میں چور ہے
مست آنکھوں سے پلا کر مجھ کو بہکاتی ہوئی — تم بھی آجاؤ مری خلوت کو مہکاتی ہوئی

یہ حسیں ماحول پھر یہ چاندنی راتیں کہاں
کیف و مستی میں نہلائی ہوئی راتیں کہاں
نور میں ڈوبی ہوئی پر کیف سی راتیں کہاں
اس قدر عنبر فشاں اور جنّتی راتیں کہاں
آئی ہے شب کی دلہن زلفوں کو لہراتی ہوئی — تم بھی آجاؤ مری خلوت کو مہکاتی ہوئی

ایسے دلکش اور حسیں لمحات پھر کب آئیں گے
ساتھ لے کر یہ منوّر رات پھر کب آئیں گے
یہ نشاط آگیں حسیں اوقات پھر کب آئیں گے
ہاتھ سے جاتے رہے گر، ہات پھر کب آئیں گے
زیرِ لب کچھ گنگناتی اور اٹھلاتی ہوئی — تم بھی آجاؤ مری خلوت کو مہکاتی ہوئی

از
جناب روشن نگینوی؛

بیوی بھی بہن بھی!

ایک مغربی شاہکار اردو لباس میں

از

از جناب شو راج

بھیانک اندھیرا۔ رات کا وقت۔ چاروں طرف سائیں سائیں کرتی ہوئی آوازیں موت کی طرح ڈراؤنی۔ آبادی سے بہت دُور، جہاں دن میں بھی ڈر لگے۔ ایک سنسان بن میں ایک جگہ بہت سی نئی، پرانی قبریں تھیں۔ مُردے حسب معمول قبروں سے نکل کر اپنی اپنی قبر کے پاس ہی بیٹھے تھے۔

مُردوں کا پنجر تو ضرور انسان کا سا معلوم ہوتا تھا، لیکن بہت دنوں تک قبر میں رہنے کے باعث اُن کا رنگ رُوپ صاف نہیں تھا بلکہ مٹی میں سنے ہوئے تھے سب۔ پتہ نہیں، اگر کوئی انہیں چھونے کی ہمت کر سکتا تو وہ اُن کے لمس کو کیسا محسوس کرتا۔ شاید سخت یا نرم، جیسے قبر کی تازہ مٹی، یا پھر ایسے جیسے ہوا کی شکل میں بدلی ہوئی برف۔ لیکن دیکھنے میں تو وہ ایسے دکھائی دیتے تھے، جیسے آگ میں جھلسی ہوئی لاشیں۔ جب کبھی وہ اپنے ہاتھ پیر ہلاتے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کچھ ہڈیاں آپس میں دھوئیں کے پتلے پتلے دھاگوں سے بندھی ہوئی ہوں۔ اُن کی ڈراؤنی کھوپڑیوں کے نیچے آنکھوں کے بھیانک حلقوں میں دو شعلے سے ہلتے معلوم ہوتے تھے اور اُن کی ناک میں خالی گڑھوں کے پاس ہونٹ بالکل غائب ہو چکے تھے۔ صرف کچھ بڑے بڑے دانت مسُوڑھوں کے سے باہر کو نکلے ہوئے یہ بتا رہے تھے کہ اس جگہ کبھی مُنہ تھا۔

یکایک ایک لاش، جو سب سے بھیانک ہنسی ہنستی تھی، عجیب مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف نظر پھینک کر بولی۔

"ایسے چپ چاپ کب تک بیٹھے رہو گے؟ کیا زندگی کی نیند کا اُس بھرا اثر ابھی تک باقی ہے کہ جاگنے کے بعد بھی ہمیشہ ستاتا رہتا ہے؟"

کسی نے پاس ہی سے کہا "کیا بک رہے ہو؟ زندگی تو ایک حماقت تھی اور اب اُس پر ہنسنے کا وقت ہے۔ تم تو اس دُنیا میں نو وارد ہو اور مُردوں کے دلی جذبات کو نہیں سمجھ سکتے!"

پہلا مُردہ قہقہہ لگاتا ہوا بولا "زندگی ایک حماقت! ہا۔ ہا۔ ہا! حماقت! ہا۔ ہا۔ ہا! ... خیر چھوڑو بھی اس بات کو، ہاں، آج آپ بیتی سُنانے کی کس کی باری ہے؟"

کسی نے کہا۔ "جان بوجھ کر ایسا سوال کر رہے ہو! زندگی میں تو جھوٹ بولتے ہی رہے، لیکن اب بھی تمہاری وہ عادت نہیں گئی۔۔۔۔ آج تمہاری ہی باری تو ہے۔"

قبر پر اچھی طرح بیٹھتے ہوئے بھیانک چہرے والے نئے مُردے نے کہا "اچھا، تو سُنو۔۔۔۔ لیکن میری زندگی کی حماقت پر اُس وقت تک نہ ہنسنا جب تک یہ کہانی ختم نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس میں جھوٹ کے ساتھ وہ چیز بھی ملی ہوئی ہے، جسے تم زندگی میں ٹیس اور آہ کہا کرتے تھے۔"

سب بولے۔ "ہمیں زندگی کے احساسات، خیالات اور جذبات کی یاد نہ دلاؤ۔ اُن کے یاد آنے سے اب ہمیں شرم آتی ہے۔"

نو وارد مُردہ بولا۔ "اچھا، یہ بھی نہ سہی۔ پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔"

"کیا؟"

"کیا تمہیں یاد ہے بیوی کسے کہتے ہیں؟"

کچھ دیر سکوت رہا۔ اگر مُردے سوچ سکتے ہوں، تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ سوچ رہے تھے، اور اُن کی سوکھی کھوپڑیوں میں سوچنے کی طاقت کھوپڑیوں سے ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔

کچھ منٹ بعد کوئی بولا۔ "بیوی؟۔۔۔۔ بیوی تو غالباً ایک عورت کا نام تھا۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہاں عورت، نوکروں کی طرح خدمت کرنے والی!"

"اور شیطان کی طرح بہکانے والی!" ایک نے کہا۔

"نہیں، دیوی کی طرح عقیدت کی سزاوار!"

"ابلا!" آواز آئی کسی کی۔

"اجی نہیں۔ اپنی ہٹ میں پہاڑ کی طرح اٹل!"

"یہ حقیقت ہے۔ لیکن دنیا بھر میں سب سے زیادہ دُکھیا، درد کی ماری، ظلم سے نڈھال!"

"ایک خوبصورت پھول جسے صرف مسلنے کے لئے توڑا جاتا ہے"

"اور....."

"بس بس" نئے مُردے نے اپنے سوکھے ہوئے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے ذرا زور سے کہا۔ معلوم ہوگیا کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ سنو، میں بتاتا ہوں۔ بیوی کہتے ہیں اُس عورت کو جو دھرم اور سماج سے تمہیں جیون ساتھی کے رُوپ میں ملی تھی، اور جو تم سے پہلے مرگئی یا ابھی زندہ ہے"

سب مُردے غور سے سُنتے رہے۔

نووارد نے پھر کہا۔ اور شاید تمہیں یہ بھی ضرور یاد ہوگا کہ بہن کسے کہتے ہیں"

سب ایک ساتھ بولے۔ ہاں، ہاں بہن کو ہم سب جانتے ہیں۔ تم اور آگے کہو"

پہلا مردہ بولا۔ بس ایک سوال باقی ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تم کسی عورت کو بیوی بھی کہو اور بہن بھی"

"کیا پاگل ہوگئے ہو؟" سب نے کہا۔

"نہیں، نہیں" وہی پہلا نووارد مُردہ بولا "مرنے کے بعد کوئی پاگل نہیں ہوتا۔ ہاں، زندگی میں تمہاری طرح میں بھی اپنے آپ کو کبھی کبھی پاگل سمجھنے لگتا تھا۔ زمین اور آسمان کی طرح بیوی اور بہن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور کوئی بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی انہیں ایک کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا، لیکن آپ اسے چاہے میری حماقت کہیں یا پاگل پن، میں نے کملا کو ایک ہی وقت میں بیوی اور بہن بنا رکھا تھا۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے یہ عجیب رشتہ کچھ اس طرح پیدا ہوا کہ اُس وقت کی دُکھ بھری باتوں میں بھی ایک خاص طرح کا لُطف پنہاں ہے۔

میری عمر تیس سال کی تھی۔ جوانی کے دن تھے۔ دِل میں جذبات کی آندھی، طوفان اُٹھنے کا زمانہ تھا، لیکن میں فلسفی تھا، فلاسفر! جس کی جوانی کے متعلق بہت کم لوگ ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اُمنگیں تھیں، جوش تھا میرے دِل میں بھی اور فلاسفی کے ریگستان میں بھی حُسن میرے لئے ایک دلچسپ موضوع تھا لیکن اس حد تک کہ میری تیز نظر دُور ہی سے اُسے دیکھتی رہے، بس۔

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورت ایک سمجھ میں نہ آنے والا معمہ اور ان بوجھی پہیلی ہے اور یہ قول ایسے ایسے فاضل لوگوں کا تھا جن کے بارے میں خواب میں بھی غلط کہنے کا خیال نہیں ہوسکتا، پھر بھی ایک جوان فلسفی کے دِل میں یہ پیدا ہوجانا غیر فطری نہ تھا کہ کسی طرح عورت نام کے سمندر کی تہ کا پتہ لگایا جائے، اور عمیق مطالعہ کرکے اس پر ریسرچ کی جائے۔

بس اسی خواہش کی تحریک سے میں اکثر ایسی جگہوں میں جانے لگا، جہاں عورتیں زیادہ تعداد میں آیا جایا کرتی تھیں۔ پارک، باغ، میلے —— ایسی ہی اور جگہیں۔

اُن دِنوں میری نظر ایک خوبصورت پارک پر لگی تھی۔ وہاں نوخیز لڑکیاں اور جوان عورتیں بہت آتی تھیں۔ جن میں زیادہ تر وہ آوارہ عورتیں ہوتی تھیں، جن کا مقصد اپنی خوبصورتی کو بیچ کر، حُسن کا سودا کرکے زندگی گذارنا ہوتا تھا۔ یہ پارک ہی ایک ایسی جگہ تھی، جہاں مجھے عورت کی فطرت کا مطالعہ کرنے کا موقعہ مِل سکتا تھا"

ایک مُردہ بول اُٹھا "آپ کس شہر کی بات کہہ رہے ہیں؟" اور پھر زور سے قہقہہ لگایا۔

پہلا مُردہ ہنس کر بولا "خوب! تم غالباً ولایتی کالے صاحب ہو، اور اگر گورے ہو تو ہندوستان میں۔ میں تو فلاسفر تھا اور اب بھی ہوں، لیکن تم تو ایسی بات نہ کہو۔ خیر، یہ واقعہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، بمبئی کا ہے۔ بمبئی کا..... کبھی بمبئی دیکھا بھی ہے؟"

"..... سُنا تو بہت ہوگا بمبئی کے بارے میں۔ سبھی جگہ کے عورت مرد وہاں ملتے ہیں"

"ہاں، تو ایک شام کو حسبِ معمول میں وہاں گیا۔ چاروں طرف رنگ برنگی ساڑیاں پہنے جوان عورتیں تتلیوں کی طرح اُڑتی پھر رہی تھیں اور پیار کسیں ہر طرف مترنم آوازیں گونج رہی تھیں۔ جوان مُسکراہٹیں فضا کو مُسکرانا سکھا رہی تھیں۔

میں نے پارک کے ایک کونے میں ایک جوان لڑکی کچھ سہمی ہوئی، ڈھی سی، فکرمند سی کھڑی دیکھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ کیوں ایسی جگہ، ایسے کپڑے پہن کر آئی ہے۔ اُس کے کپڑے مَیلے اور گندے تھے۔ اور وہ دیکھنے میں بھکارن معلوم ہوتی تھی، لیکن یہ جگہ تو بھکارن کے لئے نہ تھی۔ میں اُس کی طرف کچھ بڑھا اور اُس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ شباب اور جوانی کی گلابی رنگت کی جگہ اُس کے چہرے پر زردی اور اُداسی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں خوف، دُکھ اور چنتا کی پرچھائیاں تھیں۔ بال لمبے اور سیاہ تھے، لیکن تیل اور خوشبو سے محروم۔ پاؤں میں پھٹے ہوئے سلیپر اور ہاتھوں میں صرف ایک دو سادی کانچ کی چوڑیاں تھیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ ہے کون، یہاں کیوں آئی ہے۔ شاید بھیک مانگنے یا کہیں پاگل تو نہیں ہے؟ سوچتے سوچتے میں اُس کے پاس پہنچ گیا۔

اور جب اُس نے مجھ سے آنکھیں چار کیں، تو میں نے دیکھا، اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ چہرے پر عجیب گھبراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں اضطراب آمیز چنچلتا۔ میں نے سوچا، واپس چلا جاؤں، لیکن اُس کی دردناک قابلِ رحم حالت نے میرے قدموں کو باندھ سا دیا۔ ایک لمحہ کے بعد میں اُس کے پاس کھڑا تھا۔ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ پھر بھی کسی طرح پوچھا "تم کون ہو؟"

غالباً اُسے ایسے سوال کی امید نہ تھی۔ وہ چونک پڑی اور میری صورت دیکھ کر کچھ سٹپٹا سی گئی۔

میں نے پھر پوچھا "تم کون ہو......؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

جواب میں اُس کے ہونٹ کچھ ہلے، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ الفاظ آواز آنے سے پہلے ہی غائب ہو گئے۔

میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا "بولتیں کیوں نہیں تم؟"

اُس نے آنکھیں جھکا کر کانپتی ہوئی آواز میں مشکل سے کہا "یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اِس پارک میں عورتیں کس غرض سے آتی ہیں؟ ..... سیر و تفریح اور دل بہلانا سب کا مقصد ہوتا ہے، طریقے البتہ الگ الگ ہیں۔"

"یہ سب میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چُپ رہی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنا اصل راز بتانا نہیں چاہتی یا بتانے میں خوف محسوس کر رہی ہے۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اُسے بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے ایک قدم اُٹھایا، اور پھر کھڑی ہو گئی۔

"ڈرو نہیں، میں تمہارے کام آ سکتا ہوں ـــ" میں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

ہم دونوں کچھ دُور آگے بڑھے اور ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ اُس طرف آس پاس کوئی نہ تھا۔ سیر کرنے والے دوسری طرف ایک بازیگر کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے اِس بار اُسے گہری نظر سے دیکھا۔ وہ خوبصورت تھی۔ لیکن اُس کی شرمیلی آنکھوں اور جھکے ہوئے سر سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے اپنی خوبصورتی سے یہ بُرا کام لینے کا اِس سے پہلے کبھی موقع نہ آیا تھا۔ میں نے بہت نرمی سے اُس سے پھر وہی سوال کیا "اب بتاؤ تم کون ہو اور وہاں اس طرح کیوں کھڑی تھیں؟"

"میں ایک غریب لڑکی ہوں" وہ بولی۔ "اور میں یہاں......" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

میں نے ٹوکا "چُپ کیوں ہو گئیں؟ .... کہو، کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔"

"جھوٹ، تم اور کچھ بھی کہنا چاہتی تھیں۔"

"نہیں۔" وہ مُنہ پھیر کر بولی۔

میں ذرا کچھ ناراض ہو کر کہنے لگا "دیکھو میں سمجھتا ہوں کہ تم بے سبب یہاں نہیں آئیں۔ تم ایک اچھے چال چلن کی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ تم ابھی لڑکی ہو، عورت نہیں۔ ضرور تم یہاں کسی غرض سے آئی ہو۔"

"مجھے جانے دیجیے۔" اُس نے سہمی ہوئی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھ کر کہا۔ وہ اپنے راز کو ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی۔

میں نے کہا "تم جا سکتی ہو۔ میں تمہیں کیوں روکنے لگا؟ لیکن اگر اِس جگہ تمہارے آنے کا مقصد ایسا ہو، جس میں ایک بھلا آدمی تمہاری مدد کر سکے، تو کہو۔"

وہ چُپ رہی، جیسے کسی گہرے سوچ میں کھوئی ہوئی ہو۔ پھر یکایک میں نے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے پہلی بار میری طرف پُوری نظر سے دیکھا۔ اور آنسو کے دو قطرے اُس کے زرد گالوں پر ہوتے ہوئے کپڑوں میں غائب ہو گئے۔ جیسے موتی ریت میں گر گئے ہوں۔ میں بہت جذباتی ہوں۔ ہوں کیا، تھا۔ میں نے پوچھا "روتی کیوں ہو؟"

"میری ماں بیمار ہے۔ لوگ کہتے ہیں، وہ مر رہی ہے، اور مجھے بھیک بھی نہیں مل سکتی۔" اُس نے کہا۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"میں اُس کے لئے دوا لینے آئی تھی۔"

"دوا؟ یہاں پارک میں؟"

"جی، جی..... لڑکی گھبرا کر بولی۔

"غالباً تمہیں کچھ خوف ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔ پھر ایک لمحہ چُپ رہنے کے بعد اُس نے کہا "میری ماں بوڑھی ہیں۔ اور بسترِ مرگ پر پڑی ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی تین وقت سے بھوکا ہے۔"

"اور..... اور..... تمہارے باپ؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"میری ماں بیوہ ہیں۔"

"اوہ!" میں نے کہا۔ "اب میں سمجھ گیا..... لیکن..... اچھا، تم میرے

ساتھ چلو..... میرا گھر قریب ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور وہ بھی گردن جھکائے میرے ساتھ ہولی۔ جب میں اپنے مکان پہنچا تو وہ دروازے پہ رُک گئی۔ جھجکی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "زیادہ دیر تو نہ ہوگی؟ ..... میری ماں..... آہ..... میں اُسے گھر میں بے ہوش چھوڑ کر آئی تھی"۔

"نہیں دیر نہ ہوگی۔ تم اسی جگہ کھڑی رہو۔ میں ابھی آتا ہوں"۔

میں اندر چلا گیا۔ وہ حیران نظر سے میری طرف ٹکٹکی باندھے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ میں نے بکس سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور باہر آ کر اُسے دے دیا۔ وہ نوٹ کو دیکھ کر پہلے تو سہم گئی۔ پھر شک کی نظر سے دیکھا اور خوش خوش ایک طرف کو چل دی۔ میں نے چلتے وقت اُس سے اتنا اور کہا کہ اگر پھر ضرورت ہو تو بے جھجک یہاں چلی آئیے۔

اُس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اُس کی نظر میں بے اندازہ احسان مندی بھری تھی۔

تیسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ پھر آئی۔ مجھے افسوس تھا کہ کیوں میں اُس کا نام پوچھنا بھول گیا۔ اب میں نے اُس کے آتے ہی پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"کملا"۔ وہ بولی۔

"اچھا۔ تو کہو، تمہاری ماں اب کیسی ہیں؟"

"پہلے سے تو اچھی ہیں، لیکن..... وہ جملہ پورا کئے بغیر ہی چپ ہو گئی۔

"ڈرتی کیوں ہو؟ جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کہو نا" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر نے قیمتی دوائیں لکھی ہیں۔ یہ نسخہ دیکھئے" اُس نے ڈاکٹر کا لکھا ہوا نسخہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے پڑھا۔ واقعی اُس میں کچھ دوائیں قیمتی تھیں۔ میں نے پھر پانچ روپے کا نوٹ اُسے دے دیا اور وہ چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا۔ بے چاری اُٹھتی ہی جوانی میں دُکھ، درد اور غربت و افلاس کی ستائی ہوئی اِدھر اُدھر ٹھوکریں پڑی ماری پھرتی ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا، تو اِسے اُس کی ہوس کا شکار ہونے میں کوئی شک تھا؟ یہ جس بُرے خیال سے پارک میں آئی تھی اُسے پورا کرنے والوں کی کمی نہیں۔ شباب و جوانی خود سپردگی پہ آمادہ ہو تو خریداروں کی کیا کمی! اُف، غربت! اس ڈائن نے کتنوں کو گناہ کے غار میں دھکیل دیا ------ یک دم میرے دل میں ایک دُکھی کرنے والا خیال آیا۔ اور حیرت ہوئی کہ یہ خیال اب سے پہلے میرے دل میں کیوں نہ آیا۔ میرے اِس وقت کے برتاؤ کو دُنیا کچھ اور ہی سمجھے گی۔ دُنیا والے میرے دامن کو گناہ سے آلودہ کہیں گے۔ دُنیا دِل کہاں دیکھتی ہے ------ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس خیال پہ ہنس پڑا۔ فلاسفر کی فطرت دُنیا کے خیالات کو ایک بچے کی گستاخی سے زیادہ نہیں سمجھتی۔ میری نیت صاف تھی، اور ایک چٹان کی طرح مستحکم۔ وہ میری بہن تھی۔ میں اُسے ہمیشہ کے لئے بہن بنا چکا تھا"۔

اتنا کہہ کر اُس مُردے نے ایک سرد سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ غالباً اُسے پھر گذشتہ زندگی کا کوئی خیال ستا رہا تھا۔ وہ جانے کب تک خاموش رہتا کہ مُردے بولے "ہاں پھر کیا ہوا؟"

نووارد مُردے نے پھر ایک ہلکی سی آہ بھری اور کہنے لگا "اِس طرح کچھ دِن بیت گئے۔ وہ کئی بار آئی اور مجھ سے جو کچھ ہو سکا، لے کر چلی گئی۔ اب تک میں نے اُس سے صرف اتنا معلوم کیا تھا کہ وہ ایک اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ ماں بہت دِنوں سے بیمار ہے۔ اور ایک چھوٹا بھائی ہے جس کی عمر لگ بھگ آٹھ نو سال کی ہے۔ بھوک سے رو رو کر چلاتا رہتا ہے۔ کوئی اُن کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ فاقہ روز کا معمول سا بن گیا ہے۔ اور بیچاری بڑھیا کے لئے دوا دارو کا بھی سہارا نہیں۔

ایک دن جب میں فلسفہ کی ایک کتاب کے مطالعہ میں محو تھا، وہ آئی اُس کی حالت دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں درد و اندوہ جھانک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی رونے لگی۔ اور جب میں نے تسلی دے کر حال پوچھا۔ سسکیاں لیتے ہوئے اُس نے کہا "ماں نے مجھے نکال دیا ہے، اور پھر آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"نکال دیا؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "کیوں؟"

"کہتی ہیں، تو..... وہ پھر رونے لگی۔

"کہو، کہو..... میں گھبرا گیا ہوں..... ایسی کیا بات ہے؟"

"کہتی ہیں، تو..... آوارہ....."

"آوارہ؟"

"جی ہاں۔ اُس نے پھٹی ہوئی دھوتی کے آنچل سے آنسو پونچھے "کیا آپ بھی مجھے ایسی ہی سمجھتے ہیں؟"

"تم؟ ..... آوارہ؟ میری نظر میں تو ایسی بات نہیں ہے"۔

"میری ماں کہتی ہیں کہ تُو آوارہ نہیں ہے، تو پھر اتنے پیسے خرچ کے لئے کہاں سے آتے ہیں؟"

"تو، تم نے ساری بات کیوں نہیں کہہ دی؟"

"کہی تھی ..... لیکن وہ کہتی ہیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔
کیا ہو نہیں سکتا؟"
"یہی کہ کوئی اجنبی مرد یوں ہی اتنے روپے دے دیا کرے"۔
"واہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی"۔
"میں کیا بتاؤں ..... وہ تو کسی طرح یقین ہی نہیں کرتیں" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

میں نے بہت مشکل سے اُسے چُپ کرایا۔ تب اُس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کو پارک میں ملی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں اُس دن ضرور اسی خیال سے گئی تھی ..... لیکن میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی؟ میرا چھوٹا بھائی بھوک سے تڑپ رہا تھا، اور ماں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ بتائیے میں کیا کرتی؟ کیا اپنے بھائی اور ماں کو یوں ہی کُتّے کی موت مر جانے دیتی؟ میں پارک میں یہی فیصلہ کر کے آئی تھی کہ جیسے بھی ہو، کچھ پیسے حاصل کروں، چاہے ..."

"لیکن اب کیا ہوگا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں کیا بتاؤں؟ ماں تو یقین ہی نہیں کرتیں۔ انہوں نے تو طے کر لیا ہے کہ وہ ہرگز دوا نہ پئیں گی اور ان پیسوں میں سے اپنے اور اپنے بچّے کے لئے ایک پائی بھی خرچ نہ ہونے دیں گی۔ ساری دوائیں پھینک دیں اور شیشیاں توڑ دی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ایسے علاج سے موت اچھّی ہے۔ میں جو کھانا لے گئی تھی، اُسے میرے بھائی کو نہیں کھانے دیا۔ وہ بھوک سے چلّاتا ہے، لیکن وہ کچھ نہیں سُنتیں۔ اُن کا خیال ہے کہ میں نے غیرت و خودداری کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اور اب وہ زندہ رہ کر بدنامی کی موت مرنا نہیں چاہتیں"۔

میں نے دُکھی ہو کر کہا "پھر وہ کس طرح یقین کریں گی؟"

کچھ ٹھہر کر وہ بولی۔ "وہ کہتی تھیں کہ ..... کہ ..."

"ڈر کس بات کا ہے؟ جو کچھ کہنا ہے، کہو، بے جھجک کہو!" — میں نے کہا۔

"کیسے کہوں، آپ ناراض ہو جائیں گے"۔

"ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ اگر تم کہو تو میں خود تمہاری ماں کے پاس چلوں اور یقین دلاؤں کہ ..."

"نہیں نہیں، ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ آپ کو دیکھ کر وہ اور تیز ہو جائیں گی"۔

"تو پھر؟"

"وہ کہتی ہیں کہ اگر مجھے اس گھر میں آنا ہے اور اپنی بدنامی کو چھپانا ہے، تو ..."

"بدنامی؟ ..... کیا تمہارے بارے میں کسی دوسرے کو بھی شک ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔" کملا بولی "یہ بات نہیں۔ ابھی تک تو بات ماں ہی تک ہے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ ....." وہ آگے کہنے سے جھجک کر رہ گئی۔

"اچھّا، میں سمجھ گیا" میں نے اُس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

"جی ہاں" وہ بولی۔

"ہاں، تو پھر کیا کہا؟"

"کہنے لگیں کہ اگر اس گھر میں آنا ہے تو شادی کر لے"۔ کہتے کہتے کملا شرم سے عرق عرق ہو گئی۔ اُس کے زرد رُخسار گلابی ہو گئے۔

"شادی؟" میں نے ذرا حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی ہاں" وہ گردن جھکا کر بولی۔

"تو اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ ..... کر لو"

"کر لوں؟ ..... کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" بہت ہی بھولے پن سے اُس نے کہا۔

"اس میں جھوٹ اور سچ کیا ہے؟ تم سن شعور کو پہنچ گئی ہو، کملی ہو۔ شادی تو تمہیں کر لینی چاہیئے"۔

کملا خاموش رہی۔ پھر وہ جانے کے لئے اُٹھی۔ میں اُسے دروازے تک پہنچانے گیا، تو وہ رخصت ہوتے ہوئے بولی "کل میں پھر اسی وقت آؤں گی۔ آپ کی منظوری میرے لئے خوشی کی بات ہے"! کہہ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اب میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کہاں شادی کرے گی۔ غالباً اُس کی ماں کی نظر میں کوئی ہوگا، یا اُسے کسی سے محبّت ہو۔ جو کچھ بھی ہو، ایک بھائی کے ناتے مجھے اُس کی مالی مشکلات میں مدد کرنی ہی ہے۔ اس بچاری کے پاس کیا رکھا ہے، جو یہ شادی کا خرچ برداشت کر سکے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اُس کی ماں ایک پُرانے خیالات کی عورت تھی۔ جوان لڑکیوں کے بارے میں اُس کا یہ خیال تھا کہ جس دن وہ گھر سے باہر قدم نکالیں، فوراً اُن کا گلا گھونٹ دو۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے شک ہی نہیں، یقین ہو گیا تھا کہ اُس کی بیٹی پاکدامنی کی بلندی سے گر کر بدچلنی کی دلدل

میں پھنس گئی ہے - اس بدنامی اور بے عزتی کی کالک جلد دھو دینے کی واحد تدبیر شادی ہی تھی - جلد سے جلد اس کی شادی کر دی جائے - تاکہ شوہر کی محافظت میں اس کے خاندان کی عزت محفوظ رہے - اس کام کے لئے کیسے چنا گیا تھا؟ اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا اور میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ بہن کی شادی میں بھائی کے کیا فرائض ہیں - بنک میں نو سو روپے جمع تھے - میں نے دل میں کہا - کملا کی شادی خوب دھوم دھام سے کروں گا -

انہیں خیالات میں دن بیت گیا - دوسرے دن وہ اپنے وقت پر آئی - آج اس کے منہ پر مسرت اور شگفتگی چمک رہی تھی - میں نے پوچھا -

"کہو کملا، تمہاری ماں کے غصے کی کیا حالت ہے؟"

"بس کیا بتاؤں" وہ بولی - مجھ میں تو ان سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں"

"عجیب عورت ہیں وہ بھی"

"ہاں، ہیں تو ایسی ہیں - وہ آج افسردہ و مغموم نہ تھی"

"ہاں، تو تم نے اپنے..... جیون ساتھی کو دیکھ بھی لیا؟ میں نے مسکراتے ہوئے کہا -

میرے سوال پر وہ شرما گئی اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگی -

"ان کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا -

"رہنے بھی دو!" وہ ٹھنک کر بولی -

"کیوں؟.... بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"کیوں.... کیوں......" اس نے لاج سے ایک طرف منہ پھیر لیا -

مجھے اب حیرت سی ہوئی "بتاؤ کملا، بتاؤ، تاکہ میں پتہ لگا لوں کہ کیسے آدمی ہیں - زندگی بھر کا ساتھی ٹھہرا"

"کیوں مذاق کرتے ہو؟" وہ ٹھنک کر پھر بولی

"مذاق کی اس میں کیا بات ہے؟ اور نہیں تو ان کا نام، بہنہ تو بتادو"

"نام؟ وہ کھل کھلاتے ہوئے بولی "ان کا نام تو مجھے اب تک نہیں معلوم"

"نہیں معلوم؟ تمہیں اپنے ہونے والے جیون ساتھی کا نام بھی نہیں معلوم؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اتنا بھی نہ جانتی ہو؟"

چھوڑو اس مذاق کو" اس نے کہا -

"اچھا، تم نہ بتاؤگی" میں نے ذرا منہ بنا کر کہا - "تو میں تمہاری ماں سے پوچھ لوں گا"

"تم کیسے پوچھو گے؟"

"آج ہی تمہارے ساتھ چل کر"

"میرے ساتھ چل کر؟"

"ہاں..... اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"حرج تو کچھ نہیں - لیکن تم جانتے ہو کہ ماں ٹھہریں پرانے خیالوں کی - اگر بیاہ سے پہلے ہی ان کے سامنے دولہا، دلہن دونوں....."

"دولہا، دلہن ــــ؟"

"ہاں، اس نے سادگی سے کہا -

دولہا دلہن کون ــــ؟

"تم اور میں" اس نے جھینپتے ہوئے آہستہ سے کہا -

"میں ــــ؟" میں نے ایک دم چونک کر کہا -

وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی -

"کیا مطلب ہے تمہارا - صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟" میں نے آواز کو سخت بناتے ہوئے کہا -

وہ ڈر گئی - کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہنے لگی "آپ ہی نے تو کہا تھا"

"میں نے کیا کہا تھا؟"

"شادی کر لینے کو"

شادی کر لینے کو...؟

"تمہاری ہی شادی کے بارے میں تو کہا تھا"

"جی ہاں"

"تو پھر؟ تم یہ کیا کہہ رہی ہو کہ میں اور تم...."

"تو اور کیا کہوں؟ وہ بولی - "آخر آپ ہی تو....."

"میں - کیا تم نے مجھ سے شادی کرنے کو کہا تھا؟

کملا چپ ہو گئی - میرا دماغ ہوائی جہاز کے پنکھے کی طرح چکر کھا رہا تھا - میں نے تو اسے شادی کی رائے دی تھی - اور وہ سمجھی کہ میں اس سے شادی کروں گا - اف! اس نے کیا سمجھ لیا - میں اس سے شادی کیسے کر سکتا تھا؟ میں نے تو اسے بہن بنا لیا تھا اور سمجھا تھا کہ وہ بھی مجھے بھائی مانتی ہے - لیکن.....

میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ رونے لگی - میں بھی کچھ بے چین سا ہو گیا اور بولا "روتی کیوں ہو کملا؟ بھلا میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا - تم تو میری بہن ہو.... بہن....."

" بہن ؟" اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا" تو پھر تم نے کس کے ساتھ بیاہ کرنے کو کہا تھا ؟"

" میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تمہاری ماں نے تمہارا رشتہ کہیں طے کر رکھا ہوگا"

اُس کے ہونٹوں کی شگفتگی پھر افسردگی سے بدل گئی اور جب میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُسے بہن کے سوا اور کچھ نہیں سمجھ سکتا، تو وہ کہنے لگی" پھر تو میں گھر میں قدم بھی نہ رکھوں گی۔ ماتا جی تو یہی کہتی ہیں کہ تم سے بیاہ ہو جائے کیونکہ ...."

" اُف !" میں گھبرا کر بولا" کیا اُن کا خیال ہے کہ ہم ...."

" جی ہاں ..... وہ یہی سمجھتی ہیں" اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔

میں خاموش تھا۔ فلاسفی غائب تھی۔ بات بہت آگے جا چکی تھی۔ کملا اپنی ماں کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھی ——— کیا یہ ہو سکتا تھا کہ اُس کی ماں کے لئے میں اپنی زندگی تباہ کر ڈالوں ——— ؟ کچھ دیر میں سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا" سنو کملا! خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں فلاسفر ہوں اور لوگ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ واقعی میں نے اپنے کو فلاسفی ہی کی نذر کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی عورت کو میں جیون ساتھی بنانے کے لئے تیار نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ میں شادی کے بندھن میں بندھنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دوں۔ پھر تم میری بہن ہو۔ اگر میں آنکھیں بند کر کے اپنے پڑھے لکھے پر پانی پھیر کر اور ضمیر کا گلا گھونٹ کر تمہارے ساتھ شادی کر بھی لوں تو یہ کتنا بڑا گناہ ——— کتنا شرمناک فعل ہوگا ——— بھائی بہن کا بیاہ !! ایسا کبھی ہوا ہے ؟ دُنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں نے تمہیں بہن بنا کر اپنایا تھا۔ خدا کے لئے اپنی ماں کو یہ سب باتیں سمجھاؤ، یا مناسب سمجھو تو مجھے اجازت دو کہ میں ہی اُنہیں حقیقت بتا دوں گا"

" تو رہنے دیجئے" کملا آنسو پونچھتے ہوئے اُٹھی، اور جانے لگی۔

" ماں سے جا کر کیا کہو گی ؟" میں نے پوچھا۔

" کچھ نہیں" وہ بولی۔

" وہ پوچھیں گی تو ضرور کہ کیا بات ہوئی "

" میں گھر نہیں جا رہی ہوں"

" تو اور کہاں جا رہی ہو ؟"

" کہیں چلی جاؤں گی"

" کہیں سے کیا مطلب ؟"

" کہیں جا کر مر جاؤں گی۔ ماں کے سامنے کیسے جا سکتی ہوں ؟"

میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اِن واقعات اور معاملات نے میری سمجھ بوجھ چھین لی۔ میں اپنی فلاسفی بھول گیا۔ تصوّرات کے آسمان سے حقیقت کی دُنیا میں آ گیا ——— یک دم میرے ذہن میں ایک عجیب خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا۔ میں وفورِ مسرّت سے اُچھل پڑا۔ میں نے کملا کے اُداس مُنہ کو دیکھا، اور مُسکراتا ہوا بولا" شادی کے لئے تیار ہوں کملا!"

اُس نے مجھے اِس طرح دیکھا، جیسے پاگل ہو گئی۔ بہت دھیمی آواز میں بولی" آپ تیار ہیں ؟"

" ہاں" میں نے کہا" لیکن ایک شرط ہے"

" شرط ؟"

" ہاں، ایک شرط"

" کیا ؟"

کیا تم اِس پر تیار ہو کہ شادی کے بعد بھی بالکل اسی طرح رہو، جس طرح بھائی کے ساتھ بہن رہتی ہے ؟"

اُس نے ایک لمحہ سوچا اور جواب دیا" میں تیار ہوں"

اُس جوان لڑکی نے یہ شرط صرف اِس لئے منظور کی تھی کہ اُس کا مدعا تو ماں کے سامنے شادی کر لینا تھا۔ چاہے اُس کے بعد کچھ بھی ہو"

نو وارد مُردہ پھر خاموش ہو گیا۔ قبرستان میں سنّاٹا تھا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اُس کے کسی ساتھی نے کہا" ہاں، کہے جاؤ۔ وقت کم ہے اور اِس کہانی کو ——— کہانی کیوں، آپ بیتی کو پوری کئے بغیر چھوڑ دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا"

" آپ بیتی سُنانے والا افسردہ بولا" پھر ہماری شادی ہو گئی۔ بہن کی جگہ بیوی ——— آسمان کی جگہ زمین ——— آگ کی جگہ پانی ——— اور فردوس کی جگہ جہنم نے لے لی"

" مُردے بولے" اور پھر ؟"

آپ بیتی کہنے والے نے آگے کہا" پھر کیا ؟ ..... پھر میں مر گیا۔ تین سال تک ہم بظاہر بیوی اور شوہر رہے۔ لیکن حقیقت میں وہ میری بہن تھی اور میں اُس کا بھائی۔ کبھی کبھی وہ میری قبر پر اب بھی اکیلی آتی ہے۔ غمگین اور اُداس ——— "بھیا" کہہ کر قبر سے لپٹ جاتی ہے، اور اپنے آنسوؤں سے میری قبر کو بھگو دیتی ہے۔ میں مر گیا ہوں، لیکن مجھے اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ مجھ سے لپٹ کر رو رہی ہو"

مُردے نے سرد سانس لی۔ اُن میں سے کوئی بولا" بس آج سے یہ

رات کی کہانیاں بند کر دو! دنیا والوں نے زندگی کو اپنے دستوروں اور سماجی بندھنوں سے اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ اب اُن کی کہانیاں بھی بُری لگتی ہیں؟

"یہ بالکل سچ ہے"! کسی نے کہا۔

سب مُردے اپنی اپنی قبروں میں غائب ہو گئے۔ چاروں طرف بھیانک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

شانِ تغزل

از

جناب ریاست علی آزاد مدیر "پرواز"

"زباں ساکت ہے لیکن لن ترانی یوں بھی ہوتی ہے"
لبِ معجز نما سے گُل فشانی یوں بھی ہوتی ہے

نگاہوں سے نگاہوں کی زبانی یوں بھی ہوتی ہے
مری رودادِ غم کی ترجمانی یوں بھی ہوتی ہے

بہاریں گلشنِ فردوس کی قربان ہوتی ہیں
چمن بردوشِ ہر گل کی جوانی یوں بھی ہوتی ہے

اکیلے بزمِ دشمن میں تمہیں جانا نہیں واجب
ہمیں تو ہر کسی سے بدگمانی یوں بھی ہوتی ہے

شبِ غم کے تصور ہی سے گھبراتا ہے دل میرا
اجل کی گاہے گاہے مہربانی یوں بھی ہوتی ہے

تری فرقت کا غم جب سے رفیقِ زندگی ٹھہرا
مرے سوزِ دروں کی پاسبانی یوں بھی ہوتی ہے

خرامِ ناز سے محشر اُٹھا لے شوق سے لیکن
کہیں دنیا میں تشہیرِ جوانی یوں بھی ہوتی ہے

وہ ظالم خود بخود نادم ہوا اپنی جفاؤں پر
ہمیں راہِ طلب میں کامرانی یوں بھی ہوتی ہے

کرم ہم پر ہوا جب سے جنونِ فتنہ ساماں کا
میسر ہم کو دل کی شادمانی یوں بھی ہوتی ہے

ریاست اے صیدِ غم اور موردِ آفاتِ عالم کی
بسر دنیا میں اکثر زندگانی یوں بھی ہوتی ہے

وہ ان کو چائے
پسند ہے... مگر وہ
نہیں جانتے اچھی
چائے کیا شئے ہے
کیسے جان ہی سکتے ہیں!
کیونکہ دودھ چائے
پوچی ہی میں ملا دیتے ہیں

اور ڈھالنے کے
پہلے ہی خراب
ہو جاتی ہے۔ اچھی
چائے کے لئے ضروری
ہے کہ دودھ پیالی میں
ملائی جائے نہ کہ چائے
پوچی میں یہ

لاکھوں آدمی چائے سے خوش اور مفرح ہونے کی اُمید رکھتے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کثیر تعداد میں چائے پینے والے نہیں جانتے کہ اچھی چائے کیا شئے ہے۔ اچھی چائے بنانے میں خرچ زیادہ نہیں ہوتا محض پانچ آسان اصولوں کے پابندی کا نتیجہ ہے۔ اپنے پیسے کا ٹھیک فائدہ اٹھانے کے لئے اور اپنے چائے کے پورے خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان اصولوں کو زبانی یاد کر لیجئے اور خیال رکھئے کہ گھر میں ان پر ہمیشہ عمل ہوتا رہے۔

افسانہ

مرد اور عورت

از

جناب آسی رام نگری

وہ ایک صنّاع تھا!

اور دُنیا نے بھی اُسے اسی رُوپ میں جانا تھا - ایک ماہرِ فن، چابکدست صنّاع!

اُس کا فن ہی اُس کی دُنیا تھی - وہ ایک تنہائی پسند فن کار تھا - انسانیت اُس کا مذہب، آدمیت اُس کا دھرم تھا ——— چھینی اور پتھر ہی اُس کے ساتھی اُسے جان سے پیارے تھے! تنہائی میں بیٹھا پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں کے سینے پر وہ اپنی چھینی چلاتا رہتا - بس اُس کا یہی ایک مشغلہ تھا ——— چاندنی راتوں میں جب آکاش سے دُودھ کی بارش ہوتی رہتی، وہ اپنی گپھا کے سامنے ندی کنارے بیٹھا اپنی چھینی سے اُس سُنسان ماحول میں سنگیت اور لَے بھرتا رہتا - اور اپنے آس پاس اپنے ہی بنائے ہوئے خوبصورت مجسّموں کو دیکھ دیکھ کر وہ اُن پر فریفتہ ہو جاتا ——— اُس کی یہ دلی مسرّت ہی اُس کا گراں مایہ سرمایہ تھی - اور یہی وہ اطمینان تھا جس میں وہ تحسین، صلہ اور اپنی عرق ریزیوں کی قیمت ——— سبھی کچھ پاکر خوشی سے پاگل ہو جاتا تھا - طرح طرح کے مجسّمے تکمیل کے بعد جیسے بول اُٹھتے اور فن کار اپنی پیشانی پر جھکے ہوئے گھونگھرالے بال پیچھے کی طرف کرتا ہوا ایک سُکھ کی سانس چھوڑ کر، جیسے خوشی کے سورگ میں پہنچ جاتا - اپنی ہی تخلیق کو ٹکٹکی باندھے گھنٹوں وہ بنظرِ تحسین دیکھتا رہتا اور جب اُسی حالت میں کھڑے ہوئے گھنٹوں بیت جاتے تو یکایک خواب سے چونک کر، اُٹھ کر وہ اپنی گپھا کی طرف چل پڑتا - اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا، جیسے اُس کی تخلیقات اُس میں نیا حوصلہ، نئی تحریک بھر رہی ہیں۔

شفق کی سُرخی سے لے کر راتوں کی چاندنی اور راتوں کے اندھیرے میں اُس کا بس یہی کام تھا - بھوک معلوم ہوتی تو جنگل کے پھل توڑ کر کھا لیتا - پیاس لگتی تو ندی کے پانی سے پیاس بُجھا لیتا - اور جب سپنوں کی دُنیا سے رنگین خواب اُس کی بوجھل پلکوں پر آکر اُترنے تو وہ اپنی گپھا کی طرف چل پڑتا - پھر قدرت کی گود میں بکھری ہوئی ننگی چٹانوں کے ٹھنڈے سینے ہی پر سو جاتا - مُوندی ہوئی پلکوں کے کومل ریشوں پر اُس کا بیدار تخیّل کسی نئی تخلیق کی تکمیل میں مصروف رہتا اور دوسری صبح .... وہ دیکھتا - اُس کا تخیّل حقیقت میں تبدیل ہو کر مجسّم بن گیا ہے - اُس وقت وفورِ مسرّت میں اُس کی خاموش آنکھوں میں خوشی کی ایک لکیر کھنچ جاتی ——— لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ برابر اپنے دل کی گہرائی میں کوئی عجیب کمی سی محسوس کرتا رہتا - ایسی کمی جو شدید تھی، درد سے بھری تھی - ایسی کمی جو اُس کی رُوح کو جھنجھوڑ ڈالے اور پھر بھی دبی دبی آگ کی طرح سُلگتی رہے ——— وہ سوچ سوچ کر تھک جاتا، لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا - پھر بھی ایک ایسی کمی، جسے وہ اپنے میں محسوس کرتا - صاف اور عجیب انداز سے، لیکن وہ کمی کیسے پُوری ہو گی ———؟ یہی دُنیا کی گندگیوں سے دُور رہنے والے اُس صنّاع کی سادہ سمجھ میں نہ آتا تھا اور اسی طرح وہ دل کی گہرائی میں سُلگتی ہوئی آگ میں جلتا جا رہا تھا - اُسے کوئی پُراسرار طاقت اپنی نیش زنی سے مضطرب کئے رکھتی تھی - اور وہ بے بس تھا، بے سہارا تھا - اس کمی کو پُوری کرنے کی اپنے اندر طاقت نہ پاتا تھا -

کبھی کبھی یہ اضطراب اتنی شدّت اختیار کر لیتا کہ اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے دل میں سیسہ اُبل رہا ہے، جو ٹھنڈا نہیں ہوتا ——— نہیں ہوتا ——— اور تب وہ راتوں کو بیٹھا بیٹھا رو دیا کرتا اور وہ راتیں اُس کے سارے آنسوؤں کو نگل جاتیں ——— کہ یکایک ایک دن اُسے اپنی کمی کا پتہ لگ گیا - سوتے ہوئے کوئی اوس کے قطروں کی طرح ٹھنڈی، چاند کی طرح روشن، ادھ کھلی کلی سی دلکش ——— عورت پہلے اُس کی پلکوں پر، اور پھر ذہن پر تھرک کر یکایک غائب ہو گئی - اُس کے حُسن کی جھلک اور پائلوں کی جھنکار بس باقی رہ گئی کہ صنّاع اُس ڈوبتے ہوئے سنگیت اور دلکش حُسن کی آخری چمک کو اپنے بازو میں بھر لینے کو از خود رفتہ سا، بجلی کی طرح اُٹھ بیٹھا، لیکن وہ نہ تھی ——— نہیں تھی سنگیت جیسے اُفق کو بھی پار کر کے چلا گیا تھا - اور رُوپ رات کا سپنا بن گیا تھا -

صرف ایک یاد باقی رہ گئی تھی! یاد ——— بے حد پیاری، پھر بھی بے حد کسک بھری!

صنّاع دوسرے دن صبح سے یکسُو ہو کر جناب کی اُسی عورت کا مجسّم بنانے

میں منہمک ہوگیا۔ اُس نے اپنے دِل میں عہد کیا کہ جب تک اُس عورت کا مجسمہ مکمل نہ ہوجائے، وہ چین کی سانس نہ لے گا۔ رات اور دِن —— دِن اور رات، اُس کی چھینی پتھروں پر پیہم چلتی رہے گی —— بس چلتی رہے گی

اور وُہی ہوا۔ اُس کی اَن تھک محنت اور حیرت انگیز چابکدستی نے حافظہ کے سہارے دس ہی دنوں میں وہ مُورتی کھڑی کردی۔ اور جس دِن مجسمہ کی تکمیل کا کام ختم ہوا، صنّاع نے اطمینان کی ایک سانس چھوڑی، اور جب چاند امرت برسا رہا تھا، وہ کھڑا ہوکر ٹکٹکی باندھے اُس مورتی کو دیکھتا رہا۔ پھر قریب جاکر پیار سے اُس پر ہاتھ پھیرا —— وہی کھڑی ناک، وہی قد و قامت، وہی چہرہ، پتلی بھنویں، چھوٹے چھوٹے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں —— وہی موہنی صورت، وہی بل کھاتی سی کمر، وہی بھرا بھرا جسم! صنّاع کے خوابوں میں مُسکرانے والی، جیسے دھرتی پر اُتر آئی۔ جسے چھو کر، اُس کا جذباتی دِل رنگین احساسات سے بھر گیا۔ اپنی اِس کامیاب کوشش پر وہ محوِ حیرت تھا —— ایسی مُورتی، جیسے ابھی بول پڑے گی! کتنی فن کارانہ، کتنی حسین، کتنی زندہ!!

لیکن تھوڑے ہی دِنوں میں اُس کا وہ نشہ اُتر گیا، مدہوشی جاتی رہی، غرورِ شکست ہوا اور ہونٹوں کی مُسکراہٹ جاتی رہی۔ صنّاع کے دِل میں ایک نئی خواہش، ایک نئی آرزو نے جنم لیا۔ اُس نے چاہا مُورتی حرکت کرے بے جان پتھر نہ رہے، چلنے پھرنے لگے، منہ سے کچھ بولے۔ اُس کے سُکھ دُکھ کی حصے دار ہو۔ صنّاع کے آنسو اُس میں تڑپ پیدا کردیں۔ اور صنّاع کے چہرے پر ہنسی کی ذرا سی جھلک دیکھ کر وہ مُسکرا دے، ہنس پڑے۔ وہ ساری زندگی اُس کے ساتھ رہے اور صنّاع کو اُس سے نیا حوصلہ ملے، نئی تحریک، نیا ولولہ، نئی زندگی اور —— اور اُس کی چاہ شدید ہوتی جارہی تھی۔ اور پھر وہ اپنی تخلیق پر آنسو گرانے لگا تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ درد کا مارا اور نحیف ہوگیا تھا

ایک دِن رُوح کی گہرائی سے اُس نے آکاش کی نیلی چھت کی طرف ہاتھ جوڑکر بھیک مانگی —— "ہے پربھو! اِسے چاند کی جوت دو!" اور اُس نے دیکھا، مُورتی نرمل جوت میں نہا گئی ہے۔

پھر ہاتھ جوڑکر پہلے کی طرح بھیک مانگی "پربھو! اِسے پھولوں کی ہنسی دو....؟"

اور اُس نے دیکھا، مُورتی کے ہونٹوں پر پھولوں کی ہنسی رنگ گئی ہے۔

اور اسی طرح پرارتھنا میں محو، اُس کی آواز اُونچی ہوتی گئی ——

"مکھڑے پر سُورج کا تیج، آنکھوں میں شراب کا نشہ، دانتوں میں اوس کی بوندوں کی چمک اور آواز میں کوئل کی سی مٹھاس اور مٹھاس میں...... اندردھنش کا سا سات رنگا لباس اور لباس میں..... جگنو سے چمکتے ہوئے گہنے، اور...... اور پربھو..... اپنے سینے میں سوتے ہوئے بھولے بچے کا معصوم بھولاپن اِس کے سبھاؤ میں گھول دو....!"

اور اُس نے دیکھا، اُس کے من کی کامنا پُوری ہوگئی ہے۔ اور حُسن و معصومیت کا مسکراتا ہوا وہ نسائی پیکر اُس کا پہلو گرم کرنے، اُس کی بے کیف زندگی میں کیف و سرور اور کشش بھرنے چلا آیا ہے —— اپنے ہونٹوں پر دلنواز تبسم اور آنکھوں میں مستی لئے ایک خوبصورت جوان عورت! —— صنّاع کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اُس کے غرور کی حد نہ رہی۔

وقت کا رتھ چلتا رہا —— عورت نے صنّاع کی زندگی میں جیسے چار چاند لگادیئے۔ اُس کی بے کیف زندگی کو زندگی بنا دیا۔ اور عورت کو ملی محبّت —— تصوّر سے بھی زیادہ کومل، اُمید سے بھی زیادہ دلنواز و جاں بخش! دونوں کی آغوش کشادہ ہوتی گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی رُوح بن گئے۔ دو ساز کی ایک آواز —— دونوں جیون ساتھی بن گئے۔ لیکن —— ایک دِن ایسا آیا جب عورت نے محسوس کیا کہ محبّت کے پھول جھڑتے جارہے ہیں، اُلفت کا بندھن ڈھیلا پڑتا جارہا ہے۔ اب دلنوازانہ ہنسی اور دلآویز پیار کی جگہ طنز ہے، تشنیع ہے۔ تمسخر ہے اور رُوکھے پھیکے دِن بیت رہے ہیں —— نفرت بڑھ رہی ہے، آدر مان اور باتوں کی مٹھاس گھٹ رہی ہے —— گھٹتی جارہی ہے۔

ایک دِن عورت نے دیکھا، محبّت کی جگہ مار پیٹ نے لے لی ہے —— تو اُس کے سارے سپنے ٹوٹ گئے۔ —— سارے خواب شکست ہوگئے —— اُمیدیں سسک پڑیں۔ خوشی کی جگہ اُس کے ہونٹوں پر ہنسی روئی۔

آخر ایک دِن تنگ آکر عورت پھر پتھر اور بے جان ہوگئی۔ عورت کا نازک دِل درد و اندوہ سے جُھلس گیا اور پیہم طعن و تشنیع اور تکلیفوں سے سرد ہوگیا۔

پھر اپنے سامنے وہی پتھر کی ایک بے جان، سخت چٹان پاکر صنّاع کے سینے میں جیسے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ اُس نے اُسے کئی بار چھوا، لیکن ہاتھوں میں پتھر کی سختی چُبھنے لگی۔ اُس نے اُسے کئی بار پکارا —— اُسی محبت بھری آواز میں جس میں وہ اُسے وفورِ محبّت میں پکارا کرتا تھا —— "رانی! رانی!"

لیکن مُورتی بے حس و حرکت رہی۔ موت سی خاموش اور سخت، اور صنّاع بہت دنوں تک ویسے ہی پاگلوں کی طرح اُس مُورتی کے قدموں میں

لوٹتا رہا، درد بھری آواز سے اُسے پکارتا رہا۔ سنسان رات کے دبیز اندھیرے میں اُس کی تیز پکاریں سنسان فضا میں گھٹتی رہیں ——— "رانی! او رانی!" لیکن مورتی بے حس و حرکت رہی۔

اور پھر کچھ دن بعد جانے وہ کہاں چلا گیا۔ جانے کہاں؟ وہ تو چلا گیا، لیکن مورتی اب بھی ہے۔ وہی چٹانیں ہیں، وہی گپھا ہے، اور وہی ندی کا کنارا ——— مورتی کو دیکھ کر صنّاع کو سراہا جاتا ہے ———

اور پھر مورتی پر جو لکھا ہوا ہے۔ اُسے پڑھا جاتا ہے ———

"عورت نے مرد کو اپنی بے اندازہ اور پاک محبّت دی، لیکن مرد سے اُسے ملا طنز و تشنیع، نفرت و حقارت۔ بدلے میں یہ پاکر عورت بے جان ہو گئی اور اُس کا نازک دل ——— پتھر ...... یہی "عورت" اور "مرد" کی کہانی ہے ......"

(رشتری تلسی لال کی ہندی کہانی)

غزل

از

جناب رحمٰن گنوری

شامِ فرقت یہ کس کی یاد آئی
درد نے دل میں لی ہے انگڑائی

ترکِ اُلفت کی جب قسم کھائی
اور بھی دل کو اُن کی یاد آئی

تم ہی پنہاں ہو لالہ و گُل میں
اُف یہ حُسنِ حجاب آرائی

مسکرانا ترا قیامت تھا
دل کی ایک ایک چوٹ اُبھر آئی

میری جانب تری نظر نہ اُٹھی
اُف یہ خود بینی و خود آرائی

ہر نفس شعلۂ جہنّم ہے
اُف ترے غم کی کارفرمائی

ایک سادہ نگاہ نے تیری!
بخش دی کُل جہاں کو رعنائی

آئینے کی طرف نگاہ نہ کر
آئینہ ہے حریفِ یکتائی

اُن کا غم حاصلِ محبّت ہے
راحتِ جاں ہے ناشکیبائی

حُسن کی یہ نمودِ رنگا رنگ
ہے خود اپنی نظر کی رعنائی

دِل پہ کیا کیا گذر رہی ہے رحمٰن
اِک قیامت ہے شامِ تنہائی

Lipton's
Flowery Orange
Pekoe
LIPTON'S
HIMALAYAN BLEND
DARJEELING
لپٹن
کے معنی
عمدہ چائے

LTX-152

گاہک

افسانہ

از

جناب سعید امرت

کہنے کو تو دودھ والے عثمان سے لے کر حبیب کبابی تک نے کہا۔ میاں تم نہ جایا کرو جہاں رنڈیاں رہتی ہیں۔ ان عصمت فروش اور ذلیل عورتوں میں آپ کو کیا مِل جاتا ہے۔ ذرا ہم کو بھی تو بتا یئے۔ شاید آپ جانتے نہیں۔ وہاں کی دُنیا گندی اور گھناؤنی ہے۔ وہاں جو ہوا چلتی ہے وہ زہریلی ہوا نہیں جس میں آپ سانس لے رہے ہیں۔ وہاں ہوا کے ایک جھونکے میں ایک ہزار جراثیم بکھرے ہوتے ہیں۔ اِن بازاروں کا انعام، وہاں کی اُلفت کا انعام، جانتے ہیں کیا ہے ―― یہی سوزاک، آتشک، کبھی کبھی کوڑھ بھی اور جھوٹی موٹی تو لگ بھگ سینکڑوں ہی بیماریاں ہیں۔ اُن کی باتوں میں زہر رچا ہوا ہے۔ اُن کے لبوں کی مُسکراہٹوں میں ایک نہیں ہزاروں زہریلے تیر پوشیدہ ہیں۔ وہ کسی کی جان لینے کے لئے کسی کا گلا نہیں دباتیں۔ اُن کی جھوٹی مُسکراہٹ، میٹھی میٹھی فریبی باتیں بناوٹ کے ناز و انداز زہر کا اثر رکھتے ہیں۔ وہ آدمی مرتا نہیں۔ لیکن اُن مرنے والوں سے بدتر ہو جاتا ہے جو قبر میں آرام سے جا سوتے ہیں۔

میں اُن کی باتیں سُن کر اُن سے تو کچھ نہیں کہتا، کیونکہ وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ حبیب کباب اور عثمان دودھ بیچتا ہو، لیکن میرا احساس اُن کو کبھی بھی بُرا نہیں سمجھتا۔ حبیب کے پاس دولت نہیں۔ وہ دِن بھر بھینسے کے گوشت کے کباب کوئلوں پر بھونتا ہے۔ لوہے کی لمبی لمبی سلاخوں میں کوٹتے ہوئے گوشت کو پروتا ہے، لیکن اُس کے پاس عزّت ہے اُتنی ہی جتنی اُس کے گھر میں پڑی ہوئی کوئلے کی بوریاں ہیں۔ عثمان دودھ میں پانی ضرور ملاتا ہے۔ ممکن ہے وہ چار چھٹانک دودھ میں سے ایک چھٹانک دودھ چرا لیتا ہو۔ لیکن اُس کے پاس جو غیرت ہے، اُس کی قیمت تو سارا محلّہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ نہ وہ ادریس منزل کا کانا حاجی اور نہ وہ انوار منزل کا مالک۔

کبھی کبھی میں خود ہی کہہ اُٹھتا ہوں "تم دیوانے ہو۔ تمہاری ہر بات اُلٹی ہے۔ جو آدمی مر رہا ہو اُسے اِن حسین بتوں کے در پہ پہنچ جانا چاہئے۔ وہ زندگیاں بانٹتی ہیں۔ اُن کی مُسکراہٹ زندگی ہے۔ اُن کی ادا حیات ہے۔ وہ کسی کی جان نہیں لیتیں۔ اُن کی چوکھٹ کی خاک میں سینکڑوں زندگیاں پڑی ہوئی سسک رہی ہوتی ہیں۔ وہ سسکتی ہوئی زندگیاں اُن سے کہتی ہیں۔ خدا کے لئے، بھگوان کے لئے، ہمیں اپنا لو، ہمیں اپنا کر زندگی بخش دو۔ تمہارے ہونٹوں میں امرت ہے۔ رگ و ریشے میں آبِ حیات ہے۔ دیوی، خاتون ― اپنے چندن سے نازک اچھوتے بدن سے ہم کو چمٹا لو۔ وہ چیختی رہتی ہیں، چلّاتی رہتی ہیں اور وہ ذلیل کمینی رنڈیاں چُپ چاپ اور ساکت رہتی ہیں۔ آخر وہ کس کس کو اپنائیں۔ اِن میں کوئی بڑا ڈاکٹر، بیرسٹر، مسجد کا مُلّا، لیڈر، مندر کا پُجاری، کبھی انجمن کا سرپرست اور کسی دھرم شالہ کا بانی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وہ ہوتا جو اپنے رفیق مریضوں سے کہتا۔ ان بازاروں کا رُخ بھی نہ کیا کرو۔ وہاں آفتیں ہی مصیبتیں ہیں، تباہیاں ہیں اور وہ مسجد کا مُلّا جس کی سیاہ و سفید ڈاڑھی ہوا کے ساتھ ساتھ سرسراتی، جمعہ کی نماز کے بعد تقریر ختم کر کے بلند آواز سے چلّاتا "فرزندانِ اسلام ―― ہماری قوم جس تیزی سے بُرائیوں کی جانب بڑھ رہی ہے، وہ خطرناک ہے اور سب سے بڑی بربادی اور تباہی اُن حُسن فروش عورتوں کی وجہ سے ظہور میں آئی جو رنڈیاں کہلاتی ہیں۔ یہ دین و ایمان کی دشمن ہیں، خدا کا قہر محض اسی وجہ سے آ رہا ہے کہ اُن کے اعمال گناہ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں آنکھیں کھولو! دِن دہاڑے زناکاری اور سیاہ کاری سے باز آؤ۔"

مندر کا پُجاری چیخ اُٹھا "بھائیو! اِس بڑھتے ہوئے گھور اندھیارے پاپ سے بچو۔ ان ویشیاؤں کے فریب کو سمجھو۔ وہ ناگنیں ہیں، ڈس لیں گی تو دولت، عزّت، آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

انجمن کا سرپرست کہہ اُٹھا "بھائیو، اِن کسبیوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو۔ یہی تمہاری تباہی ہیں۔ یہی تمہاری موت ہیں، اِن کے زہر سے بچو۔ اِن کا اُتار نہیں!"

وہ چیختے رہتے ہیں، چلّاتے رہتے ہیں۔ دِن کا اُجالا اُن کے چلّانے کے لئے ہوتا۔ دِن کے اُجالے کی آمدنی رات کے اندھیرے میں اِن کسبیوں، ناگنوں اور دین و ایمان کی دشمنوں کی گود میں آ گرتی۔ جب آمدنی بھینٹ چڑھ جاتی تو

اُن کی آنکھیں کھُل جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اُن کا دم نکل جائے گا۔ لیکن وہ زندہ رہتے ہیں۔ ذہن کو جھنجھنے، جلانے اور دماغ کو دن کی آمدنی بہا نہ کے لئے! وہ کبھی نہ مر سکیں گے۔ اُن کو بھوکے بیٹیوں کی دعائیں لگی ہوتی ہیں۔ موت اُن پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکے گی۔ ان کے گناہوں کی لمبی چوڑی فہرست دیکھ کر فرشتے حیران رہ جائیں گے۔ وہ کبھی اُن کے گناہوں کو نہ گن سکیں گے۔ اور اس طرح اُن کے گناہوں کا پیالہ کبھی لبریز نہ ہوگا۔ وہ بھرتا رہے گا۔ جس دن وہ مر جائیں گے دُنیا سے مکاری ختم ہو جائے گی۔ فرشتے اِس جہنمی بوجھ کے ٹل جانے سے مُسکرائیں گے۔ چاند تارے خوشی سے اور زیادہ چمک اُٹھیں گے۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوگا —— کبھی نہ ہوگا۔

میں اُن کے سجائے ہوئے گھروں میں جاتا ہوں۔ وہاں مجھے سکون ملتا ہے۔ جیسے وے کر میں آسودگی سمیٹ لیتا ہوں۔ بے جان خاموش نیلے پیلے ٹکڑے دے کر میں اُن کے جاندار جسموں کو حاصل کر لیتا ہوں۔ میں اپنے وحشی ہاتھوں سے انہیں نوچتا ہوں، کھسوٹتا ہوں، بالکل بھوکے کتے کی طرح۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کہتیں۔ ان نیلے پیلے ٹکڑوں نے اُن کی آواز چھین لی۔ ورنہ اُن کے پاس بھی زبان ہے۔ وہ بھی کہہ سکتی ہیں۔ ذلیل کُتے —— کیا تیری کوئی بہن نہیں، تیری ماں تو ضرور ہوگی، جا اپنی ماں سے کہہ —— تو ایسی بات کہہ سکے گا اپنی اماں سے۔؟ نہیں تو مجھے اپنی اماں سمجھ لے۔ میں نے تجھے دُودھ نہیں پلایا۔ میں نے تجھے لوریاں نہیں دیں۔ تیرے کانوں میں وہ میٹھے گیت نہیں اُتارے، لیکن وہ لوریاں جو تیری ماں نے تجھے سُنائی ہوں گی میں بھی جانتی ہوں۔ میری چھاتیوں میں بھی دُودھ کی دھاریں موجود ہیں۔ آ —— قریب آ مجھ سے کہہ اماں ——

وہ کچھ نہیں کہتیں۔ ہنسی اُن کے لبوں میں آ کر سما جاتی ہے۔ کتنی بھولی ہوتی ہیں وہ —— میرے منہ کی بدبو کو خوشبو کہتی ہیں، میرے میلے کچیلے دانتوں کو دیکھ کر بھی وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔ جب میں ان میں سے کسی ایک کے ہاں جاتا ہوں وہ مجھے آتا ہوا دیکھ کر مُسکراتی ہوئی اُٹھتی ہے میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کی یہ مُسکراہٹ جھوٹی اور بناوٹی ہے، محسوس تک نہیں کرتا۔ وہ میرے قریب آ جاتی ہے۔ میں اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں وہ پھر شرما جاتی ہے۔ خاموشی اُس پر مسلّط ہوتی ہے جی چاہتا ہے تو میں اُس کے پوڈر سُرخی سے لدے ہوئے رخساروں کے دو چار بوسے لیتا ہوں۔ دو چار منٹ کی خاموشی کے بعد اُس کی جانب سے سوال ہوتا "کیا سُنیں گے آپ، دادرا، ٹھمری یا فلمی گیت؟" میں یہ فیصلہ ہمیشہ ہی اُس کی مرضی پر

چھوڑ دیتا ہوں اور وہ ہمیشہ ہی کوئی عام فلمی گیت شروع کر دیتی ہے۔ کیونکہ اُس میں محنت کم اور دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ خاموشی سے سنتا رہتا ہوں۔ جب وہ گاتے گاتے تھک کر چپ ہو جاتی۔ تو میں کہتا ہوں "خوب —— بہت خوب!" اِس مختصر سی تعریف سے وہ خوش نہیں ہوتی۔ ہاں میری جیب میں پڑے ہوئے نوٹوں کا خیال کر کے وہ مُسکرا کر کہہ اُٹھتی ہے "آداب —— آداب ——!" اور پھر وہ میری گود میں آ گرتی ہے۔ انگلیوں میں بنی ہوئی پان کی گلوری دبا کر کہتی ہے —— "آپ کو ہماری قسم ہمارے ہاتھ سے!" جی چاہتا ہے اُس کو حقارت سے جھڑک دوں۔ لیکن یہاں میں بے بس ہو جاتا ہوں اُس کی بناوٹ کو اچھی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ پان کھلا دیتی ہے اور نوٹ انگیا میں رکھتے ہوئے کہتی ہے۔ "اِس کی کیا ضرورت تھی؟" یہاں میرا جی چاہتا ہے۔ خوب چیخ چیخ کر کہوں۔ الّو کی پٹھی —— تجھے اِس کی کیا ضرورت ہے ——؟ تو اِس کے لئے مر رہی ہے، جان دے رہی ہے، عزت دے چکی ہے، زندگی فروخت کر چکی ہے۔ تو جس چیز کے لئے جی رہی ہے۔ اُسی کے لئے مر رہی ہے۔ تیرے دِل میں جو کھوٹی تڑپ اور آنکھوں میں زنگ آلود چمک ہے، وہ اِن ہی پھڑپھڑاتے ہوئے نوٹوں کے انتظار میں آج تک ٹکی ہوئی ہے یہ کاغذ کے رنگین ٹکڑے تیری رُوح ہیں، تیرا ایمان ہیں، تیرا خُدا ہیں۔

میں پھر بھی چُپ رہتا ہوں۔ آگے بڑھ کر اُسے دبوچ لیتا ہوں۔ اُس کا کچلا ہوا زنگ آلودہ گرم جسم میری آغوش میں پھڑک جاتا ہے۔ بے نام سی مہک اَن دیکھا جھکا میرے گرد باند پھیلا لیتا۔ وہ مانوس اور جانی پہچانی نگاہوں سے مجھے ٹٹولتی۔۔

اُس کی طرف سے سوال ہوتا۔ کیا ارادہ ہے پھر؟

میں کہتا "ارادہ؟ ارادہ تو تمہارے دم سے ہے"

"میرا ارادہ تو نیک ہے" وہ کہتی۔

میں ہنس کر کہتا "نیک ارادے والے تو بڑے بُرے ہوتے ہیں"

وہ شرما جاتی۔ یہ شرمانا بھی بناوٹی ہوتا۔ میں اُسے گدگدا دیتا۔ ایک جانا پہچانا کمرہ ہمیں اپنی گود میں لے لیتا۔ وہ بے دم سی ہو کر پلنگ پہ گر جاتی۔ کمرے کے تین دروازے میں خود ہی بند کر دیتا۔ یہاں اُس کی بناوٹی شرم اور فقروں سے مجھے کافی اُلجھن ہوتی ہے۔ ایک دو کی نہیں۔ تقریباً سب کی یہی عادت ہوتی ہے۔ بدن کے کپڑے زمین پہ آ گرتے۔ اُلٹی پلٹی سانسیں ہوائیں منتشر ہو جائیں اور —— وہاں کی ہر چیز سے مجھے نفرت ہو جاتی۔

محسوس ہوتا کہ کونے میں رکھے ہوئے گلدان کے دانت نکل آئے ہیں، اور وہ مجھے کاٹنے آ رہا ہے۔ پردے کے پیچھے ہزاروں ننگی تلواریں ناچ رہی ہیں اور بہ جیرہ برہنہ پڑی ہے ـــــ ایک سڑی ہوئی لاش ہے اور میں اس مُردہ لاش پر رینگتا ہوا غلیظ کیڑا۔

میں بھاگ آتا ہوں یہ سوچ کر کہ اب کبھی وہاں نہ جاؤں گا۔ لیکن دوسری اتوار سے پہلے میں وہاں جا موجود ہوتا۔

کچھ دن گذرے مجھے معلوم ہوا کہ دکن کی کوئی کم سن حسین اور نازک کلی فسادات میں مجبور ہو کر یہاں آئی ہے۔ اپنے دوسرے کاموں کو چھوڑ کر میں پہنچا۔ واقعی وہ حسین تھی، نازک تھی اور خوبصورت تھی۔ دو چار ملاقاتوں میں وہ گھل مل گئی۔ کل تو نہیں ہاں پرسوں میں اُس کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ ایک بڑھیا جسے میں قدر دان کہتا ہوں، دوڑتی ہوئی آئی اور اُس کے کان میں کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہہ کر چلی گئی۔

وہ بولی: "آپ ذرا میرے کمرے میں چلیں۔ میں ابھی آئی"

بات بُری تو معلوم ہوئی، لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئی مسکرا کر کہا۔ "وہ آئے تھے نواب صاحب ـــــ امّاں کہہ رہی تھیں کہ نواب بھی ہیں اور شہر کے بڑے لیڈر، لاکھوں روپیہ ہے اُن کے پاس، ہر وقت سونے چاندی میں کھیلتے ہیں اور دو موٹریں ہیں، ان کے گھر میں لوگ چاندی چباتے ہیں چاندی!"

"اچھا ـــ" میں نے اُس کی باتوں میں دلچسپی لی۔ وہ قریب آ کر بے تکلفی سے لپٹ گئی۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں آئے تھے وہ نواب صاحب؟" وہ شرمائی۔

میں نے کہا۔ "ارے ہم سے کیا چھپانا ہم تو دائی ہیں بالکل!"

رُکی رُکی آواز میں بولی: "اپنے کام سے ـــ!"

"کام سے؟" میں ہنس دیا: "بتاؤ تو سہی کیا کام تھا آخر؟"

بڑی مشکل سے بتانے پر راضی ہوئی بولی: "الگ کمرے میں وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ امّاں نے مجھے اُس کمرے میں بھیج دیا۔ عجیب تھے۔ بھاری بھاری بدن، سیاہ مونچھیں، دائیں گال پر مسّا، مُنہ میں پان، ہونٹوں پر رینگتی ہوئی سُرخ پیک، ہاتھ میں پان کی ڈبیا ـــــ آنکھوں سے وحشت اور درندگی ٹپک رہی تھی۔ میں قریب آ گئی تو دیوانوں کی طرح مجھے دبوچ لیا۔ بلّی بھی

کیا تیزی دکھاتی ہوگی جھپٹتے ہوئے چوہے کو پکڑنے میں، میری ہڈی ہڈی چرچرا کر رہ گئی۔ اُن کے منہ سے رال بہہ گئی۔ آنکھیں میرا خون اُبل آیا۔ ایک لرزہ سا اُن کے جسم میں پیوست ہو گیا تھا۔ بولے "جلدی سے کواڑ بند کر دو۔" میں نے کواڑ بند کر دیئے تو بولے: "ارے کوئی دیکھتا تو نہیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں"

پھر بولے۔ "دیکھو تمہیں یقین ہے نہ؟"

خوف سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے فرش پر گرتے ہوئے گدھ کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کا جوش ہوا کے تیز جھونکے کی طرح نکل گیا۔"

وہ کچھ اور کہتی۔ میں نے روک دیا۔ پوچھا "کیا دیا اُنہوں نے؟"

"سو روپیہ ـــــ کہتے تھے پھر آؤں گا۔ کوئی فرمائش ہو تو بتا دو۔ میں نے کہہ دیا۔ ویسے تو سب کچھ موجود ہے اللہ کا دیا۔ بس آپ کی خوشی ہے جو مرضی آئے۔"

بارش تیز ہو گئی تھی۔ میں نے اجازت چاہی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "آج رات یہیں رہ جایئے نہ۔"

میں نے کہا۔ "سو روپے نہیں میرے پاس"

بولی: "ارے ہم ہر ایک کے ہاتھ بکتے ہی نہیں، بلکہ کوئی ہمیں خرید بھی لیتا ہے"

"تو کیا میں نے خرید لیا ہے تم کو؟"

"ہوں"

صبح اُٹھ کر آنے لگا تو بولی۔ اس شرط پر جا سکتے ہو کہ دوبارہ آنے کا وعدہ کرو۔"

میں نے پوچھا۔

"تم نے کیا سمجھا ہے مجھ کو؟"

مسکرائی "گاہک اور کیا ـــ؟ کوئی دینے والا کوئی لینے والا"

اب آپ ہی بتایئے میں کیوں نہ اُن کا گاہک بنوں۔ کیوں نہ وہاں سے زندگی بھر کے لئے آسودگی کی نعمت بٹور لاؤں۔ برسوں بیت گئے اور برسوں بیت جائیں گے۔ مجھے تو وہاں کوئی بُرائی نہیں مل سکی۔ ڈھونڈ رہا ہوں شاید کوئی بُرائی مل جائے یا آسودگی کی نعمت جمع کرتے کرتے ختم ہو جائے۔ تو میں اپنا رُخ بدل دوں۔

(طبع زاد)

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا (مومنؔ)

انکار

از جناب تشنہ بریلوی

کسی کی چشمِ فسوں بار نے اشارا کیا
ذرا سی دیر میں ناوک جگر کے پار ہوا
تخیلات کی دنیا میں آگیا طوفاں
مرا یہ دل بھی اسیرِ خیالِ یار ہوا

پلا دی مجکو وہ صہبائے مضطرب اُس نے
کہ اب لرزتا ہی رہتا ہے دل کا پیمانہ
تمام عالمِ امکاں سے رشتہ توڑ دیا
نظر کے سامنے رہتا ہے عکسِ جانانہ

مگر وہ میری محبت قبول کر نہ سکی
بس اک "نہیں" سے مرے دل کا شیشہ توڑ دیا
ادائے ناز سے ٹھکرا دیا مجھے اُس نے
غمِ فراق کے دوزخ میں مجکو چھوڑ دیا

یہ حزن و یاس جو پاتے ہو میرے شعروں میں
یہ درد یہ خلش اور یہ شکستگیٔ الم
یہ سرخوشی یہ جنوں یہ خمار یہ مستی!
اُسی نفی کی بدولت ہیں یہ سب اے ہمدم

نشیب و فراز

افسانہ

از

جناب اکرام لدھیانوی

کچھ یاد نہیں میں نے تمہیں پہلے پہل کب ؟ اور کہاں دیکھا تھا ؟
ایسا معلوم ہوتا ہے
جیسے ہم ایک نامعلوم مدت سے
ایک انجانی مدت سے
زندگی کے ہر گام پر پیچ و خم کھانے والی پگڈنڈیوں پر
ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہوں
دو ایسے مسافروں کی طرح
جو ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوئے بھی
ایک ہی راستے پر چلتے چلتے مانوس سے ہو گئے ہوں
راہی
جو سوچ بھی نہیں سکتے کہ سفر کا یہ لامتناہی سلسلہ کب ختم ہو جائے ۔
اور کب
ان میں سے کوئی ایک کسی الگ شاہراہ کا رخ کرے
ہم تم زندگی کے پر پیچ راستوں پر چلتے گئے
چلتے گئے
مگر کون جانتا تھا ؟
کہ ایک ہی راستے پر چلنے والے دو راہی کبھی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے
آخر
ان طویل راہوں میں ایک ایسا موڑ آ ہی گیا جہاں سے ہماری راہیں بالکل الگ ہو گئیں ۔
اور تم
میرے سینے پر ایک گہرا گھاؤ چھوڑ کر ، اپنا راستہ الگ کر گئیں ۔
اور ، اب
سنجانے ہمارے درمیان کتنی بستیاں آباد ہیں
کتنی دیواریں حائل ہیں

دیواریں
ہونہہ
میری زندگی کا سفینہ غم و یاس کے عمیق سمندر میں ڈوبنے لگا ۔
موجیں آتی
اور جاتی رہیں
حوادث کے طوفان آئے
اور ـــــ چلے گئے
لیکن میں
ایک بے جان
اور شاید مضبوط
چٹان کی طرح کھڑا رہا
آندھیاں چلیں ....طوفان آئے ... موت نے جبڑے کھول دیئے
لیکن
میرے ماتھے پر شکن نہ پڑی
میری پیشانی پر بل نہ آیا

~~~

تمہیں یاد ہو گا ـــــ
ایک دن
ہم سب تمہارے بھیا کی شادی پر آئے ہوئے تھے ـــــ تم کتنی خوش خوش نظر آ رہی تھیں
سرخ لباس میں تمہارا گورا گورا چہرہ ـــــ جیسے ـــــ شام کے تاریک دھندلکوں میں سے
ـــــ کہیں دور افق کے اُس طرف آکاش پر پھیلی ہوئی سرخ شعاعوں سے ماہِ تاباں کسی شرمیلی دلہن کی طرح گھونگھٹ اٹھا رہا ہو
تم نے میری طرف دیکھا
~~~

آنکھیں چار ہوئیں
تم مُسکرائیں
اور نہ جانے زبانِ بے زبانی میں کیا کیا باتیں ہوگئیں

پیاری پیاری
میٹھی میٹھی، باتیں
کسی کہسار کی آغوش میں مچلتی ہوئی ندّی کے شیریں ترنّم کی طرح تم جانے کیا کہہ کر بھاگ گئیں
تمہارے الفاظ کی موسیقیت اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے
تم بھاگ گئیں
جیسے وادی میں کوئی الّھڑ ہرنی
تم ایک بار پھر آئیں
شرمیلی آنکھوں میں شوخی اور معصوم ہونٹوں پر تبسّم کی لہر لئے ہوئے
نظریں ملیں اور جھک گئیں
میرے خرمنِ دِل پر بجلیاں گر گئیں
میں اپنے دل میں ایک میٹھی کسک لئے۔ دن بھر رنگین — سُہانے خواب دیکھتا رہا

خواب
جوانی کے خواب
جو شاید بیداری میں بھی دیکھے جاتے ہیں
اس کے بعد؟
برات چلنے کا وقت آن پہنچا
موٹریں آئیں
دولہا والی موٹر میں میں پہلے ہی سے جا بیٹھا۔ سب لوگ موٹروں میں دھنسنے لگے۔ سلمیٰ میرے پاس بیٹھنے کے لئے ضد کرنے لگی۔ لیکن میں نے ڈانٹ دیا۔
اور بیٹھا رہا
تم آئیں —— میں پہلے ہی سے تمہارا منتظر تھا
تم گہرے رنگ کے آسمانی سوٹ میں ملبوس تھیں —— میں نے تمہیں جگہ دے دی —— بالکل اپنے پہلو میں —— تم شرمائی ہوئی سی.... سُکڑی سمٹی بیٹھ گئیں۔ ہمارے جسم بہت قریب تھے۔
جوان جسم! اُف! مجھے جیسے تمہارے جسم سے آنچ آنے لگی۔ تم تیز تیز سانسیں لینے لگیں۔ ہمارے انفاس میں الجھن پیدا ہوگئی۔

گاڑی کے ایک ہلکے سے ہچکولے سے ایک لمحہ کے لئے گویا ہم ایک دوسرے سے بالکل قریب ہوگئے
بالکل قریب!
چڑھتا ہوا شباب کبھی تھکے ہوئے مسافر کی طرح گرا پڑتا تھا۔
موٹر گھومی۔ ایک ہچکولا اور آیا
ایک پل کے لئے
میرے کانپتے ہوئے ہونٹ
تمہارے پھول ایسے گلابی رخسار سے جا ملے
تم شرما گئیں
موٹر کی کھڑکی سے ہلکی ہلکی چاندنی اندر جھانک رہی تھی۔ تمہارے چہرے کے شہابی رنگ کا اُتار چڑھاؤ اور نمایاں ہوتا چلا گیا۔ جذبات انگڑائیاں لینے لگے۔
وفورِ جذبات سے تمہاری آنکھوں کے لال لال ڈورے کچھ اور گہرے ہوگئے۔
میرے ہاتھ بے اختیار تمہارے گداز جسم کو مس کرنے لگے۔
ہولے ہولے —— ہلکے ہلکے ---
تمہارا گدرایا ہوا جسم —— اُف!
جیسے کائنات کی تمام رعنائیاں سمٹ آئی ہوں
جوانی کی تپش —— اور دو صحت مند جسم اس قدر قریب ——
ہم مدہوش ہوئے جا رہے تھے
شدتِ جذبات سے تمہاری حالت کسی مدہوش شرابی کی سی ہو رہی تھی
اچانک کار رُکی
ہمیں جیسے کسی نے کچی نیند سے جگا دیا ہو
تم بوکھلائی ہوئی سی ایک دم باہر نکل گئیں
اور —— شیشے ٹوٹ گئے
پھر ہم پلیٹ فارم پر پہنچے۔ گاڑی میں پہلے ہی سے کمپارٹمنٹ ریزرو ہو چکے تھے
تم نیچے کے برتھ میں میرے برابر بیٹھ گئیں۔
گاڑی چلی
مجھے یاد ہے —— میں شاید تمہیں پریوں کی کوئی کہانی سُنا رہا تھا۔
تم سُنتی جاتیں اور کہیں کہیں معصومیت سے کوئی عجیب سا سوال کر بیٹھتیں۔

میں مسکرا دیتا۔
اور کہانی پھر شروع کر دیتا
پھر میں اچانک کسی انجانے خوف کے زیر اثر چپ ہو جاتا۔ میرے ذہن میں خیالات چکر لگانے لگتے۔
میں سوچتا ——
کتنی بھولی ہو تم .....
کتنی معصوم !! —— اب تک کہانیوں کا اتنا شوق ہے۔
میرے دماغ میں بہت سے الجھے الجھے سوال ابھرنے لگتے
رات زیادہ جا چکی تھی۔ قریب قریب سب لوگ سو چکے تھے
بتی گل ہوئی
گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ بڑھتے بڑھتے ہمارے دلوں کی دھڑکنوں کی ترجمان ہونے لگی۔
کہانی چل رہی تھی
تم کبھی کبھی ہوں ہاں کر دیا کرتیں
شاید تمہیں نیند ستا رہی تھی
تم ایک بار جھول گئیں۔ شاید نیند کے خمار سے
لیکن
نہ جانے کس خوف سے تم سو نہ سکیں
تم نے ایک حسین انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھائے
اور نہ جانے کیوں
مسکرا کر ہاتھ گرا دیئے
کھڑکی سے ہلکی ہلکی چاندنی اندر جھانک رہی تھی —— شریر چاندنی
شریر چاندنی کبھی کبھی تمہارا منہ چوم جاتی
چاند مسکرا کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا
گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ ماحول کے سکوت سے، ایک بار پھر ابھرنے لگی
ایک بار پھر ——
مجھے تمہارے اس قدر قریب ہونے کا احساس ہونے لگا
شوخی بے باکی پر اکسانے لگا
میں تمہاری عنبریں زلفوں سے کھیلنے لگا
کتنا دلچسپ تھا وہ کھیل
کتنے پیارے تھے وہ دن ——

جن کی یاد
آج آنسو بن کر بہہ رہی ہے
گاڑی اچانک رک گئی
بتی روشن ہوئی
تمہارے بھیا نے جنگل میں کھڑی ہوئی گاڑی سے باہر گردن نکال دی۔
جذبات کی سنہری زنجیریں یکبارگی جھنجھنا کر ٹوٹ گئیں۔

~~~ * ~~~

برات کے ساتھ وہاں ہم لوگ تین دن تک ٹھہرے۔ مجھے اسلم کی بے تکلفی نے دم نہ لینے دیا
تم زنانے میں سے آ نہیں سکتی تھیں۔
اس طرح ہماری وہاں ملاقات نہ ہو سکی
اتنے ہی دنوں میں میری زندگی میں ایک کبھی پر نہ ہونے والا خلا پیدا ہو گیا۔

~~~ * ~~~

واپسی پر مجھے لدھیانہ ہی میں اتر جانا تھا
گاڑی اسٹیشن پر ٹھہری
رات زیادہ جا چکی تھی
تم سو رہی تھیں
میں نے تمہارے چہرے پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی
اور اتر گیا۔
گاڑی کے ساتھ ساتھ میری تمناؤں کی دنیا چلی گئی

~~~ * ~~~

میں لدھیانہ میں پڑھ رہا تھا۔
یونیورسٹی کے امتحان کے ساتھ ساتھ
زندگی کا امتحان قریب آ رہا تھا
نظریں کتاب پر ہوتیں
دماغ کہیں اور
میں اکثر فضا کی تاریکیوں میں تمہارا روشن چہرہ ابھرتا ہوا دیکھتا

~~~ * ~~~

دل جانتا تھا کہ جو چنگاری
ہمارے سینے میں ازل سے دبی ہوئی تھی

آج
بھڑک اُٹھی ہے
لیکن باہمگانی تمہارے مُنہ سے اس کا صاف اقرار سُننے کے لئے بیقرار تھی

اس کے بعد
میں اکثر لاہور آتا رہا
تم بھی گھر والوں کے ساتھ لدھیانہ آتی رہیں
اس عرصے میں
ہم ایک دوسرے کے قریب ہو چکے تھے
لیکن میرا ذہن یہ عقدہ کبھی حل نہ کر سکا
کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں
میں تمہارا چہرہ ہر وقت
شگفتہ ہی دیکھتا
میں نے تمہیں کبھی اُداس نہ دیکھا تھا
میں کھویا کھویا سا رہنے لگا
لیکن تم میں
کوئی تبدیلی نہ ہوئی
میں تمہارے رویّہ سے
محبت اور نفرت
کے مابین خلاؤں میں
بھٹک کر رہ گیا

دن گذرتے گئے
راتیں کٹتی گئیں
کہ ——
وقت نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا
ہمارا ساتھ چھوڑ دیا

ایک شام تم گھر میں اکیلی تھیں
میں تمہاری میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا
تم میز پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھیں۔
میں سر جھکائے لکھتا جاتا
کبھی کبھی تم کوئی حسین شرارت کر دیتیں۔
میں گردن اٹھاتا
اور
مسکرا کر پھر جھکا لیتا
کتنا حسین تھا وہ وقت
میں سوچ رہا تھا!
کاش
زندگی یونہی گذرے
یہ حسین لمحات سال اور صدیاں بن جائیں
میں لکھتا رہوں
تم میز پر بیٹھی اٹکھیلیاں کرتی رہو
اُسی شام، میں نے تمہارے گرد اپنی باہوں کا حلقہ
تنگ سے تنگ تر کر دیا
تم مچل گئیں
میں نے تمہارے گلابی ہونٹوں کو چوم لیا۔
تم ناراض ہو گئیں
اور ——
چلی گئیں
میں لاکھ بلاتا رہا
لیکن تم نہ آئیں
تم ایسی روٹھیں
کہ
پھر نہ منیں
میری دُنیا سے تم ایسی گئیں
کہ پھر آنے کا نام نہ لیا

سُنتا ہوں تمہاری شادی ہو رہی ہے
دل کہتا ہے
کاش!
تم ایک بار پھر میری دُنیا میں آجاؤ!

پھر خیال آتا ہے
تم اگر آ بھی جاؤ
تو شاید وہ ولولے نہ آسکیں

آرزوئیں پائمال ہو چکی ہیں
ارمانوں نے سسک سسک کر
دم توڑ دیا ہے
تمناؤں کے گھروندے مٹ چکے ہیں
ایک دن تھا!
میری زندگی لٹ رہی تھی
اور میں محوِ تماشہ تھا
ماضی کے کچھ حسین خواب
میری زندگی کے لئے ایک خلش بن کر رہ گئے ہیں
میں جی رہا تھا:
لیکن!
مرنے کے لئے
میں ہنس رہا تھا
خوب ہنس رہا تھا
شاید!
رونے کے لئے
ہنسی ——
ایک ایسی ہنسی
جس میں
آنسوؤں کا طوفان پنہاں تھا
میں آج بھی ہنستا ہوں
اور شاید
وقت کی انتہا تک ہنستا رہوں
آہ —— میرا ادھورا پیار —— (طبع زاد)

بے پیئے ڈوبتا جاتا ہوں نشے میں خوشتر!
میرے ساقی نے کچھ اس پیار سے دیکھا ہے مجھے

اے دوست سُن کہ۔

از محترمہ انجم صبیحی

خدا کرے مرے ارماں نہ زندگی پائیں
مجھے ہو فرصتِ شرح و بیاں خدا نہ کرے

خدا کرے کہ مرے راز گھٹ کے مر جائیں
ترے سوا ہو کوئی رازداں خدا نہ کرے

خدا کرے کہ مرے ہونٹ جل کے رہ جائیں
ترانے شوق کے گا پاؤں میں خدا نہ کرے

خدا کرے کہ غمِ کامیاب رسوا ہو
ترے سوا ہو کوئی چارہ گر خدا نہ کرے

خدا کرے نگہِ انتخاب رسوا ہو
اب اور ہو کوئی زیبِ نظر خدا نہ کرے

"ترے بغیر اگر آسکے قرار مجھے
خدا کرے کہ نہ راس آئے یہ بہار مجھے"

ٹ بہ تغیر یہ مطلع حضرت نازش پرتاب گڈھی کا ہے (انجم)

اب اس
سائیڈ بورڈ
کا رنگ
خوشنما ہو گیا ہے
ہاں... رنگ
آرڈر کرتے وقت
میں نے
برینڈ بتا دیا تھا
اچھے رنگوں کے لئے
شالیمار پینٹ
16 YEARS OF MANUFACTURING EXPERIENCE

دوراہے پر

افسانہ

از

جناب قمر محمود (علیگ)

تمہاری تیوری پر آخر بل کیوں پڑ گئے ہیں؟ اس لئے کہ میں تمہاری تصویر کو گھور کر دیکھ رہا ہوں؟ لیکن اس میں ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں میں نے تو تمہیں بہت زیادہ نزدیک سے دیکھا ہے۔ تمہاری گھٹتی ہوئی سانسوں کا لمس بھی محسوس کیا ہے۔ تمہارے کانپتے ہوئے ہونٹوں کی مٹھاس بھی چھینی ہے۔ پھر تم ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ لو! تم تو ناراض ہوتے ہوتے مسکرانے لگیں — شاید میری اس بکواس کی وجہ سے۔ اور کیوں نہ مسکراؤ۔ تمہارے پاس میرے لئے اس لطیف طنز آمیز تبسم کے سوا رہ بھی کیا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری یہ مسکراہٹ میری زندگی کی معراج ہے۔ کاش میں اسی حال میں رہوں اور تم اسی طرح مسکراتی رہو۔

ہاں۔ ایک بات تو سنو۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا ہے وہ تم سے اجازت لے کر کیا ہے۔ میں نے تمہیں اپنا کہا، کیونکہ تم کہلوانا چاہتی تھیں۔ اکثر میں نے تمہیں اپنی آغوش میں چھپا لیا ہے، کیونکہ تمہاری آنکھیں مجھے اس کی دعوت دیتی تھیں۔ بارہا میں نے تمہارے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے ہیں کیونکہ تمہارے ہونٹوں کی تشنگی یہی چاہتی تھی۔ اور . . . .

خیر چھوڑو، اب تک جو کچھ بھی ہوا، لیکن آج میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہیں اپنا کہہ رہا ہوں۔ تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں اپنی آغوش میں کھینچ رہا ہوں۔ تمہارے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جھکائے دے رہا ہوں۔ ایسا کرنے سے آج تم مجھے روک نہیں سکتیں —— تم مجھ سے دور ہو تو کیا تمہاری تصویر تو میرے سامنے ہے۔ اور یہ تصویر بھی نہ ہو تو تم سراپا میرے سامنے موجود رہتی ہو۔ تم چاہو تو اپنی تصویر لے سکتی ہو۔ کیونکہ میں اب خود کو اس منزل میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری تصویر سے پیار کروں۔ تمہاری تصویر کو سینے سے لگاؤں تمہاری تصویر میرے دل میں ہے —— دنیا نے تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ تم نے خود کو مجھ سے چھین لیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ میرے دل سے تو تمہیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تم خود بھی چاہو تو خود کو میرے دل سے نہیں چھین سکتیں۔

ہم دونوں کا تصادم بھی عجیب تھا۔ تم غالباً راستہ بھول کر میرے راستے پر آ گئی تھیں۔ تم ایک عرصے تک میرے ساتھ ساتھ چلتی رہیں، لیکن ہماری منزلیں مختلف تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ تم ایک کشادہ سڑک پر مڑ گئیں، جو گھوم پھر کر تمہاری منزل پر پہنچتی ہے۔ لیکن میں ہمیشہ کے لئے اپنی منزل سے بھٹک گیا۔ میں اسی دوراہے پر چھوڑ دیا گیا۔ جہاں سے تم نے اپنا راستہ بدلا تھا۔ میں اب بھی وہیں ہوں اور شاید کبھی بھی وہاں سے نہ ہٹ سکوں ——

تمہاری منزل عالیشان کوٹھیاں اور خوشنما عمارتیں ہیں۔ جن کی اونچی دیواریں غریبوں کے گوشت اور خون سے تعمیر کی گئی ہیں۔ جہاں روپئے کے انباروں کے نیچے شرافت و انسانیت کا نام ہمیشہ کے لئے دبا دیا گیا ہے۔ لیکن میری منزل غریب مزدوروں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں ہیں۔ جو ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے تعمیر کی گئی ہیں —— میں اپنی منزل کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ میں غریب مزدوروں کے غریب لیکن پُر حوصلہ دلوں میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں، لیکن مجبور ہوں۔ زندگی کے اس دوراہے پر میرے پیر ہمیشہ کے لئے باندھ دیئے گئے ہیں۔ میری آنکھیں مفلس مزدوروں اور غریب کسانوں کے مایوس چہروں کا جائزہ لے رہی ہیں، لیکن دل نفرت کے باوجود تمہارے اور تم جیسے دولتمندوں کے دلوں میں گھسنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے —— لیکن اب میں تمہاری منزل کی طرف نہ بڑھ سکوں گا۔ میں تمہیں زندگی کے اس موڑ پر گھسیٹ لاؤں گا۔ جہاں سے تم نے میرا ساتھ چھوڑا تھا۔ پھر ہم اور تم ساتھ ایک منزل کی طرف، ایک ہی راستے سے جائیں گے وہی منزل —— جہاں انسان ہوں گے۔ انسانیت ہوگی، جہاں کی ہر چیز انسانیت اور انسانوں کے لئے وجود پذیر ہوگی۔ جہاں مزدوروں اور کسانوں کے خاموش دل اپنی خاموش زبانی کے باوجود کوئی پیغام دیتے رہیں گے۔ جہاں محبت میں خلوص ہوگا اور خلوص میں عقیدت اور محبت۔

ارے! تم اور بھی زیادہ ناراض ہونے لگیں۔ اس لئے کہ میں نے یہ خیال کیا کہ میں کبھی تمہیں اپنے راستے پر لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا

اگر میرا خیال غلط بھی ہے تو تمہیں ایسا نہ کہنا چاہئے۔ تمہیں اس پر ناراض تو نہ ہونا چاہئے۔ یہ میرا ایک مبہم سا گمان ہی سہی، لیکن تمہیں میرا دل اور زیادہ نہ دُکھانا چاہئے۔ تم سے میری یہی التجا ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے صرف اسی توقع پر ایسی دوراہے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے دو۔ اسی اُمید پر مجھے اپنی زندگی کے باقیماندہ دن گذارنے دو۔

تم نے مجھ سے کبھی وعدہ کیا تھا کہ تم ہمیشہ میرے راستے پر میرے ساتھ گامزن رہو گی۔ لیکن تم نے میرے راستے کو خطرناک اور دشوار گذار پایا۔ اور اپنی شاہراہ کو بالکل صاف اور بے خطر پایا۔ لیکن تم اتنا نہ سمجھ سکیں کہ میری پُرخطر اور دشوار گذار راہ کو طے کرنے کے بعد انسان راحت بخار اور کامیاب زندگی گذار سکتا ہے، کیونکہ اُسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ تمہاری منزل پر پہنچنے کے لئے ہموار راستوں کو طے کرنا تو آسان ہے، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اُن کے سامنے ثابت قدم رہنا ہر شخص کا کام نہیں۔ تمہیں اس چیز کا تجربہ نہیں ہے۔ تم اپنی ہموار راہ کو خوشی خوشی طے کر رہی ہو، لیکن آنے والی دشواریوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو سکو، جب تمہارا یہ اقدام صحیح ہو گا۔ اُس وقت میں بھی شاید اس کامیابی پر تمہیں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں کو پھر یکجا کر کے بطور نذر پیش کر سکوں۔

ہیں! یہ تمہیں کیا ہوا؟ تم تو اور بھی زیادہ بگڑنے لگیں۔ تمہارے چہرے کی شکنیں تو اور بھی زیادہ حسین ہوتی جا رہی ہیں ——— اوہ! تم اس لئے بگڑ رہی ہو کہ میں یہ سب کچھ تم سے انتقام لینے کی غرض سے کہہ رہا ہوں۔ بھلا یہ بھی کیسا عجیب خیال ہے۔ اوّل تو انتقام لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر تم ایسا ہی سمجھتی ہو تو پھر میں یہ کہوں گا کہ انتقام تو میں وقت سے پہلے ہی لے چکا ہوں۔ لیکن سب سے بڑا سوال تو یہی ہے کہ آخر میں انتقام لوں تو کس لئے؟ تم نے کیا ہی کیا ہے؟ تم نے سب کچھ وہی تو کیا جو تمہیں کرنا چاہئے تھا۔ بھلا تم اپنی منزل کے کشادہ اور ہموار راستے کو چھوڑ کر میری پُرخطر پگڈنڈی پر خود کو کس طرح جانے دیتیں۔ اب تمہاری زندگی "زندگی" ہو گی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ تم اپنا ساتھی ایسا چُن سکو گی جس کی منزل وہی ہو گی جو تمہاری ہے اور پھر اُس سے میرا کیا مقابلہ۔ میرے مقابلے میں اُس کے دل میں زیادہ گرمی پاؤ گی تم — اُس کے ہونٹوں میں، اُس کی آغوش میں اور سب سے زیادہ اُس کی جیبوں میں تم کو مجھ سے کئی گُنی زیادہ گرمی ملے گی۔

کل میرا ایک دوست آیا تھا۔ اُس کی حالت بہت زیادہ بدل چکی ہے

پہلے وہ حسین اور شگفتہ تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور کھلنڈری قسم کا نوجوان تھا لیکن اب اُس کے چہرے پر مسکراہٹ اور شگفتگی کی جگہ افسردگی اور مایوسی ہے۔ اُسے تمہاری ہی ایک بہن نے لوٹ لیا ہے۔ تمہاری بہن کہنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح اُس کے جسم اور جذبات سے کھیلتی رہی، اور جب اُس کی جیب خالی ہو چکی تو اُسے ٹھکرا دیا۔ تم میں اور اُس میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ایک پیشہ ور طوائف ہے۔ بازار میں بیٹھتی ہے اور تم ایک 'شریف' طوائف ——— گھر میں بیٹھنے والی۔

اُف! یہ میں کیا کہہ گیا۔ بُرا نہ ماننا۔ میرا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ اکثر بغیر سوچے سمجھے نہ جانے کیا کیا کہہ جاتا ہوں۔ معاف کر دو مجھے۔ خدا کے لئے معاف کر دو ——— اپنے لئے معاف کر دو مجھے۔ میں شاید اس غلطی کا اور ایسی ہی دوسری غلطیوں کا کفارہ کبھی بھی ادا نہ کر سکوں۔

اچھا، یہ تو بتاؤ تم مجھ سے دُور بھاگنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ لو میں نے تمہاری تصویر کو بہت دُور رکھ دیا۔ لیکن اب تو تم مجھ سے اور بھی زیادہ نزدیک آ گئیں۔ اب تمہیں بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تم سے جتنا دُور ہٹتا جاتا ہوں اُتنا ہی قریب ہوتا جاتا ہوں۔

تم میرے اس مبہم خیال پر مسکرا دیں۔ خدا جانتا ہے وہی مسکراہٹ ہے جو پہلے تھی۔ تم تو اب بھی بالکل وہی ہو، وہی ہنسی، وہی غصّہ۔ تمہاری ..... عادتیں ذرا بھی تو نہیں بدلیں۔ تمہاری بڑی بڑی شربتی آنکھیں اب بھی وہی ہیں۔ تمہارے گلابی گلابی ہونٹ۔ تمہارے سیاہ بال سب کچھ تو وہی ہے۔ تم خود بھی وہی ہو، لیکن تمہارا دل بدل گیا ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ دل تو نہیں بدلا البتہ دل میں میری جو جگہ تھی وہ کسی دوسرے نے لے لی ہے۔ خیر جی، مجھے اس سے کیا۔ میرے دل میں تو تم موجود تھیں، موجود ہو اور ہو گی!

ارے ارے۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟ مجھ سے خود کو چھپا رہی۔ پردہ کر رہی ہو ——— ایک اجنبی سمجھ کر ——— ہاں واقعی اب میں تمہارے لئے ایک اجنبی سے زیادہ کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تو تم پردہ کر رہی ہو، لیکن اُس وقت تمہیں پردے کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی، جب تمہارا جسم برہنہ ..... خیر جانے دو۔ ان باتوں سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔

اب تو تم واقعی بہت زیادہ ناراض ہو گئیں۔ اب میں تم سے ایسی باتیں نہ کروں گا۔ لو، تمہاری تصویر پر بھی کپڑا ڈال دیتا ہوں۔ برہنہ جسم کا خیال آتے ہی ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے تمہاری تصویر ننگی ہو گئی۔ اچھا، بس: اب میں تمہاری تصویر کبھی نہ دیکھا کروں گا۔ یہ اب ہمیشہ کپڑا اوڑھے رہے گی۔ اس پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا۔ اب ۔ لیکن تصویر پر پردہ پڑ جانے سے تم پر اور تمہاری [illegible] ......!!! ([illegible])

محبوب کے نام

از۔ جناب بشیر ملاٹھوی

یہ رنگ زیست کا ہے مری جاں ترے بغیر
شیرازۂ سکوں ہے پریشاں ترے بغیر

بے رنگ حسنِ صحنِ گلستاں ترے بغیر
بے کیف جلوۂ مہِ تاباں ترے بغیر

کیا لطفِ زیست ہے اے غمِ جاناں ترے بغیر
بے سوز جب ہے سازِ رگِ جاں ترے بغیر

رہ جائے ناتمام نہ اے حسنِ دل نواز
افسانۂ حیات کا عنواں ترے بغیر

پھولوں میں تازگی ہے نہ غنچوں میں دلکشی
صحنِ چمن بنا ہے بیاباں ترے بغیر

تنگ آگئے ہیں جینے سے اے جانِ زندگی
برپا کیا ہے غم نے وہ طوفاں ترے بغیر

اے جانِ آرزو تجھے شاید خبر نہیں
ہے نالہ کش بشیرِ غزلخواں ترے بغیر

دورانِ تمنّا

از۔ جناب اخگر مشتاق رحیم آبادی

اللہ رے یہ معجزہ و شانِ تمنّا
وہ جانِ تمنّا بھی ہے قربانِ تمنّا

پی پی کے مئے جامِ زر افشانِ تمنّا
ہر سانس نشہ میں ہے غزلخوانِ تمنّا

دن رات وہی ایک ہی موضوعِ سخن ہے
اللہ رے زیبائشِ عنوانِ تمنّا

اب شام و سحر کی بھی یہاں کس کو خبر ہے
بیخود ہوں نہ سایۂ دامانِ تمنّا

رخصت ہوئی ناکامی و حرماں کی شبِ تار
چمکا ہے افق پر مہِ تابانِ تمنّا

ناکامیٔ الفت سے جو اک داغ تھا دل میں
وہ داغ ہے اب شمعِ شبستانِ تمنّا

ہر گام پہ امید کے فانوس ہیں روشن
اللہ رے یہ عہدِ درخشانِ تمنّا

لذاتِ دو عالم سے بھی بڑھ کر نظر آئی
صدقے ترے اے شورشِ پنہانِ تمنّا

ہر وقت وہی دھن ہے، وہی فکر، وہی ذکر
کس درجہ ہے دلچسپ یہ دورانِ تمنّا

افسانہ

چاندنی

از

جناب اسحاق ادیب رام نگری

اُس دِن میں اور چندا مخملی گدّے پر نیم دراز سے پڑے ہوئے کھڑکی سے آنے والی بسنت کی مدماتی ہوا کی لہروں پر جھول رہے تھے اور اپنے جوان جذبات کی کہانی آنکھوں کی زبانی ایک دوسرے کو سُنا رہے تھے ساری دُنیا کو بھول کر میں چندا میں اور چندا مجھ میں کھوئی ہوئی تھی۔ ہم دُنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے کو سورگ میں محسوس کر رہے تھے۔

چندا کو پاکر جیسے میں نے سب کچھ پالیا تھا میں بار بار اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا اور ہر بار دِل ہی دِل میں اُس کا نام رکھنے والے کو سراہتا جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے کوئی شاہکار تیار کیا ہو۔ اور کسی باکمال شاعر نے اُس سے بھی دلکش اُس کا نام ——— اُس کا عنوان تجویز کر کے اُس شاہکار کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے ہوں۔

چندا طوائف ہوتے ہوئے بھی شرم وحیا، معصومیت وسادگی، شرافت اور سلیقہ مندی کا پیکر تھی۔ اُس کی رفتار وگفتار اور طور وطریق سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ طوائف پیدا نہیں ہوئی تھی، بلکہ بنائی گئی تھی اور بننے پر مجبور کر دی گئی تھی جس طرح کسی شاعر، ادیب یا مصوّر کو بہت بلندی سے سر کے بل گرا دیا گیا ہو اور وہ مر تو نہ سکا ہو، لیکن دماغ خراب ہو جانے سے پاگل ہو گیا ہو۔ پھر بھی اُس کی فطرت جگہ جگہ سے جھلکی پڑتی ہو۔

اُس کی اور میری پہلی ملاقات بھی عجیب ڈھنگ سے ہوئی تھی اور یہ ایک دن گھر میں پڑے پڑے اُکتا کر شام کے وقت میں بازار کی طرف نکل پڑا۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا میں ایک گلی سے گذر رہا تھا کہ یکا یک ایک بوڑھا جھجکا ہوا سا میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ انداز، قد و قامت اور چال ڈھال سے کوئی فوجی پنشنر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا جسم ایک پرانے فوجی اوورکوٹ سے ڈھکا ہوا تھا جو جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اُس کا خاکی صافہ بھی اُس کے جھرّی دار چہرے کی طرح جگہ جگہ سے جھول رہا تھا میں راستہ کاٹ کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول اُٹھا "آداب عرض ہے بابو جی!"

میں نے چونک کر اس نا آشنا آداب کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کہئے ———!" اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے ایک بار اپنی جہاں دیدہ اور تجربہ کار آنکھوں سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر جھینپتے ہوئے بولا "آپ سے کچھ عرض کرنا تھا۔ عرض کرنا کیا، کچھ تکلیف دینی تھی۔ اگر آپ تھوڑا سا وقت دے سکیں تو ———"

"فرمایئے فرمایئے!" میں نے نہایت خندہ پیشانی سے پوچھا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ"۔ اُس نے گردن جھکا کر کہا "مجھے انگریزی میں ایک ضروری چٹھی لکھانی تھی۔ بس اتنی ہی زحمت آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ پاس ہی کی گلی میں میرا مکان ہے۔ صرف چند قدم تکلیف کر سکیں تو ——— میرا بہت بڑا کام ہو جائے!"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک بار تشکر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر چل پڑا۔ میں بھی اُس کے پیچھے چلنے پر مجبور سا ہو گیا۔

کچھ ہی دُور جا کر وہ ایک شاندار مکان میں گھسا۔ مجھے دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بولا "ہاں ہاں ۔ بے تکلف تشریف لایئے بابو۔ اِسے اپنا ہی گھر سمجھئے!" اور سیڑھیوں سے گذر کر بالائی حصّے میں ایک اچھے خاصے سجے سجائے کمرے میں پہنچ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آواز دینے لگا۔ "بیٹی ——— اے بٹیا!"

دوسرے ہی لمحہ سامنے کے دروازے سے ایک حسین دوشیزہ جیسے شباب کے بوجھ سے لچکتی، بل کھاتی ہوئی نکلی اور خوفزدہ ہرنی کی طرح ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اُس کی مخمور آنکھوں کا تیز نشہ سارے کمرے پر چھا گیا۔ میں خود بھی حُسن وشباب کے اُس امڈتے ہوئے دھارے میں ڈوب سا گیا۔ اتنے میں بوڑھا لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "آپ آئے ہیں بیٹی!" پھر فوراً ہی چونک کر بولا "ارے۔ کاغذ لانا تو بھول ہی گیا۔ خیر۔ تشریف رکھئے۔ میں نیچے کی دکان سے ابھی لے کر آیا معاف کیجئے گا۔ غلطی ہو گئی۔" پھر دروازے تک جا کر مڑ کر بولا "بیٹی۔ آپ کو سگر

الائچی پیش کرد۔ میں ابھی آیا" اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں اُتر گیا۔

کچھ دیر تک تو میں خود سے بے خبر اُسی پیکرِ ناز و جمال کو دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک کچھ جھینپ کر بولا۔ اوہ — آپ ابھی تک کھڑی ہیں؟ تشریف رکھئے نا"

"ہاں"! وہ بھی جیسے گہری نیند سے چونک کر بولی۔ دیکھئے تو میں ابھی تک سگرٹ اور الائچی بھی نہیں لائی" اور پاس ہی کی الماری کھول کر ایک طشتری میں الائچی اور سگرٹ سجانے لگی۔

میں نے کہا "تکلف نہ کیجئے"

"اوہ۔ اتنی بھی خدمت نہ کر سکی تو —"! وہ آنچل کے کونے سے کھیلتی ہوئی بولی۔

میں نے کمرے کی سجاوٹ اور اُس کی شاندار پوشاک اور اُس کے طور و طریق کو دیکھتے ہوئے دبی زبان سے پوچھا "یہ بوڑھا آپ کا کون ہے؟ نوکر یا —؟"

وہ کچھ جھینپی اور لجاتی ہوئی بولی "جی نہیں — وہ — میرے مالک ہیں"

"مالک —؟ میں چونک کر بولا۔ "وہ بڈھا اور آپ کا —؟"

"اصل میں — یہ — میرے رُوپ اور جوانی کی — دکان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے ہیں"! وہ جیسے پسینہ پسینہ ہوگئی۔

میرے اُوپر پہاڑ سا ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ہی نفرت اور حقارت سے مجھے وہاں بیٹھا رہنا دشوار معلوم ہونے لگا۔ میں جھٹکے سے اٹھ کر زینے کی طرف بڑھا۔ پچھلے دروازے تک اُس کی اصرار بھری آواز کان میں گونجتی رہی۔ لیکن میں نے سیدھے گھر ہی آکر دم لیا۔

پلنگ پر لیٹ کر سکون حاصل کرنے کے لئے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ان چند ہی لمحوں میں مجھ میں کچھ عجیب انقلاب ہوگیا تھا۔ میرے دل و دماغ کی کچھ عجیب ناقابلِ بیان سی کیفیت ہو رہی تھی۔ میری بند آنکھوں میں وہی صورت بار بار گھومنے لگی جس سے نفرت کر کے میں ابھی بھاگ آیا تھا۔ اور صاف صاف کیوں نہ کہوں کہ مجھے محسوس ہونے لگا، جیسے پہلی ہی نگاہ میں اُس نے مجھے اپنا لیا ہے اور میں اُس پر فریفتہ ہوگیا ہوں۔ مجھے اُس سے محبت ہوگئی ہے۔

ساتھ ہی دل کے کسی گوشے سے ہلکی سرگوشی سی سنائی دی — "اچھا تو آپ عشق فرمانے لگے ہیں؟ ایک رنڈی سے؟ جس کے پاس نہ تو دل نام کی کوئی چیز ہوتی ہے اور نہ دل کی کوئی قیمت جس کی شاطر آنکھیں اپنے یہاں آنے والے کی صرف جیب کا وزن دیکھتی ہیں اور اُسی کے مقابلے میں خود کو تولتی ہیں۔ جوں جوں جیب کا وزن گھٹتا جاتا ہے۔ اُس کا وزن بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پتھر کی بھاری چٹان بنتی جاتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُسے نہ تو سرد آہوں کا طوفان ہلا سکتا ہے نہ گرم آنسوؤں کا سیلاب جنبش دے سکتا ہے"

لیکن میرے احساسات میں جو طوفان اُٹھ چکا تھا، اُس میں دل کی یہ نصیحتیں اور سرگوشیاں گم ہو کر رہ گئیں اور تیسرے دن رات کی گہری تاریکی میں یک بہ یک میرے مضطرب پاؤں گھر سے باہر نکل پڑے۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد میرے اضطراب کو چندا کی آغوش میں سکون مل گیا۔

ہم دونوں بسنت کی مخمور ہوا کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ میری عقل و خرد چندا کے حسن و جوانی کی شراب سے بے خود ہو رہی تھی اور چندا میرے جذبات کی تیز دھار میں بہی جا رہی تھی۔

میں اُس کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب اپنی آنکھوں سے پیتا ہوا بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حسن و جوانی کی یہ دیوی اس جگہ کس طرح آپڑی؟"

"اپنے اس عشق و محبت کے دیوتا سے یہیں ملن جو لکھا تھا"! کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اور بے تابانہ مجھے اپنی باہوں میں کس لیا۔

"تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ آخر اس بوڑھے سے تمہارا صحیح تعلق کیا ہے چندا؟" میں نے کچھ یاد کر کے پھر پوچھا۔

"اس بوڑھے سے صحیح تعلق —؟" وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اُداس لہجے میں بولنے لگی۔ میں اپنی بربادی کی کہانی سُنا کر تمہاری طبیعت کو مکدر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ لوگ میرے یہاں سکون کی تلاش میں آتے ہیں اضطراب کی جستجو میں نہیں لیکن اوّل تو تم میری کہانی سُنے بغیر ہی مضطرب معلوم ہو رہے ہو۔ دوسرے تمہاری باتوں سے مہر و وفا اور محبت و ہمدردی کی بُو آرہی ہے اور ایک رنڈی کہی جانے والی کے منہ سے ایسی بات سُن کر چاہے تمہیں یقین نہ آئے، لیکن پہلی ہی نگاہ میں میں بھی اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر چکی ہوں۔ اس لئے نہ تو تمہاری خواہش رد کر سکتی ہوں نہ خود اپنی کوئی بات تم سے چھپا سکتی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میری رات دن کی دعاؤں اور اس گھناؤنی زندگی سے نکلنے کی آرزوؤں کے کامیاب ہونے کا وقت آگیا ہے، اور میری زندگی اور جوانی کی بوجھل ناؤ کو پار لگانے کے لئے کھیون ہار بن کر تم آگئے ہو۔

ہاں، تو میرا اصلی نام اُرملا ہے۔ میرے پتا جے پور سٹیٹ کے بہت بڑے رئیس اور تاجر ہیں۔ اُن کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں اُنہوں نے بہت دھوم دھام سے آگرے کے ایک اپنے ہی جیسے مشہور اور باعزّت گھرانے میں میری شادی کر دی۔ لیکن آہ — !"

یکایک اُس کی آواز بھاری ہوگئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کچھ دیر رُک کر وہ پھر بولی "بدقسمتی نے میرے سُکھ اور سہاگ کو لُوٹ لیا۔ میرے پتی، میرے ارمان اور اُمنگوں سے بھرے ہوئے سینے پر بیوگی کی بھاری چٹان رکھ کر سورگ کو سدھار گئے۔

سسرال والوں نے میرا سیندور پونچھ کر میرے ماتھے پر نحوست کے کلنک کی کالک مل دی۔ اور بہو رانی کے بجائے مجھے ڈائن، آدم خور اور منحوس کا خطاب دے دیا۔ میں گھر کی رانی سے داسی بنا دی گئی۔

جب میں ساس نندوں کے طعنوں کے تیر کھاتے کھاتے نڈھال اور نیم جان ہوگئی تو آخر کار ایک دن اپنی اس دُکھ بھری زندگی کی داستان اپنے پتا کو لکھ بھیجی۔ وہ خط پاتے ہی آکر مجھے ساتھ لے گئے۔ لیکن وہاں بھی مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میں کڑھائی سے تڑپ کر توے پر آپڑی ہوں۔ میکہ سسرال سے پہلے ہی اُجڑ چکا تھا۔ میری بیوگی سے پہلے ہی میری ماں پرلوک سدھار چکی تھیں۔ پُوری گرہستی کے راج کی میری بڑی بھابی رانی تھیں۔ بھائی اور پتا جی تو اپنے کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ اور میں ابھاگن ہر پل بھابی کی زد پر رہتی تھی۔ رات دن اُن کی سیوا ٹہل کرنے پر بھی میں نے اُن کے منہ سے کبھی ایک میٹھا بول نہیں سُنا۔ آہ، ہندو بیوہ کی زندگی !

جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ کر یکایک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ چونک پڑی۔ لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھ کر اُس نے ایک گلاس پانی پیا اور منہ پونچھتی ہوئی مجھ سے سمٹ کر بیٹھتی ہوئی پھر بولنے لگی۔ "معاف کیجئے گا —— اب تو آپ نے رِستے ہوئے ناسور کو کرید ہی دیا ہے۔ پھر مجھے کچھ دیر تک تڑپنے دیجئے —— ہاں تو میں نے اپنی اُس گھناؤنی اور دُکھ بھری زندگی سے تنگ آکر کئی بار خودکشی کرنے کی بھی کوشش کی۔ کبھی ہاتھ کانپ گئے اور زہر کی شیشی ہونٹوں تک پہنچ کر گر کر چُور ہوگئی۔ کبھی کانپتے ہاتھوں سے لگایا ہوا پھانسی کا پھندا دم نکلتے نکلتے میری دُکھ بھری زندگی کے بوجھ سے کھُل گیا۔

اسی طرح دن، مہینے اور سال گذرتے رہے اور سارے دُکھ نوجھے ہی جوانی کا بوجھ اور بھی برداشت سے باہر بنتا گیا۔ نس نس میں ایک انجانی کسک اور انگ انگ میں ایک اینٹھن بڑھنے لگی۔ گہنا زیور تو نہ ملتا تھا نہ پہننی تھی بناؤ سنگار سے محروم ہی کر دی گئی تھی۔ پھر بھی آپ نے تو سُنا ہی ہوگا کہ عورت کی جوانی خود ایک دلکش سنگار اور حسین زیور ہے۔ اور میں اُس زیور سے انگ انگ اور پور پور لدی ہوئی تھی۔

ایک نوبھر پور کلی، دوسرے مست ہوا کے جھونکے نے اُسے چھیڑا ہی نہیں، کھِلا دیا تھا۔ میرے مکان کے سامنے والے گھر میں ایک نوجوان رہتا تھا۔ میں تو دیوانی ہو ہی رہی تھی، وہ بھی میرے لئے پاگل ہو گیا۔ چاہ ہوتی ہے تو راہ مل ہی جاتی ہے۔ ایک دن موقعہ پا کر میں نے اپنے کو اُس کے حوالے کر دیا۔ جوانی جوانی سے اور اُمنگیں اُمنگوں سے ٹکرائیں تو دل و دماغ میں ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ عقل و ہوش اُس کی زد میں آکر چُور چُور ہو گئے۔

ایک رات جب ہم دونوں کے خاندان والے رات کی سیاہ چادر میں لپٹے میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ دو بےتاب جوانیاں طوفان میل میں بیٹھی سماج کے خوف سے ایک انجانی منزل کی طرف اُڑی جا رہی تھیں۔ میرے پاس گہنوں اور نقدی سے بھرا ہوا ایک صندوقچہ تھا اور... بھونکے جذبات کی تسکین اور میری حفاظت کے لئے ایک مضبوط اور جوانی سے بھرپور آغوش میرے گرد تھی۔

ہم نے جہاں پہنچ کر اپنا سُکھ سنسار بسایا، وہاں نہ تو کوئی ہمیں جاننے والا تھا نہ ہم پر کوئی اُنگلی اُٹھانے والا۔ ہمارے دن سُکھ کا پیام اور راتیں شانتی کا سندیس لے کر آتیں۔ ہم ہنستے سوتے اور مُسکراتے اُٹھتے ہماری زندگی کا ہر پل سُکھ سے بھرا تھا۔

لیکن آہ —— مجھے کیا معلوم تھا کہ زندگی کے سفر میں ابھی ایک اور موڑ سے بھی گذرنا ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ایک دن صبح کو میں نے آنکھ کھولی تو اپنا پہلو خالی پایا۔ جسے میں نے اپنی آخری منزل کا ہم سفر سمجھا تھا وہ بھی دھوکا دے گیا تھا۔ صورت حال کی خوفناکی کا احساس تو مجھے اُس وقت ہوا جب میں نے دیکھا کہ میرے جسم کے کپڑوں کے سوا باقی سب سامان کمرے سے غائب تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ حواس قائم ہونے پر میں نے اُسے بہت تلاش کیا لیکن اُس فریب کار اور ڈاکو کا کہیں پتہ نہ چلا۔

وہ کوڑی کوڑی لے کر چلا گیا تھا۔ پہلے ہی وقت سے فاقے کی نوبت آگئی۔ اور دوسرے وقت تو میں بھوک سے بالکل نڈھال ہوگئی۔ حال ہی

میں آئی تھی - اِس لئے اور تو کسی کو جانتی نہ تھی - سامنے اِسی بوڑھے کا گھر تھا - اِس کی بڑھیا ایک دو دن میرے پاس آ چکی تھی - میں نے اسی کے ہاں جا کر اپنی داستانِ مصیبت بیان کی - عورت کی مصیبت سُن کر عورت کا دِل بھر آیا - اُس نے بہت کچھ تسکین و تشفی دی - اور تو وہ غریب کیا کرتی خود چرخہ کات کر گذر کرتی تھی ۔ اُس نے مجھ سے بھی کہا اگر میرے پاس رہنا چاہو تو صرف ہم ہی بوڑھی بوڑھا ہیں، رہ سکتی ہو - جس طرح ہم اپنا پیٹ پالتے ہیں تم بھی محنت کر کے جب تک ہو سکے گزارہ کرنا -

میں تو ڈوب ہی رہی تھی - میں نے اس تنکے ہی کے سہارے کو بڑی بات جانا -

ایشور کی مرضی - وہ بڑھیا بھی ایک دن اچانک ہیضے کا شکار ہو گئی - میں ابھی سیکھ ہی رہی تھی - بوڑھا صرف بمار آ کر ہوا شوت بیچنے کے علاوہ اور کچھ کرتا دھرتا نہ تھا - میں اکیلی کہاں تک گھر کی گاڑی کھینچ سکتی - پھر فاقے شروع ہو گئے -

بوڑھے نے رائے دی کہ اگر میں کسی کھاتے کماتے نوجوان سے شادی کر لوں تو دونوں کے گذارے کا ٹھکانا ہو جائے - پہلے تو میں نے بہت مخالفت کی - لیکن بوڑھے کے بہت سمجھانے اور زندگی کی ضروریات نے آمادگی پر مجبور کر دیا - —— اُف —— کتنی منحوس گھڑی تھی وہ جب اُس کی تجویز پر میرے منہ سے ہاں نکلا تھا - وہ میرا ایجنٹ بن گیا اور ہر روز نئے نئے اُمیدوار لانے لگا - آہستہ آہستہ انجانے طور پر میں پاپ کے گڑھے کی طرف بڑھنے لگی - اور کچھ ہی دنوں بعد میں ایسے غار میں گر گئی کہ مجھ میں پاپ اور پُن کی تمیز ہی باقی نہ رہی -

اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ایک دِن پیٹ بھرنے کا ٹھکانہ نہ تھا اور آج اس کوٹھی میں بیٹھی ہوں، لیکن یقین جانو کہ ایسی زندگی کی ہر سانس میرے لئے عذاب ہے - پھر بھی کروں کیا کہ آج تک ایسی کوئی بانہہ میری طرف بڑھی ہی نہیں، جسے پکڑ کر میں اِس جہنم سے نکل سکتی - معلوم نہیں اس گھناؤنی زندگی کے کتنے دِن اور باقی ہیں ؟ لوگ آتے ہیں اور چندا کی مسکراہٹ سے اپنے جذبات کی پیاس بجھا کر چلے جاتے ہیں - لیکن اِس کے اندر تڑپتی ہوئی عورت کے رِستے ہوئے ناسوروں پر کسی کی نگاہ اب تک نہیں پڑی -" وہ میری گود میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی -

اور اِس سے پہلے کہ اُس کے جھنجھوڑے ہوئے جذبات الفاظ بن کر میرے مُنہ سے نکلیں، اُس نے میرا پاؤں پکڑ لیا اور رو رو کر کہنے لگی "تقدیر اور زمانے نے مجھے اس قابل تو نہیں چھوڑا ہے کہ میرا ناپاک وجود تمہاری بانہوں کے سائے میں سہارا کے لئے پناہ پانے کی امید بھی کر سکے، لیکن کیا ایک عورت کی مدد کر سکو گے ؟ کیا مجھے اِس نرک سے نکال سکو گے ؟ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے ۔ پران ناتھ، صرف خدمت کا موقع اور اُس کے بدلے میں جینے بھر کھانا اور تن ڈھانپنے بھر کپڑا - اور بس —— ہاں کہہ دو —— کہہ دو ہاں میرے جیون ادھار - میرے مکتی داتا —— میرے سوامی ——!" اور وہ میرے پیروں ہی پر لڑھک گئی -

اُس کی درد بھری کہانی تو مجھ پر پورے طور سے اثر انداز ہو ہی گئی تھی اُس کے آنسوؤں کی جھڑی اور درد بھری پکار نے مجھے بالکل ہی بیتاب کر دیا - میں نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا - اور اُس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا "بس چندا —— تمہارے دُکھ کے دِن بیت گئے - آج میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر اس جلتے ہوئے چراغ - خاموش رات - چاند اور ستاروں کو گواہ کر کے عہد کرتا ہوں کہ مرد ذات کی اِس بے وفائی اور سماج کے اس ظلم کا جس نے ایک دیوی کو کلنکنی بنانے کا پاپ کیا ہے، میں اکیلا پرائشچت کروں گا - میں یہ تو کہنے کے قابل نہیں کہ آج سے تم میری ہو، لیکن میں آج سے تمہارا ہوں - اور جب تک سانس آتی جاتی رہے گی ۔ تمہارا ہی رہوں گا - چاہے مجھے ساری دُنیا چھوڑ دے اور مجھے ساری دُنیا کو چھوڑ دینا پڑے - لیکن میں تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گا - ایشور میرے بچن کی لاج رکھیں !"

اُس نے میرے پاؤں اپنی بھیگی آنکھوں سے لگا لئے اور اُس کی بانہیں اِس طرح میرے گرد کس گئیں جیسے کوئی نازک بیل کسی تنومند درخت سے چمٹی ہو - اور ہم دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے -

اب میرا گھر اور میرے دِل کی دُنیا دونوں چندا کی جوت سے منور تھی - چندا اب صرف میری تھی - اور میں اُس کا تھا - میں چندا کے حُسن و جوانی اور خلوص و محبت کی شراب سے سرشار رہتا اور چندا میری آغوش میں سورگ کا سُکھ محسوس کر رہی تھی - دولت کی کمی نہ تھی - ہم عیش و عشرت کے رنگین خواب کی دُنیا میں کھوئے ہوئے تھے - چندا کو میرے سوا اور مجھے چندا کے سوا کچھ یاد نہ تھا -

ایک دِن یکایک میرے بہت پُرانے دوست ہیمنت سے ملاقات ہو گئی - وہ ایک لکھ پتی کا لڑکا تھا اور خود بھی قالین کی تجارت کرتا تھا - بچپن کا ساتھی اور کلاس فیلو بھی تھا - مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "میں تجارت کے سلسلے میں مہینوں باہر رہ کر کل ہی واپس آیا ہوں اور آتے ہی ایک خوش خبری سُنی ہے - معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک اپسرا کو جیون ساتھی بنا لیا ہے - مبارک ہو بھیا ——!" بھیا پر زور دینے پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے -

"ہاں بھائی تم نے ٹھیک ہی سنا ہے - میری تنہائی کو ایک ایسرا ہی نے دور کیا ہے - تمہاری مبارک باد کا شکریہ تو کیا ادا کروں ایسی بھابی ملنے پر تمہیں بھی مبارکباد ہی دیتا ہوں —" ہم دونوں پھر ہنس دیئے۔

کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اُسے اپنے یہاں شام کی دعوت دینی چاہی۔ لیکن اُس نے کہا "نہیں بھائی اتنی جلدی نہیں۔ بھابی کے ہاتھ کا کھانا کھانے کے لئے مجھے دیر کی مہلت دو - آج کی دعوت میرے ہی یہاں رہنے دو تاکہ بے تکلفی سے سیر و سفر کی بات چیت بھی ہو سکے گی۔"

اُس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ مجھے اس کی بات ماننی پڑی اور اُس شام کو اُسی کے یہاں دعوت رہی۔ کھانے پینے کے سامان میں تو اُس نے کافی سے زیادہ تکلف اور تیاری کی تھی۔ لیکن کچھ دیر کی صحبت میں میں نے محسوس کیا جیسے وہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اُس میں وہ پہلی سی شوخی اور شگفتگی نہیں تھی وہ حد سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر اداسی کی ایک پرچھائیں سی پڑی ہوئی تھی۔

میں نے ایک ایرانی قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کہو بھئی، آج کل کاروبار کا کیا حال ہے؟"

"کاروبار تو بہت کامیاب رہا بھائی!" وہ سگرٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "کمایا تو خوب میں نے —— لیکن ——" وہ یکایک اور اداس ہو گیا۔

"لیکن کیا ہیمنت؟"

"لیکن ہوا یہ —— کہ ——" اُس نے سر اُٹھا کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دل کی بربادی کے ساتھ ساتھ سارا کچھ برباد ہو گیا۔"

"یعنی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تم کاروباری آدمی اس دل کے لین دین میں کس طرح پھنس گئے؟ اور پھر اُس میں گھاٹا کس قسم کا ہو گیا؟"

"کیا کرو گے دوست میرے زخموں کو کریدکر؟" وہ پھر آہ بھر کر بولا۔ "کیا سناؤں اپنی نامرادی کی داستان - بس اتنا سُن لو کہ خوابوں کی ایک پری میرے دل کی دُنیا میں اچانک اُتری اور اُسے لوٹ کر اُڑ گئی - اور ساتھ ہی میرا صبر و قرار - سکھ چین - دھن دولت سب کچھ لیتی گئی بس اپنی نامراد زندگی کو رونے کے لئے صرف تمہارا یہ بدنصیب و دل شکستہ ہیمنت رہ گیا ہے اور یہ بھی جانے کب چل بسے - یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا کہ ؎

دل کی بستی عجیب بستی ہے
لُوٹنے والے کو ترستی ہے

یعنی لُٹ کر بھی اُس حسین لٹیرے کو ترس رہا ہوں - کاش اپنی جان بھی اُس کے قدموں پر نچھاور کر سکتا -" اور جیسے کہیں دُور وہ کھو گیا۔

میں نے اُس کی مختصر اور پُراسرار داستانِ غم سُن کر ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ گردن اُوپر اُٹھائی تو سامنے کی دیوار پر خوشنما فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر پر میری آنکھیں جم کر رہ گئیں اور جیسے خواب میں میرے منہ سے نکل گیا "ارے —— ہیمنت ——!"

اُس نے مجھے تصویر پر ٹکٹکی لگائے دیکھ کر کہا "ہاں —— دیکھ لیا نہ تم نے بھی اس حسین ساحرہ کو، ہے نہ بھولے قابل کہ؟ یہی ہے وہ چاندنی جو چھپ کر میری دُنیا میں چھا کر تاریکی پھیلا گئی۔"

"چاندنی -؟" میں نے تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یعنی آپ میری چندا کی تصویر ہی پر اپنا سب کچھ —— اپنی دُنیا نثار کر بیٹھے ہیں —— لیکن یہ تو کہو یہ تصویر تمہارے ہاتھ لگی کہاں سے؟"

"تمہاری چندا؟" وہ جیسے مجھے پاگل سمجھتا ہوا بولا "تو یہ نہ کہو اُس ساحرہ کی تصویر ہی کا جادو تمہارے دل و دماغ پر چل گیا - ارے بھئی یہ تمہاری چندا نہیں - میری چاندنی ہے - جو عرصے تک میری بزم رنگین کی ساقی رہ چکی ہے - اُف —— اُس کی مستانہ اور کافرانہ ادائیں —" اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، جیسے اُسی کے تصوّر میں کھو گیا ہو۔

ہیمنت کی آواز خواب کی طرح میرے کانوں میں گونجتی رہی اور آنکھیں تصویر پر جمی رہیں - مجھے کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ تصویر چندا کی نہیں ہے - وہی کنول سا کھلا ہوا چہرہ - چودھویں کے چاند سی پیشانی، ساغر کی طرح چھلکتی ہوئی آنکھیں - پنکھڑی سے ہونٹ اور اُن پر وہی دلفریب مسکراہٹ -

میرے دل کے اندر کشمکش و اضطراب کا ایک ایسا طوفان اُٹھا کہ میں وہاں نہ ٹھہر سکا - آہستہ سے چھڑی اور ٹوپی اُٹھائی اور ہیمنت سے اجازت لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

میں راستے بھر اُسی پہیلی پر غور کرتا رہا - لیکن اُس کا کوئی حل سمجھ میں نہ آتا تھا، سوچا چل کر یہ پہیلی چندا کو سناؤں گا - بہت لُطف رہے گا -

نوکر پھاٹک ہی پر کھڑا مل گیا - مجھے دیکھ کر گھبرایا ہوا بولا - "سرکار آپ —"

"خیریت تو ہے؟" میں نے بھی گھبرا کر پوچھا -

"رانی جی سے ملاقات نہیں ہوئی کیا؟"

"رانی جی سے ملاقات؟" کیا بکتا ہے؟"

"آپ کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد انہوں نے مجھ سے کہا - کہ بمبئی سے ایک ارجنٹ تار آیا ہے - فوراً ٹیکسی لاؤ - اور ٹیکسی آنے پر انہوں

نے سارا سامان رکھوا کر مجھ سے کہا۔ میں ہیمنت بابو کے بنگلے سے صاحب کو لے لوں گی۔ شاید ہمیں باہر دو تین دن لگ جائیں۔ تم ہوشیاری سے گھر کی نگرانی کرنا"!

نوکر کی بات سُن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ میرا مُنہ ..... کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اپنے پر قابو کر کے گھر میں گیا تو دیکھا قیمتی سامانوں کے تمام بکس غائب تھے اور تجوری کے پٹ کھلے پڑے تھے۔ سامنے ٹیبل پر رکھی ہوئی چندا کی تصویر جیسے میری سادہ لوحی اور حماقت پر مسکرا رہی تھی۔

میں سر پیٹ کر رہ گیا۔

اس واقعے کو زمانہ گذر گیا ہے۔ اب بھی کبھی کبھی ہیمنت اور میں اپنی چندا اور "چاندنی" کی تصویریں سامنے رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور گھنٹوں بحث ہوتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اب تک اس فیصلے پر نہیں پہنچ سکے کہ ہیمنت کے خوابوں کی پری چاندنی کون تھی؟ اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی میری چندا کون ——؟

(ہندی سے ماخوذ)

اے کاش تم بھی ہوتے!

از

جناب اصغر انصاری اسلام پوری

یہ نیلا نیلا گردوں، یہ سرمئی گھٹائیں!
دیوانہ ساز موسم، صہبا اثر فضائیں
پی کر شرابِ نکہت، بہکی ہوئی ہوائیں
اے کاش تم بھی ہوتے اس منظرِ حسیں میں

یہ غرقِ نور گیتی، یہ خلد زا نظارے
سمٹی ہوئی ہے ظلمت، ہنستے ہیں چاند تارے
فطرت بھی چپکے چپکے کرتی ہے کچھ اشارے
اے کاش تم بھی ہوتے اس منظرِ حسیں میں

یہ صبحِ نو کی ضو سے، ماحول پُر صباحت
یہ نو دمیدہ غنچے، ہیں پیکرِ لطافت
یہ بلبلوں کے نغمے، سامانِ صد جراحت
اے کاش تم بھی ہوتے اس منظرِ حسیں میں

پھولی ہوئی شفق پر، یہ ہلکا ہلکا بادل
دوشیزۂ سحر کا گویا ہے سُرخ آنچل
دیکھو! اُفق سے ہنس کر، نکلی شعاعِ اوّل
اے کاش تم بھی ہوتے اس منظرِ حسیں میں

افسانہ

"؟"

از

محترمہ اسیم سلطان

شہناز اور اُس کا شریکِ حیات احسان ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموش اور ساکت ——— وہ ایک ایسی گہری خاموشی میں گم تھے جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دُور جا چکے ہیں۔ آخر شہناز نے مہرِ سکوت توڑی اور بولی "زندگی ایک مستقل عذاب بن چکی ہے۔ آخر کب تک ہم اِس طرح زندگی کے دِن گذارتے رہیں گے؟"

احسان کے جذباتی چہرے پر افسردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے اخبار سے نظر اٹھائی اور شہناز کے حسین چہرے کی طرف دیکھا جس پر ذہنی پریشانیوں کے باوجود محبّت کی ضیا پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پُوچھنے لگا۔ "کیا ہوا شہناز۔ کیا میرے کسی فعل سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے؟ صاف صاف کہو۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

شہناز کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن الفاظ اُس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ وہ الفاظ ——— جو نہ جانے کب سے اُس کے حلق میں پھنسے ہوئے تھے اور باہر نکل آنے کی کوشش کے باوجود نہ نکلتے تھے۔ ایک دن اُسے ایک ٹیلیفون کے ذریعے اِس بات کا احساس ہوا کہ احسان کسی اور پر فریفتہ ہے اور اُس دن کے بعد اُس نے کئی بار چاہا کہ احسان سے کچھ باتیں کرے، لیکن اُس کی زبان نہ کھلتی تھی۔ الفاظ ہونٹوں تک آ کر رک جاتے تھے۔

شہناز کی شادی اُس وقت ہوئی تھی، جب وہ زندگی اور اُس کی تلخیوں کو سمجھنے کے قابل نہ تھی، اور شادی کے بعد وہ احسان میں کھو گئی ـــ وہی اُس کی دعاؤں کا مرکز تھا، وہی اُس کی تمنّاؤں اور آرزوؤں کا جنم داتا تھا۔ شہناز کے خوابوں میں ایک رومانی زندگی دھڑک رہی تھی اور احسان بڑھتے ہوئے کاروبار کی اُلجھنوں میں اپنے آپ سے بھی بے خبر ـــ شادی کے بعد وہ کچھ دنوں تک شہناز پر جان چھڑکتا تھا۔ شہناز کے اشارۂ ابرو پر سب کچھ کرنے کے لئے بے تاب نظر آتا تھا۔ اور شہناز اُس زمانے میں انتہائی شرمیلی تھی۔ بالکل لاجونتی سی ـــ احسان نے یہ جان کر کہ اُس نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی ہے، جس کے سینے میں دِل کی جگہ برف کی قاش ہے، خود کو زیادہ سے زیادہ کاروبار کے سپرد کر دیا تھا۔ اور اِس طرح شہناز کی ناروا حیا اور احسان کے تمکینِ بے جا نے مل کر اچھے خاصے گھر کو ایک بے کیف خلوت کدہ بنا دیا تھا۔

شہناز نے ایک بار پھر جرأت کی اور اپنی تمام قوتِ گویائی سے کام لے کر بولی "احسان! ہم دونوں جوان ہیں اور بوڑھوں کی سی زندگی گذارے جا رہے ہیں..." اور پھر یکایک الفاظ اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ وہ حیران تھی کہ وہ اتنی بات بھی کیسے کہہ گئی۔

احسان نے سب کچھ سُنا اور چُپ رہا۔ وہ اب بھی شہناز کو چاہتا تھا۔ وہ اب بھی اُس کی پذیرائی کے لئے بے تاب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہناز اُٹھ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال دے اور پھر احسان تمام دنیا سے بے نیاز ہو کر صرف شہناز میں کھو جائے۔ لیکن شہناز شرم و حیا کی پُتلی ——— لاجونتی، جو دِل کی بات زبان پر نہ لا سکتی ہو، اُس کے گلے میں باہیں ڈال دے ——— اور پھر غرورِ حُسن اور تمکینِ ناز بھی آڑے آ رہا تھا۔ احسان بولا "تم اِس ماحول سے کچھ گھبرا سی گئی ہو۔ چند دن کے لئے ماں باپ کے گھر چلی جاؤ۔ شاید اِس طرح یہ ذہنی پریشانی دُور ہو جائے۔" احسان کو اپنی آواز میں ایک اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ ایک گھونٹ پانی پیا اور پھر بولا "میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا شہناز۔ کیا تم میرے سوا کسی اور کے متعلق سوچ رہی ہو؟"

شہناز اِس طنز کو برداشت نہ کر سکی۔ شیرنی کی طرح بپھر کر بولی "کچھ نہیں!" اور خاموش ہو گئی۔

احسان میز سے اُٹھ بیٹھا اور بولا "پھر جلدی کیا ہے۔ زندگی کے اہم ترین فیصلے کے لئے طویل سوچ بچار کی ضرورت ہے شہناز! اور اگر اتنی ہی جلدی ہے تو رات کے کھانے پر باتیں ہوں گی۔ اتنی دیر میں ہم دونوں اپنے اپنے دلوں کو پوری طرح ٹٹول بھی لیں گے۔"

شہناز بولی۔ "آج رات موسیقی کا جلسہ ہے۔"

احسان بولا۔ "تو کل ہی سہی۔ ہوسکتا ہے کل حالات ہی بدل جائیں۔ اور تم آج کی گفتگو کو بھول جانا چاہو۔" اور احسان [illegible] نکل گیا۔

* * *

شہناز بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ احسان کیا کہہ گیا ہے ـــــ اُس کی زندگی میں کیا کبھی کوئی اور بھی آسکتا ہے؟ وہ زندگی کو تجربات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔ وہ خاموش بیٹھی اُن تمام باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اُس نے ابھی ابھی احسان سے سنی تھیں۔ اُس نے اپنے دل کو بار بار ٹٹولا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر چلنے کے لئے احسان کا سہارا چاہتی تھی۔ لیکن اس سہارے کے لئے اپنی نسوانی خود داری کو ٹھیس لگنے نہ دینا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ احسان بڑھ کر اُس کا بازو تھام لے اور پھر دونوں ہنستے مسکراتے زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوں! سچے جیون ساتھیوں کی طرح!!

وہ اٹھی اور اوپر کی منزل میں گئی۔ ہر چیز کا جائزہ لیا۔ باورچی کو مل کر کھانے کے متعلق ہدایات دیں۔ اور پھر موٹر میں بیٹھ کر شاپنگ کے لئے چلی گئی۔ شہر میں ہر جگہ قد آدم پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ جن میں جلسہ موسیقی کا اعلان تھا۔ پروفیسر ضیا کی تصویر ہر پوسٹر پر چھپی ہوئی تھی۔ اس طرح آنے والی شب کے جلسہ موسیقی کی یاد اُس کے حافظے میں تازہ ہوتی گئی۔

پھر وہ ایک کتب فروش کی دکان پر رکی اور دکان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی چیز جس سے اُسے سابقہ پڑا، پروفیسر ضیا کا قد آدم پوسٹر تھا۔ دیر تک اُس باکمال موسیقار کی تصویر اُس کی نگاہ و توجہ کی مرکز بنی رہی۔ پھر وہ خیالات میں کھوئی ہوئی دکان سے نکلی۔ اپنی موٹر کے قریب سے گزر گئی۔ پھر لوٹی اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر کے دروازے پر جا پہنچی۔

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اُس نے بڑھ کر رسیور اٹھا لیا۔ لیڈیز میوزیکل سوسائٹی کی صدر بول رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آج وہ کچھ ہنگامی مجبوریوں کے باعث دن بھر میوزک ہال نہ جا سکیں گی۔ اس لئے شہناز کو تمام کام سونپ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ضروری انتظامات کے لئے اُسے جلد ہال میں پہنچ جانا چاہیئے۔ اور نہ جانے کیوں شہناز نے اپنے ارادے کے خلاف وعدہ بھی کر لیا۔ جلدی جلدی اُس نے ملازمہ سے ایک گلاس دودھ کمرے ہی میں منگوا کر پی لیا۔ اور موٹر میں بیٹھ کر میوزک ہال کی طرف روانہ ہوگئی۔

... پروفیسر ضیا ہندوستان کا مایۂ ناز موسیقار تھا جس نے ہندوستانی اور انگریزی موسیقی کے امتزاج سے فن موسیقی میں ایک جدت پیدا کی تھی۔ شہناز ہال میں جا پہنچی۔ کرسیاں ترتیب دی جا رہی تھیں۔ اور اسٹیج پر بہت سے مزدور ایک خوبصورت پیانو کو ایک کونے میں لگا رہے تھے۔ اور ان مزدوروں کے درمیان بہترین سوٹ میں ملبوس پروفیسر ضیا تھا۔ جو مزدوروں کو احکام دے رہا تھا۔ جیسے ہی شہناز نزدیک پہنچی، پروفیسر ضیا نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور .... مسکراتا ہوا بولا۔ "میرا نام پروفیسر ضیا ہے۔"

شہناز بولی "میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں۔" ضیا اسٹیج سے نیچے آیا۔ اور ادب سے جھک کر آداب بجا لایا۔ شہناز بولی "میں مسز احسان ہوں اور اس جلسہ کی انتظامیہ کمیٹی کی ایک رکن۔"

شہناز کو اس کی اپنی آواز میں ایک [illegible] محسوس ہو رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں پروفیسر ضیا کے قرب سے اُسے ایک قلبی مسرت محسوس ہوئی اور پھر وہ بولی "کیا ہر چیز قرینے سے رکھی جا چکی ہے؟ میرا مقصد ہے آپ کا پیانو۔" پھر مزدوروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "پروفیسر آپ چاہیں تو پیانو اور آگے لایا جا سکتا ہے۔" پروفیسر پھر مزدوروں کو پھر احکام دینے لگا۔ اور پیانو کچھ اور آگے سرکا دیا گیا۔ شہناز کے سیاہ ملائم بالوں پر سورج کی روشنی چمک رہی تھی۔ پروفیسر نے پلٹ کر شہناز کو دیکھا اور شہناز کی [illegible]۔ پھر وہ پروفیسر سے مخاطب ہو کر بولی۔ "پروفیسر اگر اس وقت جب کوئی بھی موجود نہیں۔ آپ کچھ سنا دیں تو یہ کتنا عجیب، کتنا رومانی سماں ہوگا۔" پھر وہ رک گئی۔ یہ سب کچھ وہ نہ جانے کیوں کہہ رہی تھی۔ اُس سے کون بلوا رہا تھا۔

ایک مزدور پیانو کی گرد جھاڑ رہا تھا۔ پروفیسر اسٹیج پر پہنچا اور مزدور سے کپڑا چھین لیا۔ پیانو جھاڑ کر بیٹھ گیا اور پھر وہ ایک دلکش نغمہ گانے لگا۔ جادو جگانے لگا۔ شہناز نغمے کی کیف زائیوں میں کھو گئی۔ خود نغمہ نواز بھی مدہوش ہو گیا۔

مزدور سب چلے گئے۔ وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ پروفیسر شہناز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گا رہا تھا۔ اور سُروں کے اتار چڑھاؤ پر

شہناز میں ایک سوئی ہوئی عورت جاگ رہی تھی۔ پروفیسر نے نغمہ ختم کر دیا۔ لیکن شہناز ابھی تک مدہوش تھی۔ پروفیسر نے بڑھ کر بے باکی کے ساتھ شہناز کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔ شہناز لرز اٹھی لیکن پروفیسر کی اس حرکت پر چراغ پا نہ ہو سکی۔ وہ ایک بے جان مورتی کی طرح خاموش کھڑی رہی اور پھر پروفیسر نے اس کی پیشانی پر [illegible] دی۔ پروفیسر بولا "تم کتنی حسین ہو....." شہناز کو جیسے مدت سے ایسے الفاظ سننے کا اتفاق نہ ہوا تھا، چونک اٹھی۔ نسوانی غرور سے اس کا جسم تن گیا۔ سانس میں ہلکا سا غیر تسلسل آ گیا اور پھر بات کا رخ بدلنے کے لئے بولی "کیا آپ پیانو بند بھی نہ کریں گے؟" پروفیسر مسکرایا۔ آگے بڑھ کر اس نے پیانو بند کر دیا۔ جب وہ زینے سے اتر رہے تھے تو شہناز کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ دونوں خاموش چلتے رہے اور پھر شہناز کی کار میں بیٹھ گئے۔ شہناز نے پروفیسر کو شہر کے قابل دید مقامات کی سیر کرائی۔ پروفیسر مناظر سے خوش ہو رہا تھا، لیکن شہناز نہ جانے کہاں کھوئی کھوئی سی رہی تھی، لیکن از خود رفتہ پروفیسر اس دوران میں برابر باتیں کر رہا تھا۔ شہناز خاموش تھی اور جب پروفیسر خود بھی تھک کر خاموش ہو گیا تو شہناز نے کار گھر کی طرف موڑ دی۔ جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچے تو احسان دروازے پر موجود تھا اور پھول کی بیل کو جو بہت زیادہ بڑھ گئی تھی کاٹ کر درست کر رہا تھا۔ احسان گھر میں جلدی آ گیا تھا اس امید میں کہ شہناز سے گفتگو کرے گا، لیکن جب اس نے شہناز کو ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ شہناز بولی "احسان، آپ سے ملو۔ آپ پروفیسر ضیا مشہور موسیقار ہیں۔ اور آج رات کو اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ فرمائیں گے۔" دونوں نے ہاتھ ملائے —

شہناز سوچ رہی تھی کہ ان دونوں کے ملاپ سے کوئی "حادثہ" رونما ہو کر رہے گا۔ لیکن احسان "مزاج گرامی" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شہناز سوچ رہی تھی۔ کاش، وہ احسان کی بیوی نہ ہوتی۔ احسان کے گھر سے دور —— بہت دور —— کہیں آزاد ہوتی پھر اس کام کے لئے جو اس کی فطرت کا مطالبہ ہے۔ خاموشی پریشان کن تھی۔ شہناز نے مہر سکوت توڑی۔ کہنے لگی "میرا خیال ہے کہ پروفیسر ضیا کا سامان ہوٹل سے منگوا لیا جائے۔ یہاں انہیں گھر کا سا آرام بھی ملے گا۔ کمرہ تو موجود ہی ہے۔" احسان بولا "بہت اچھا خیال ہے۔" لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ احسان پر ایک تکان چھائی جا رہی ہے۔ وہ بولا "میں ذرا کلب جا رہا ہوں۔ ٹینس کھیلوں گا۔" حالانکہ وہ کچھ بھی کھیلنا نہ چاہتا تھا۔

پروفیسر ضیا نے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگا "یہ گھر، یہ خوبصورت پائیں باغ اور آپ دونوں کی موجودگی ہوٹل کے ماحول سے نکال کر مجھے پھر اس قابل بنا دے گی کہ میں آج رات ایسے نغمات سنا سکوں جنہیں سن کر لوگ جھوم جائیں۔"

احسان نے پروفیسر کو دیکھا اور معاً اس کے دل میں یہ خیال ابھر آیا "پروفیسر حسین بھی ہے!" پھر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ اس کا جسم، جو کبھی بہت حسین تھا، اب کام کی زیادتی سے بے ڈول سا ہو گیا تھا۔ اور پھر احسان جلدی سے موٹر میں بیٹھ گیا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

کلب میں وہ ٹینس کھیلتا رہا لیکن اس طرح جیسے کوئی اناڑی کھیل رہا ہو۔ آخر کار وہ پھر گھر چلا آیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ شہناز [illegible] ایک کلی سینے کو کمرے میں جا رہی ہے۔ وہ ایک بے حد خوبصورت نیلگوں ساڑی جس پر روپہلی ستارے چمک رہے تھے پہنے ہوئے تھی۔ یہ ساڑی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ شہناز کے بال روز سے زیادہ سجائے تھے اور اس کے شانوں پر ایک نئی دلکشی پیدا کر رہے تھے۔ وہ بولا "شہناز! آج بال تو قیامت کے بنائے ہیں!" شہناز بولی "احسان! ذرا جلدی کرو۔ پروفیسر کھانا جلدی کھانا چاہتے ہیں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر تینوں میوزک ہال جا پہنچے۔ شہناز نے اپنے دونوں طرف بیٹھے ہوئے مردوں پر نظر ڈالی۔ پروفیسر کی نگاہوں میں ایک مطمئن مسرت تھی اور احسان کی نگاہوں میں ایک مایوس اضطراب —— شہناز نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ آج اسے احسان زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ ہال نغموں سے گونج رہا تھا۔ پروفیسر سب سے بے نیاز شہناز کی طرف متوجہ تھا، اور احسان ان توجہات سے پریشان۔ احسان دیکھ رہا تھا کہ شہناز نغموں ہی میں نہیں نغمہ نواز میں کھوئی ہوئی ہے۔ نغموں کا سیلاب ختم ہو گیا اور شہناز احسان کے بازو کے سہارے موٹر تک آئی۔ پروفیسر بھی آ پہنچا۔ تینوں گھر کی طرف چل پڑے۔ شہناز کے ایک طرف وہ محبت تھی جو اس کی پذیرائی کے لئے بیتاب تھی اور دوسری طرف وہ محبت جس میں رقابت کی جلن تھی —— اور شہناز دونوں کو پوری شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ پروفیسر اب کسی گہری سوچ میں تھا۔ تینوں نے شب بخیر کہا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ صبح ہوئی۔ شہناز جو رات کو جاگتی

رہی تھی، صبح بہت دیر سے بیدار ہوئی۔ ملازمہ آئی۔ اُس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک سُرخ پھول تھا، جیسے کسی کے خون سے رنگا ہوا ہو، اور اُس پر شبنم کا ایک موتی تھرتھرا رہا تھا جیسے کسی کے آخری آنسو! ملازمہ نے کہا "پروفیسر بہت سویرے ہی اپنا سامان لے کر چلے گئے، اور یہ پھول دے گئے ہیں اور پھر اُس نے ایک رقعہ جیب سے نکالا اور شہناز کی طرف بڑھا دیا۔ شہناز نے دھڑکتے ہوئے دل سے رقعہ کھولا۔ لکھا تھا:۔

پیاری شہناز!

میں گھر جلد آ جاؤں گا، کہیں باہر نہ جانا۔

تمہارا احسان

شہناز کے پاس احسان کے اور بھی کئی نامہ ہائے محبت تھے لیکن اتنا مختصر اور اتنا جامع کوئی خط نہ تھا۔ اُس نے خط کو ایک بوسہ دیا اور پھر اُس نے پروفیسر کا بھیجا ہوا پھول اُٹھایا اور اُسے ایک بوسہ دے کر سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

"پروفیسر! میں تمہاری شکرگزار ہوں"

(طبع زاد)

سوچ

از جناب مشہود مفتی

یہ حسرت و آلام، میں کچھ سوچ رہا ہوں
اے بخت سیہ فام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

گُل ہیں نہ گُل اندام، میں کچھ سوچ رہا ہوں
سُونے ہیں در و بام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

کر صبر ذرا دیر، ذرا دیر ٹھہر جا
ہاں اے دلِ ناکام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

کیا یوں ہی مرے درد کا درماں نہیں ممکن
ہاتھوں میں لئے جام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

اب کاکلِ پیچاں ہیں نہ ہیں عارضِ رنگیں
مشہود سرِ شام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

طنز و مزاح

لنچ ٹائم

از

جناب پنڈت بالمکند عرش ملسیانی بی اے

عدالت لنچ کے لئے برخاست ہوئی، بچپن میں کہیں یہ پڑھا تو اپنے بڑوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوپہر کے کھانے کا انگریزی یا مغربی نام لنچ ہے معلومات میں اضافہ ہوا تو خوش فہمی کو پَر لگے۔ ہم نے سوچا کہ دوپہر کے وقت عدالت میں جانے والے ہر شخص کو مختلف قسم کے لذیذ کھانے، پھل اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ملتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم نے بھی ارادہ کر لیا کہ بڑے ہوں گے، تو کسی عدالت میں ملازم ہو جائیں گے۔ مجسٹریٹ یا جج نہیں تو پیشکار سہی۔ اور اگر یہ نہ ہوئے تو اہلمد یا محرر ہی بن جائیں گے۔ کبھی کبھی انقلاب زندہ باد کا نعرہ کانوں میں پڑتا یا کسی لیڈر کا جلوس دیکھتے تو سوچتے وکیل بن جائیں گے۔ لیکن اس قسم کے ہر تصوّر کے ساتھ عالمِ تخیّل میں وہ خوانِ نعمت سامنے رہتا۔ جس پر پلاؤ، زردہ، بریانی، حلوا، انگور، سنگترے، سیب وغیرہ سلیقے سے چنے ہوئے ہوتے اور دوپہر کے وقت ہم بنام جہاں مار رحیاں آفرین اُس پر پل پڑتے۔ لنچ اور لنچ ٹائم کا یہ تصوّر ہمارے ذہن میں اپنی پوری دلآویزیوں کے ساتھ ایک مدّت تک جما رہا۔

معلومات میں اور اضافہ ہوا تو خوش فہمی ہوا ہو گئی اور ہم سمجھے کہ یہ سب بھرم ہی بھرم ہے۔ عدالت اس لئے برخاست نہیں ہوتی کہ واقعی لنچ کھایا جائے بلکہ لنچ ٹائم منانے کے لئے برخاست ہوتی ہے۔ اور پھر لنچ ٹائم منانے کی سعادت بھی ہر کس و ناکس کا حصّہ نہیں بنتی۔ چند صاحب یا صاحب نما افراد کو چھوڑ کر باقی سب لوگ اپنے اپنے رنگ میں شاعر کی طبع آزمائی کی طرح لنچ آزمائی کرتے ہیں۔ منشی، محرر، وکیل اور اسی جنس کے دیگر لوگ جیب گرم کرنے کے داؤ پیچ لگاتے ہیں۔ مؤکل اور اسی قسم کے سیدھے سادے لوگ لنچ ٹائم کے ظاہری اور باطنی اثرات سے بے خبر اپنی بے وقوفی اور دوسروں کی فریب کاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مغرب سے ہمیں کیا کچھ نہیں ملا۔ خالص مغربی لباس، خانساماں، بیرا اور آیا کی ایک خاص نسل۔ اتوار کی چھٹی۔ انگریزی نما ہندوستانی اور ان سب پر مستزاد لنچ یا لنچ ٹائم۔ انفرادی یا وقتی ضرورت کے لئے اسے رواج دیا گیا اور اب یہ روایت بن گیا ہے۔ روایت کے خلاف جانا یا خلاف کہنا اُسی حد تک مناسب ہے کہ کوئی برا نہ مانے۔ اس لئے لنچ کی غریب الدیاری کا ڈھول پیٹنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ کیا اس کی افادی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اور دُنیا میں وہ کونسی چیز ہے جس کی افادی حیثیت نہ ہو۔ زہر میں بھی زندگی بخش عناصر ہیں۔ چکا چوند کے عالم میں تاریکی فائدہ دیتی ہے یہی حال لنچ ٹائم کا ہے۔ ذرا دفتروں میں اہلِ قلم یعنی کلرکوں کا حال دیکھیے کہ لنچ ٹائم کا انتظار کس بے قراری سے کیا جاتا ہے۔ محبوب کے انتظار کا عالم قدامت پسند شعرا کے لئے ایک دِل خوش کن موضوع رہا ہے اور ہے۔ افسوس کہ اُن کے مشاہدہ میں وہی پرانا محبوب اور وہی انتظار کرنے والے پرانے عاشق ہی رہے۔ لیکن ان اگلے وقتوں کے لوگوں کا شکوہ ہی کیوں۔ شکایت تو زندگی کو نہایت قریب سے دیکھنے والے اُن شعرائے جدید سے ہے جنہیں بے قراری کا یہ عالم نظر نہیں آیا۔ ورنہ ضرورتاً یا بے ضرورت کہیں نہ کہیں کہہ جاتے:۔

> تجزیہ شوق کا اے دوست نہ کر
> جھلملاتی ہوئی منزل ہے یہ فن کاروں کی
> جس کے ارمان میں بے تاب ہے یہ دورِ جدید افکاری
> لنچ ٹائم کے لئے جیسے کلرک
> تجزیہ شوق کا اے دوست نہ کر
>
> ہاں اے دوست نہ کر

تو ایک فائدہ اس لنچ کا یہ ہوا کہ ایک خشک موضوع ہونے کے باوجود جدید شاعر کو ایک دلچسپ مضمون دے دیا اور ہم تو اس کا کرم بھول ہی نہیں سکتے کہ اس مقالے کا عنوان ہی لنچ ٹائم ہے۔

دفتر میں قریب قریب یہ روز کا واقعہ ہے کہ دوپہر کے وقت ایک بجا۔ تو کوئی صاحب تشریف لائے اور فرمایا "کیوں بھئی اُٹھو، لنچ پر چلیں گے۔" ذرا ان ستم ظریف حضرت سے کوئی پوچھے کہ بھائی آخر اس مذاق سے کیا حاصل، نہ

خود کچھ کھاؤ اور نہ کسی کو کھلاؤ۔ لیکن بڑی شان سے آ کے کہہ ضرور دیتے ہو کہ لنچ پر چلو گے اور پھر لنچ اگر واقعی لنچ نہیں تو کوئی چھکا یا اٹھیلا یا زیادہ سے زیادہ کوئی موٹر ہے کہ اُس پر چلیں۔ ہمارے خیال میں تو یہ محض ایک خیالی گھوڑا ہے۔ دوڑا اُدھر جہاں تک دوڑا سکتے ہو۔ اکبر الٰہ آبادی نے تو دلّی دربار دیکھا، اور ایک ایسی نظم کہہ دی کہ شہد کی مکھّی سے ڈیوک آف کناٹ تک سب کچھ کہہ گئے اُنہوں نے نہ جانے وہاں کیا کیا دیکھا۔ لیڈی کرزن، دُور کا جلوا، آنکھیں مری باقی اُن کا، سرکس، کھیل، تماشے، جمنا جی کا گھاٹ ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ تیار کر دیا۔ آپ لنچ ٹائم کا دربار دیکھیں وہاں کیا نہیں۔

کام کرنے والے دھن کے پکّے اگر زیادہ نہیں، پھر بھی مِل ہی جائیں گے۔ وہ لنچ ٹائم کے دیانتدارانہ مصرف سے واقف ہیں۔ جب اُن کا لنچ ناشتے کے اوقات میں ہوتا ہے تو وہ اِس دوپہر یا بعد دوپہر کی لعنت میں کیوں گرفتار ہوں۔ وہ حق و انصاف کے پابند ٹھہرے۔ وقت کی قدر انہیں ضرور ہے۔ وقت اُن کی قدر کرے نہ کرے لیکن کثرت ان اصحاب کی ملے گی جو لنچ ٹائم کو اِس نظریے سے گذارتے ہیں کہ عمرِ مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے دس بجے سیٹ پر آئے۔ گیارہ تک گھر کی اور راستے کی کوفت مٹائی۔ بارہ تک کام کی تیاری کی اور ایک بجے تک اپنے محبوب لنچ ٹائم کا انتظار کیا۔ بھلا اتنی کاہش اور کاوش کے بعد جو چیز میسّر ہو، اُسے یونہی کون گنواتے۔ اس کا توصحیح مصرف ضرور ہونا چاہیئے، خواہ کسی انداز سے ہو۔ بعض کا یہ قول ہے کہ کھانا نہ سہی کچھ نہ کچھ کھایا ضرور جائے۔ پھل، چائے، بسکٹ غرضیکہ جو ہاتھ آئے اُس کو چٹ کیجئے۔ ساتھی کی میز کی دراز میں سے کچھ ملے وہ اڑا لیجئے، کہیں سے اُدھار ملے تو اُس پر ہاتھ صاف کیجئے۔ آلو، چٹنی، دودھ، ٹماٹر، دہی، برفی، سنگترہ، چنے، امرود، مونگ پھلی، غرض ملّی فا مولوں، حفظانِ صحّت کے اصولوں اور ڈاکٹروں کے مشوروں کو بالائے طاق رکھ کر جو جی میں آئے سو کھائیے۔ بڑی مشقّت کا کام ہے صاحب بے تُکم بڑی کے ہو بھی کیسے سکتا ہے اور پھر لنچ ٹائم کا صحیح مصرف بھی پیشِ نظر ہے ٹِفن رُوم کیا ہیں اچھا خاصہ ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہیں۔ مسافر آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ تازہ باسی سب بِک جاتا ہے۔ پیالیاں ہیں، چمچے ہیں، چھلنی نہیں تو نہ سہی۔ صاف پانی اور خالص دودھ بالکل غائب۔ بورڈ پر مینو ہے۔ کوئی دیکھے نہ دیکھے۔ جو مانگو وہ نہیں ملتا۔ کچھ نہ کچھ مِلنا ضرور ہے انکار کی گنجائش نہیں آزمائش شرط ہے۔ نمک کم ہو نہ زیادہ ہو۔ یہاں سب ہضم ہے۔ سود از یادہ اُدھار بِکتا ہے، اور پُوری باقاعدگی کے ساتھ حساب میں اونے پونے یہاں کا روزمرّہ ہے۔ کوئی کھاپی کے چلتا بنے تو اُس کی بھی گنجائش ہے۔ مغربی لباس والے کو اُدھار بھی مِل جاتا ہے۔ مشرقی لباس والے کو نقد بھی مُشکل سے مِلتا ہے۔ یہ ہنگامہ ہاؤ ہو یوں تو آدھ گھنٹے میں ختم ہونا چاہیئے مگر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری ہی رہتا ہے۔ کیونکہ آخر جلد اور دیر سے آنے والے ہر قسم کے مسافر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لنچ ٹائم میں اس منظر کو دیکھیں تو خدا کے رزّاق ہونے میں کوئی شُبہ نہیں رہتا، اور سعدی کا یہ قول یاد آ جاتا ہے ؎

اگر روزی بدانش بر فزودے
ز ناداں تنگ تر روزی نہ بودے

اِس دُنیا میں اہلِ نظر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بے وقوفوں کی ہے۔ عقل کے کورے نہ ہوں تو اِس دنیا میں کوئی جاذبیت اور کوئی دلچسپی نظر نہ آئے۔

گرمیوں میں گرم سردیوں میں سرد چائے بیچنے والوں کے اِس قول کو کہ چائے سے تھکن دُور ہوتی ہے، وحی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لنچ ٹائم اصل میں ٹی ٹائم ہو گیا ہے۔ لیکن چائے پینے والے اور چائے بیچنے والے چائے کی ایسی مٹّی پلید کرتے ہیں کہ باید و شاید۔ اِس پر بھی اِس گرم شربت کے پینے والے اِس لحاظ سے قابلِ داد ہیں کہ وہ اِس سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے خیّام اور حافظ کی قبروں پر لات مارتے ہیں اور بہ یک زبان فرماتے ہیں ؎

جانِ شیریں کا قدرداں ہے وہی
تلخیٔ مے کا جو گِلہ نہ کرے

جن نازک طبعوں پر ٹِفن روم کی چہل پہل گراں گذرتی ہے، وہ اپنی میز پر ہی ٹِفن کا رنگ جما لیتے ہیں۔ "بوائے" یا ملازم کو تھوڑی سی رشوت دے کر مہینہ بھر فراغت سے کھاتے اور پیتے ہیں۔ اِس ہما ہمی کے عالم میں اِن رمز شناسوں کو ایک صورت سے مالی فائدہ بھی ہو جاتا ہے وہ اِس طرح کہ ملازم کو جو کچھ دیا جاتا ہے، اُس سے زیادہ کمی اُن کے بِل میں ہو جاتی ہے۔ لنچ ٹائم میں سونے والے بھی ملیں گے۔ تاش کھیلنے والے بھی۔ گھر کا سودا سُلف لانا۔ بنک سے لین دین، ڈاکخانے میں رجسٹری پارسل، دوسرے دفتروں میں تلاشِ ملازمت، لیڈروں کے درشن، اخبار پڑھنا حتّے کہ ریڈیو کے لئے تقریریں لکھنے کا کام بھی لنچ ٹائم میں کیا جاتا ہے۔

نظامِ عالم میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مختلف اشیا میں

تبدیلی آتی ہے۔ پرندے موسم کے لحاظ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ پھل، پھول، ہوا، پانی وغیرہ سب چیزوں میں تبدیلی ضروری ہے۔ دن رات بڑھتے گھٹتے ہیں، لیکن اپنی جگہ پر استقلال سے جینے والوں میں لنچ ٹائم کو ایک امتیازی شان حاصل ہے۔ نل کا پانی اور لوہے کی کرسی ایجاد کرنے والوں نے نہ جانے کیا حماقت کی کہ یہ دونوں چیزیں گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ہوتی ہیں، لیکن لنچ ٹائم کے رواج دینے والوں نے کم از کم اس کے مصرف کے قواعد میں اتنی لچک بھر دی ہے کہ گرمی سردی کا احساس ہی نہ ہو سکے۔ اس کے لئے کوئی خاص قید نہیں۔ کوئی خاص نظام نہیں، کوئی خاص قاعدہ نہیں۔ ہر مذہب و ملّت کو یہ عزیز ہے۔ رواداری سے اُس کی نشوونما ہے۔ بیماروں اور کمزوروں کے لئے سامان راحت۔ گھومنے پھرنے والوں کے لئے گھومنے پھرنے کا موقع۔ شکم پروروں کے لئے شکم پری کی سہولت، کام کرنے والوں کے لئے کام اور کچھ نہ کرنے والوں کے لئے سستی اور سہل انگاری الغرض اس کی دنیا میں ہر مزاج اور ہر مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

عدالتوں اور دفتروں میں اس کا صحیح مصرف نہیں ہوتا نہ سہی۔ یہ ایک مغربی افتاد ہے تو ہو۔ مقصد اس سے تفریح ہے۔ کام کرنے والوں کے لئے تفریح۔ نام اگر لنچ ٹائم ہے تو ہوا کرے۔ مثلاً شاعر کسی شاعر کا تخلص نہیں ہو سکتا۔ مدغاسکر کے دارالحکومت تے نے نے ریڈیو پر بچّے گانے کے الاپ کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اگر محض نام ہی پر جائیں تو دنیا میں جگہ جگہ دھوکا کھائیں۔ مرد اور عورت میں تمیز نہ کر سکیں۔ اچھے اور بُرے کی جانچ نہ کر سکیں۔ لنچ ٹائم کا نام لنچ ٹائم رہے، لیکن ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ تفریح کا وقت ہے۔ نہایت محدود اور تفریح کی وسعتوں کے لحاظ سے بہت تھوڑا۔ یہ وقت گذر تو جاتا ہی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ خوش اسلوبی سے گذر جائے، ورنہ بقول استاد ذوقؔ سے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

غم کی موجیں بڑھ کے ساحل بن گئیں
میری کشتی کو کنارا مل گیا

یزدانی جالندھری

جینا ہی ہوگا

افسانہ

از

محترمہ پروین جہاں رامپوری

"اُس کی یاد آنے پر، جو ایک لمحہ ـــــ ایک ثانیہ کو میرے دِل سے جُدا نہیں ہوتی؛ میرے دِل کی دُنیا میں شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ میری اُداس آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ میرا دِل و دماغ قابو میں نہیں رہتا ـــــ کاش وہ اِس وسیع دُنیا میں مجھے تنہا چھوڑ کر نہ گئی ہوتی۔ قسمت کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کا دامن میرے ہاتھ سے نہ چُھڑایا ہوتا ـــــ لیکن نہیں۔ مقدّر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ مجھے اس کے بغیر بھی زندگی کے دن پورے کرنے تھے۔ سو کر رہا ہوں۔ یہ کب تک ـــــ؟ یہ بھی کون جانے!" بوڑھے ڈاکٹر کی آنکھوں سے دو قطرے ڈھلک کر رُخساروں پر پھیل گئے۔ اُس کی نگاہیں چھت پر جم گئیں۔ اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "وہ ساعتیں بھی کتنی حسین تھیں جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا ـــــ اُس روز تمام نینی تال بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ شام کے قریب جب ہلکے ہلکے بھورے بھورے بادلوں کا زور ذرا کم ہوا اور سورج کی دم توڑتی ہوئی کرنیں نینی تال پر آخری نظریں ڈالنے لگیں تو میں گھر سے نکلا اور ٹہلتا ہوا درختوں سے ڈھکی ایک ہری بھری پہاڑی پر جا پہنچا۔ آفتاب کی زرّیں شعاعیں پتّوں سے چھن چھن کر زمین سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ اونچے اونچے دیو قامت درخت خاموش اور افسردہ کھڑے تھے خود رو پہاڑی پھولوں کی خوشبو سے وادی مہک رہی تھی۔ اور میں فطرت کے بکھرے ہوئے حُسن کو دیکھنے میں محو تھا کہ ایک ترنّم ریز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "مسٹر، کیا آپ تکلیف کر کے میرا پرس اِس کھڈ سے نکال دیں گے؟ ابھی ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا ہے"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور ـــــ دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک پیکرِ حُسن و رعنائی گلابی ساڑی میں ملبوس میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آہ ـــــ! وہ دِل کی گہرائیوں میں یک لخت اُتر جانے والی آنکھیں جنہیں میں مرتے دم تک بھول نہیں سکتا"۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر رُک کر کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مصوّرِ فطرت کے اِس دلکش مرقّع میں جس رنگ کی کمی تھی، اِس حسینہ کے وجود سے اُس کی تکمیل ہو گئی ہے۔ جس جانِ آرزو کے بغیر یہ دلفریب منظر پھیکا پھیکا، سونا سونا نظر آ رہا تھا، وہ آسمانی رفعتوں سے اُتر کر زمین پر آ پہنچی ہے ـــــ ہو سکتا ہے، تم لوگ اِسے شاعرانہ لفاظی تصوّر کرو، لیکن میں نے اُس سے زیادہ خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ میں شاعر اور ادیب نہیں، جو رنگین الفاظ میں اُس کے حُسن کی تصویر کھینچ سکوں۔ ڈاکٹر ہوں۔ ایک مجروح دِل رکھنے والا ڈاکٹر"۔

ہم سب سر جھکائے ہمہ تن گوش تھے۔ اور ڈاکٹر اپنی رودادِ محبت کے اوراق اُلٹ رہا تھا "میں اُس کے جوان حُسن کی رعنائیوں اور لطافتوں میں کھویا ہوا تھا اور وہ میرے جواب کی منتظر۔ کچھ دیر بعد اِس نے پھر وہی سوال کیا۔ میں عالمِ مدہوشی سے چونکا "ابھی نکالے دیتا ہوں" کہہ کر کھڈ کی طرف بڑھا۔ کھڈ اتنا گہرا نہ تھا۔ آہستہ آہستہ پاؤں جما کر بھاری بھاری پتھروں کا سہارا لیتا ہوا میں اُس میں اُتر گیا۔ کالے رنگ کا خوشنما پرس، ایک خاردار جھاڑی میں اٹکا ہوا تھا جس کے سیاہ سینے پر سنہرے حرفوں میں مِس ساجدہ ظفر لکھا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ وہ پرس نکال کر اُسے دے دیا اور کھڈ کے باہر آنے لگا۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں اُس خاردار جھاڑی پر گر گیا۔ چہرہ، ہاتھ، پاؤں سب کانٹوں میں اُلجھ کر چھِل گئے۔ اور اُن میں سے خون رِس رِس کر بہنے لگا۔ ساجدہ اِس اچانک حادثے سے گھبرا گئی اور وہ غیر ارادی طور پر کھڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا اور کسی طرح کھڈ سے نکل آیا۔ اُس نے جلدی سے پرس سے رُومال نکالا اور میرے زخموں پر پٹّی باندھنے لگی۔ میرے دِل میں بے اختیار ایک خواہش نے کروٹ لی "کاش یہ لمحات غیر فانی ہو جائیں ـــــ میں یونہی زخمی رہوں اور ساجدہ کی نرم و نازک اُنگلیاں میری مرہم پٹّی کرتی رہیں"۔ میں سوچ رہا تھا، اور ساجدہ پلکیں جھکائے کہہ رہی تھی "میں نے ناحق آپ کو تکلیف دی میری وجہ سے آپ کی یہ حالت ہوئی۔ میں معافی چاہتی ہوں"۔ "معافی چاہتی ہوں"، کتنے حسین تھے یہ الفاظ اور کتنے پیارے لبوں سے ادا ہو رہے تھے اُس وقت۔ اگر آپ لوگوں کی زندگی میں بھی کبھی کوئی عورت داخل ہوئی

ہے اور کسی سے آپ نے محبّت کی ہے تو آپ اِس کا احساس کر سکتے ہیں ورنہ نہیں "۔ ڈاکٹر کہتا گیا۔ "میں نے اُس سے کہا" اِس میں معافی کی بات کیا ہے، یہ تو میرا فرض تھا "

"کتنے نیک دِل ہیں آپ !" وہ پٹی پر گرہ لگاتے ہوئے بولی۔

"اور کتنی . . . . !" لفظ میرے ہونٹوں تک آ کے رہ گئے۔ اُس نے نگاہ اُٹھائی۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور جھک گئیں۔ وہ شرما گئی میں اُسے نِہارتا رہ گیا۔ یہ تھا ہماری محبّت کا آغاز۔ کِتنا دلچسپ ——— کِتنا رنگین ——— کِتنا کیف زا" ڈاکٹر کی نظریں سامنے گلدان میں رکھے ہوئے ایک گلاب کے پھول پر جم گئیں شاید اپنی ساجدہ نظر آ رہی تھی۔ اُسے اُس میں وہ بولا "تیسرے روز بالکل اتفاقیہ طور پر میری ملاقات اُس سے سینما میں ہو گئی۔ وہ اپنے نو سالہ بھائی مسعود کے ساتھ تھی۔ اور میں بھی دل بہلانے کی غرض سے فلم کی شہرت سُن کر نا دلتی جا پہنچا تھا۔ سینما میں زیادہ رش نہ تھا۔ میں جس کلاس میں بیٹھا تھا، اُس میں چند ہی آدمی تھے۔ کچھ دیر بعد ہال میں اندھیرا ہو گیا اور سپید پردے پر الفاظ نمودار ہونے لگے کہ اتنے میں گیٹ کیپر کی آواز سُنائی دی، جو اپنے پیچھے آنے والے سے کہہ رہا تھا "یہاں تشریف رکھئے"۔ میں مُڑا اور یہ دیکھ کر کہ وہ ساجدہ ہے، میری مسرّت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے آہستہ سے کہا "آداب عرض ہے مس ساجدہ"۔

"ارے آپ ؟" اُس نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں خادم ہی ہے!"

"کہئے کیسے ہیں اب آپ کے زخم ؟"

"وہ تو معمولی خراشیں تھیں جو اُسی دن ٹھیک ہو گئیں۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں ؟"

"مہربانی !"

فلم شروع ہو چکا تھا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ فلم میں میں نے کیا دیکھا۔ کچھ یاد نہیں۔ آنکھیں ناچتی بولتی تصویروں پر ضرور جمی ہوئی تھیں لیکن دِل و دماغ میں ایک خوشگوار ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک حسین تمنّا انگڑائی لے رہی تھی، اور میں ایک نامعلوم لذّت کی حلاوتوں میں کھویا ہوا تھا۔ اُس محویت سے اُس وقت چونکا جب فلم کا یہ پُر درد نغمہ "تمہیں کیونکر میں سمجھاؤں مجھے تم سے محبّت ہے" کانوں میں گونجنے لگا۔ میں نے بے اختیار ساجدہ کی طرف دیکھا۔ اُسی وقت اُس کی نگاہیں بھی میری جانب اُٹھیں اور ——— اور یہ تھا ہماری نظروں کا دُوسرا پُر محبّت تصادم "۔

ڈاکٹر کے قبل از وقت بوڑھے چہرے پر جوانی کی موجیں ماند ہی تھی۔ اُس نے اپنی سرگزشت جاری رکھتے ہوئے کہا "اِس کے بعد اکثر شام کے وقت ملاقات کہیں نہ کہیں ہو جاتی۔ بالکل اچانک طور پر ہو جاتی۔ اُسے دیکھ کر مجھ پر بے خودی سی چھا جاتی۔ اور میں اُس کے حُسن کی صباحتوں میں گُم ہو کر رہ جاتا ——— آخر ایک دن وہ بھی آیا جب ہمارے درمیان سے اجنبیت کے پردے ہٹ گئے۔ غیریت کی دیواریں مسمار ہو گئیں، اور ہمیں تسلیم کر لینا پڑا کہ محبّت دونوں کی رگ رگ میں سما چکی ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر جینا محال ہے۔ اُسے میرے اور مجھے اُس کے بغیر چین نہ تھا۔ نینی تال کی رنگ و نُور در آغوش وادیوں میں ہماری محبّت پروان چڑھ رہی تھی۔

——— دِن گزرتے گئے اور اتنی تیزی سے کہ آج اُن دِنوں کا تصوّر بھی خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے"۔ ڈاکٹر رُک رُک کر کہہ رہا تھا "سیزن کا اختتام آ پہنچا تھا کہ ایک دِن جب ہم دونوں شاداب درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی پر درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے مصروفِ گفتگو تھے، وہ میرے اُلجھے ہوئے بالوں میں اپنی اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "چند دِن بعد امّاں جی اور میں لکھنؤ روانہ ہو جائیں گے اور آپ علی گڑھ۔ نظروں سے دُور رہ کر دِل سے تو نہ بھلا دیں گے مجھے آپ ؟"

"تمہیں بھول جاؤں گا میری اچھی ساجدہ ؟" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "کیا اپنے وحید کے متعلق تم ایسا خیال کر سکتی ہو۔ ایسا سوچ سکتی ہو۔ کیا تمہیں میری محبّت پر بھروسہ نہیں ؟"

"ایسا نہ کہئے۔ آپ کی محبّت ہی اب میری زندگی کا سہارا ہے۔ وعدہ کیجئے کہ اِس سہارے کو آپ مجھ سے نہ چھینیں گے "!

میں نے وعدہ کر لیا اور اِس وعدے کو . . . . !" ڈاکٹر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آواز گلوگیر ہو گئی "۔ میری ساجدہ، اس وعدے کو نبھا رہا ہوں اور مرتے دم تک نبھاتا رہوں گا۔ تجھ سے محبّت کرتا تھا، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا اُس وقت تک جب تک موت زندگی کے ساز کو توڑ نہ دے !" اُس کی آواز بھرّا گئی۔ کچھ دیر رُک کر وہ بولا۔ "اِس کے بعد اُس نے مجھے ایک دوست کی حیثیت سے اپنی ماں سے متعارف کرایا۔ اُس کی ماں ایک خوش مزاج اور نیک دِل بیوہ خاتون تھیں، اور ساجدہ اُن کی چہیتی لڑکی۔ ساجدہ کے والد مسٹر ظفر لکھنؤ کے ایک متموّل شخص تھے۔ دِل کی بیماری نے ایسا آن دبایا کہ جان لے کر ہی ٹلی۔ ساجدہ اُس وقت

کم سن تھی۔ قدرت کے عطا کردہ حسن کے سونے پر دانشمند ماں کی تعلیم و تربیت نے سہاگے کا کام کیا اور ساجدہ حسن و تہذیب کی جیتی جاگتی مورتی بن گئی۔ یہ لوگ لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ہر سال گرمیاں گذارنے اپنی نینی تال کی کوٹھی "ظفر ولا" میں آجاتے تھے اور گرمیاں ختم ہونے پر واپس لکھنؤ چلے جاتے تھے۔ میں اُن دنوں علیگڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ میرے والدین کی ہمیشہ سے آرزو تھی کہ ڈاکٹر بنوں، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس پیشے سے نفرت تھی۔ ساجدہ جب مجھ سے جدا ہوکر لکھنؤ چلی گئی اور میں علی گڑھ آگیا تو ایک دن بیٹھے بیٹھے ایک خیال مجھے بُری طرح ستانے لگا۔ ساجدہ کی روح فرسا فرقت سے مجبور ہوکر میں نے اُس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا تہیّہ کر لیا۔ دو روز کی رخصت لے کر دہلی پہنچا۔ والدین پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ معمولی ردّ و کد کے بعد وہ میری بات ماننے کو تیار ہوگئے۔ اور میں نے علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب میری ساجدہ میرے قریب تھی اب میں ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے اُس سے ضرور مل سکتا تھا۔ میں بےانتہا مسرور تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے .... پہلے اپنی کارگزاری کی داستان ہنس ہنس کر اُسے سنائی۔ اور جب میں نے کہا: "تمہاری محبت یہاں آخر کھینچ ہی لائی ساجدہ۔ تمہارے بغیر علی گڑھ کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ ہر چیز سونی سونی نظر آ رہی تھی۔ دل اُچاٹ اُچاٹ، نظریں بہکی بہکی۔ بھلا اس طرح پڑھ سکتا ہے کوئی۔ والدین کو راضی کر کے چلے آئے اپنی محبوبہ کے دیس میں" تو اُس کے رخساروں پر سُرخی پھیل گئی۔ وہ نگاہیں نیچی کر کے مسکرا دی۔

اب میں اُن کے ہاں اکثر آنے جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ساجدہ کی ماں کو بھی مجھ پر اعتماد ہوتا گیا اور کچھ عرصے بعد تو وہ مجھ سے اتنی مانوس ہوگئیں کہ اگر میں کسی دن اُن کے ہاں نہ جاتا تو وہ شکایت کرنے لگتیں۔ اور سچ پوچھئے تو میں بھی انہیں ماں سے کم نہ سمجھتا تھا۔ ساجدہ، اُس کی ماں اور میں تینوں مسرور تھے۔ قسمت کی دیوی ہم پر مہربان تھی۔ میری اور ساجدہ کی محبت ہر لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی ماں خوش تھی کہ اُس کی ساجدہ کا اُداس چہرہ کھِل اُٹھا ہے۔ اُس کی زندگی میں بہار آگئی ہے۔ ایک دل و جان سے محبت کرنے والا "بَر" اُسے مِل گیا ہے۔ —— میں نے اب چھٹیوں میں بھی دلی کی طرف رُخ نہ کیا۔ گرمیوں کی تعطیلات ساجدہ کے ساتھ نینی تال کی رنگین وادیوں میں گذریں اور سرمی چھٹیاں اُس کے کنار میں۔ دن سرعت سے بیت گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں ڈاکٹری کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کر کے کالج سے باہر آیا۔ دوستوں کے ہجوم نے گھیر لیا۔ مبارکباد کی صدائیں چاروں طرف سے کانوں میں آ رہی تھیں، لیکن میرا دل کسی اور کے لبوں سے یہ لفظ سننے کے لئے بےقرار تھا۔ آخر جلدی جلدی "مبارکباد دوں" کا جواب دیتا ہوا میں ساجدہ کے پاس پہنچا۔ اُس کا خوبصورت چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھِل کھِلا اُٹھی۔ دوڑ کر چنبیلی اور گلاب کی کلیوں سے گوندھا ہوا ایک ہار اُٹھا لائی اور میرے گلے میں پہنا کر بولی "اس کامیابی پر میری دِلی مبارکباد قبول فرمائیے" میں نے سند کا کاغذ اُس کے قدموں میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولا "محبت کی دیوی کے پیروں سے مس ہو کر اس سند کی قیمت واقعی کچھ ہوگئی ہے، ورنہ اس کی حقیقت کچھ نہ تھی"۔ پھر کچھ دیر تک کر میں اُس سے مخاطب ہوا۔ "ساجدہ! آج میں اپنے اس مقصد میں بھی کامیاب ہوگیا۔ اب میں اُس چیز کو حاصل کروں گا، جس کے بغیر میری زندگی پھیکی پھیکی اور اُداس ہے اُس شمعِ محبت کو جس نے اپنی تجلیوں سے میرے خانۂ دل کو روشن کر دیا ہے، اپنے گھر کی زینت بناؤں گا۔ مجھے امید ہے تمہاری امّی انکار نہ کریں گی"۔ اُس کے رخسار عرق آلود ہوگئے اور نگاہیں —— جیسے کہہ رہی ہوں "کہہ دیکھئے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو"۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایسا —— ڈاکٹر نے سرد آہ بھری۔ "ایسا نہ ہوا۔ ابھی میں اُس کی ماں سے کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ والد کا تار ملا۔ والدہ علیل تھیں۔ فوراً گھر بلایا گیا تھا۔ میں دلی چلا آیا۔ والدہ کی علالت میرے بلانے کا ایک بہانا تھی۔ انہوں نے شکایتوں کے پل باندھ دیئے اور خدا جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا، لیکن جب اُن کے یہ الفاظ۔ "شکر ہے خدا کا کہ میری ایک آرزو تو پوری ہوئی۔ اب تمہارا گھر بھی آباد ہو جائے تو میں سکون کے ساتھ دن گذار سکوں گی۔" کانوں میں پڑے تو میں گھبرا گیا۔ وہ کہے جا رہی تھیں: "نصرت —— تمہارے ماموں کی لڑکی سے میں نے تمہاری بات چیت طے کر لی ہے۔ صورت و سیرت کی فرشتہ۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ پھر سلیقہ مند، ہنرمند، تہذیب و شائستگی کی پتلی ......" "بس بس امّی شکریہ" میں نے اُن کی بات کاٹ کر پھر کر کہا "میں شادی ہرگز نہ کروں گا جب ہی کیوں نہ ہو"۔ اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں "لو اور سنو۔

لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے شادی نہیں کرے گا۔ ہُنھہ" اس سے زیادہ میں نہ سُن سکا اور سیدھا اپنے ایک دوست سے ملنے کناٹ پلیس کی طرف چل دیا۔ لیکن یہ بات معمولی نہ تھی، جو یہ آسانی ٹالی جاتی۔ مجھ پر زور دیا گیا۔ امّی، ابّا، خالہ، ممانی، ماموں، عزیز و اقارب ——— سب برسات کے کیڑوں کی طرح اُمڈ آئے۔ سب مُصر تھے کہ میں شادی کر لوں۔ لیکن کسی نے مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں، مجھے شادی سے انکار کیوں ہے؟ کوئی ماں باپ کا اولاد پر حق جتاتا۔ کوئی بُزرگوں کی بات کا پاس، پر گھنٹوں لکچر دیتا۔ اور میں خاموش سر جھکائے اُن سب کی سُنتا رہتا۔ اس کشمکش میں دو ماہ بیت گئے، کہ ایک دن ساجدہ کا خط مِلا۔ اُس کے یہ الفاظ پڑھ کر کہ "میں بیمار ہوں اور چند دنوں کی مہمان۔ آپ کو دیکھنے کی بے قرار آرزو کیا دل ہی میں رہ جائے گی"! میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور میں اُسی دن لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ وہ بیمار تھی۔ اُس کے گلابی رُخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی، اور وہ بے حد نحیف و نزار نظر آ رہی تھی۔ اختلاجِ قلب کے مسلسل حملوں نے اُسے بستر سے لگا دیا تھا۔ ساجدہ کی ماں کی آنکھوں میں کانپتے ہوئے آنسو دیکھ کر میرا دِل بے قرار ہو گیا۔ میں نے بمشکل انہیں تسلّی دی۔ "امّی خدا پر بھروسہ رکھئے۔ انشاءاللہ بہت جلد اچھّی ہو جائیں گی یہ۔ میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں گا"

"خدا کرے ایسا ہی ہو" وہ بولیں۔ اُن کے چلے جانے پر میں نے بھرّائی ہوئی آواز سے ساجدہ سے پوچھا "یہ کیا کر لیا ساجدہ تم نے"!

"دیکھ لیجئے، آپ سے جُدا ہو کر کیا حال ہو گیا ہے ہمارا ——— شُکر ہے۔ آپ کو دیکھ لیا، ورنہ یہ حسرت بھی ساتھ ہی چلی جاتی"

"خدارا ایسا نہ کہو ساجدہ، خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میرا دل و دماغ ماؤف ہو جائے گا۔ میں غم سے پاگل ہو جاؤں گا۔ میری یہ حالت دیکھ سکو گی ساجدہ؟"

اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ اپنی زندگی سے نا اُمیّد ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ تیز و تُند ہوا کے جھونکے نہ جانے کب اُس کی حیات کی شمع کو گُل کر دیں۔ میں نے اپنے خوابوں کی ملکہ کو موت کے چنگل سے چھڑانے میں دِن رات ایک کر دیا۔ شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ خود احتیاط کے ساتھ دوا بناتا، اُسے پلاتا۔ اُس کا دل بہلاتا رہتا۔ لیکن جو ہونا تھا ——— ہو کر رہا" ڈاکٹر نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا "ہو کر ہی رہا۔ کاش، ایسا ہونے سے پہلے میری شمعِ حیات بُجھ گئی ہوتی۔ موت نے اپنی آہنی اُنگلیوں کا کس بل دیکھنے کے لئے اُس گُل اندام کی گردن ہی کیوں تاکی ———" ڈاکٹر جذبات کی رَو میں بہتے بہتے دفعتاً رُکا "میں زندہ ہوں، اِس لئے کہ مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اُس ہستی نے مجبور کیا، جس کے لئے میں زندہ رہنا یا مرنا چاہتا تھا۔ کیسے ——— ؟ سُنو۔ غور سے سُنو! ایک دِن جب میں........ اُس کے لئے پھل لئے ہوئے بازار سے پلٹا، تو میں نے اپنے والد کو اُس کے سرہانے سے اُٹھتے پایا۔ میں نے انہیں گھورا۔ لیکن مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر وہ باہر نکل گئے، میں ساجدہ کی طرف لپکا۔ لیکن اُس نے اِس کے سوا کوئی جواب نہ دیا کہ "آپ کی وجہ سے میری عیادت کو آئے تھے" مجھے یقین نہ آیا، لیکن اُس کی طبیعت بگڑتی دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ دل میں کھٹک رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ والد صاحب کا یہاں آنا خالی از علّت نہیں ہو سکتا۔ آخر ایک شام یہ راز بھی کھُل گیا۔ ساجدہ مجھ سے بولی "میری ایک بات مانو گے وحید؟"

"ہر بات ساجدہ"!

"شادی کر لو"

میرے دِل کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ کیا یہ تھا وہ راز! وہ کہہ رہی تھی۔ "والدین کا دِل دُکھانا اچھّا نہیں ہوتا۔ اُن کا بھی تم پر کچھ حق ہے۔ وہ تمہارا گھر بسانے کی آرزو نہ جانے کب سے اپنے دل میں لئے ہوں گے اُن کی آنکھیں تمہارے سر پہ بندھا ہوا سہرا دیکھنے کی خدا جانے کب سے مشتاق ہوں گی ——— کب سے ترس رہی ہوں گی اور ——— اور میری بھی یہی تمنّا ہے کہ تم اپنا جیون ساتھی تلاش کر لو۔ مجھے افسوس ہے کہ زندگی کی شاہراہ پر تمہاری ہم سفر بننے کا جو وعدہ تم سے کیا تھا، نہ نبھا سکی۔ تمہارا ساتھ نہ دے سکی" اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ لیکن تمہاری محبّت کو ساتھ لئے ہو یہ قبر تک میرے ساتھ جائے گی۔ بولو پوری کرو گے میری آرزو؟"

"یہ تم کہہ رہی ہو تم ساجدہ۔ کاش، یہ سُننے سے پہلے میں اپنی سماعت کھو بیٹھتا" مجھ سے آگے نہ بولا گیا۔ وہ پھر بولی۔ "وحید، اگر تم نے میری اِس خواہش کو ٹھکرا دیا، تو مجھے مر کر بھی سکون حاصل نہ ہو گا۔ میں قبر میں بھی چین نہ پا سکوں گی۔ وحید! خدا کے لئے اپنے

والدین کی خواہش پوری کر دو۔ میں سمجھوں گی وہ تمہی وحید مجھے چاہتا تھا —— اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو......"

" بس اللہ چُپ ہو جاؤ۔ زیادہ تیز مت چلاؤ ساجدہ! جو کچھ تم کہتی ہو، ہو گا۔ اگر وحید زندہ رہا تو" میں چیخا۔

" وحید کو زندہ رہنا ہو گا اپنے لئے نہیں اُس کے لئے جس سے وہ محبت کرتا ہے، جسے وہ دیوانہ وار چاہتا ہے۔ تمہیں جینا ہو گا ساجدہ کے لئے۔ اپنی ساجدہ کی خواہش پوری کرنے کے لئے"!

" اور سنو گے پھر کیا ہوا؟" ڈاکٹر روتے ہوئے چلایا۔ "وہ مر گئی۔ موت —— جانتے ہو موت کتنی سنگدل ہوتی ہے؟ یہ جوان دیکھتی ہے، بوڑھا، نہ بچہ۔ موت نے اپنی آغوش اُس کے لئے وا کر دی۔ میں دیکھتا رہا۔ ایک ڈاکٹر۔ سینکڑوں جانوں کو موت کے پنجے سے چھڑانے والا۔ ہزاروں کو نئی زندگی بخشنے والا۔ اپنی زندگی کو نہ بچا سکا اُس کی دنیا لٹ گئی۔ اُس کے سپنوں کا محل منہدم ہو گیا اور وہ دیکھتا رہا۔ ماں نے اپنی گود اُجاڑ دی۔ عاشق نے اپنی محبوبہ کھو دی۔ لیکن زمانے کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنی رفتار ...... چلتا رہا اُسی انداز سے جیسے ازل سے چلتا آیا ہے، اور ابد تک چلتا رہے گا۔ میرا کیا حال ہوا؟ میں نہیں بتا سکتا —— ایک چلتی پھرتی لاش تھی۔ جس نے جو چاہا کہہ دیا۔ جو چاہا کر دیا —— چند ماہ بعد میری شادی کر دی گئی۔ نصرت کو میرے ساتھ بیاہ کر اس بیچاری کی امنگوں کا بھی خون کر دیا گیا۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ مجھ جیسا شوہر پا کر وہ خوش ہوئی ہو گی؟ دو جوانیاں تباہ ہو گئیں تو کیا ہوا، والدین کی خواہش پوری ہو گئی۔ عزیزوں کی آرزوئیں بر آئیں ——

مجھ سے میرے دوستوں کو شکوہ ہے کہ میں نہایت خشک مزاج آدمی ہوں کبھی نہیں ہنستا، کبھی نہیں بولتا۔ مریضوں کے منہ پر بلا جھجک اُن کے خطرناک امراض کے بارے میں سب کچھ کہہ دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ آپ لوگوں نے بھی مجھ سے شکایت کر کے میرے زخموں پر نمک چھڑک ہی دیا۔ کیسے معلوم سب کے زخموں پر مرہم رکھنے والے کا دل خود کتنے زخموں سے چھلنی ہے۔ وہ اپنی زندگی کیونکر گزار رہا ہے کس کی ایما پر —— ؟ کس کی التجا پر؟ یہ کون جان سکتا ہے! —— ہاں ساجدہ، مجھے جینا ہی ہو گا......"

اختر، عظیم، سروپ، کشور، ضیا سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، اور ڈاکٹر کی آنکھوں سے تو آنسوؤں کی جمنا جاری تھی۔ (طبع زاد)

لاکھوں زندہ دلانِ پنجاب کے تخیّل کی حسینہ جیسے
پروڈیوسر لیکھراج بھاکڑی نے
پہلی بار پردۂ سیمیں پر روشناس کرایا
کیف و مستی
لچھی
پنجابی
میں بسے ہوئے
گانے جو
آپ کے دِل کی
گہرائیوں میں اُتر جائینگے
دیہاتی حسن و عشق کا ایک
لاجواب فسانہ ایک
غیر فانی ڈرامہ کے
سانچے میں ڈھل گیا
ہیری لگدی کیتے نہ دیکھی تے ٹھڈی نوں جگ ہیاندا
کالی کنگھی نال کالے وال پئی وانی آں
نالے لمبی تے نالے کالی، ایہہ رات جدائیاں والی
سٹوری، مکالمے گانے: ملک راج بھاکڑی
میوزک: ہنس راج بہل
ڈائریکشن: راجندر شرما
اداکاران ★ واسطی، منورما
مجنوں، رندھیر، صوفیہ، ککو
بیج شرما اور اوم
(چمن والا بھائیا)
کلدیپ پکچرز لمیٹڈ
کی پروڈکشن ہے
ناچ
پروڈیوسر
کلدیپ سہگل
جس کی ہر حرکت آنکھوں کی راہ سے دِل کے تاروں پر
چوٹ لگاتی ہے اور دیکھنے والوں کو دُنیا اور اُس کے
ہنگاموں سے یکسر بے خبر بنا دیتی ہے
ڈائریکشن رویندر دوے سٹوری ڈائیلاگ گانے ملک راج بھاکڑی
اداکاران ★ ثریا، واسطی، منورما، مدن رندھیر، صوفیہ، ککو اور
آسمانِ فلم کے دو اور چوٹی کے اداکار ★
بہت جلد
مکمل ہو رہا ہے
کلدیپ پکچرز لمیٹڈ چاندنی چوک دہلی
سرتیا ولا
اندھیری
بمبئی

اچھا مہمان کون ہے؟

آدابِ معاشرت

از
جناب محمد اقبال سلمانی

اچھے مہمان کا سب سے اچھا وصف یہ ہے کہ وہ اپنے میزبان کی دعوت پر اُس کے گھر جائے یا بغیر دعوت کے، دونوں صورتوں میں اُسے اپنی آمد سے اطلاع دے۔ یہ اطلاع غیر مکمل نہ ہو۔ مثلاً ایسی نہیں کہ "میں ایک ہفتے کے اندر اندر آپ کے ہاں آؤں گا"۔ بلکہ وہ صراحت کے ساتھ بتائے کہ "میں ۲۔ جولائی کی سہ پہر کو آپ کے ہاں حاضر ہو رہا ہوں"۔ اور اگر اُسے یہ اُمید ہو کہ میزبان اُس کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر پہنچ سکے گا، تو اُسے گاڑی کے وقت سے بھی مطلع کر دے۔

اگر میزبان، رشتہ دار، عزیز یا دوست نہ ہو اور معمولی واقف ہو، یا ایسا شخص ہو جس سے محض غائبانہ تعارف ہو، اُس کی دعوت کے بغیر اُس کے ہاں جانا پڑے اور اِس کا بھی امکان ہو کہ اُس کے ہاں ایک آدھ دن ٹھہرنا پڑے گا، تو محض اطلاع کافی نہیں۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ پہلے خط لکھ کر اُس سے اجازت لے لی جائے۔ جب اجازت مل جائے، تو پھر اُسے اپنی آمد کی ٹھیک ٹھیک اطلاع دے۔ اگر کوئی اجنبی شخص، کسی اجنبی کے ہاں بلا اجازت اور بغیر اطلاع چلا جائے گا، تو وہ اپنے آپ کو "مسافر نوازی" کا مستحق تو سمجھ سکتا ہے، "مہمان نوازی" کا حقدار نہ سمجھے یہ الگ بات ہے کہ اُس کا میزبان ضرورت سے زیادہ بامروّت ہو، اُسے مسافر نہ سمجھے، مہمان سمجھ لے اور مہمانوں ہی کی سی خاطر داری سے اُسے نوازے

مہمان کی بے اطلاع اور بے وقت آمد کا ہم میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی ضرور تجربہ ہوا ہوگا۔ یہ تجربہ عام طور پر خوشگوار نہیں ہو سکتا۔ مہمان کا اطلاع دیئے بغیر آجانا تو کسی حد تک قابلِ برداشت ہی سہی، لیکن وہ روحانی تکلیف، وہ ذہنی کوفت بہت دیر تک یاد رہتی ہے، جب مہمان نہ صرف بلا اطلاع بلکہ بے وقت بھی آدھمکے۔ ہماری معاشرت میں ایسی مثالیں عام ہیں کہ مہمان رات کے دو بجے آکر دروازہ کھٹکھٹانے لگتا ہے۔ اِس طرح نہ صرف میزبان اور اُس کے گھر والوں کو اُس کی ناگہانی آمد کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے، بلکہ پڑوسی بھی جو اُس وقت میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں، بے آرام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر مہمان ایک نہ ہو، زیادہ ہوں، بیوی بچے ساتھ ہوں، تو صاحب خانہ اور بھی زیادہ تنگی محسوس کرتا ہے، بالخصوص جب اُسے کسی فرد کے نیچے سے چادر نکال کر، کسی کی دری لے کر، کسی کا تکیہ کھینچ کر، ایک بچے کو اُٹھا کر دوسرے بچے کے پاس لٹا کر مہمانوں کے بستر وغیرہ کا انتظام کرنا پڑے۔

اُس کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، جب مہمان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اُس وقت کا کھانا ابھی نہیں کھایا ہے۔ اگر بچا کھچا سالن روٹی موجود ہو، تو غنیمت ورنہ اُسی وقت چولہا گرم کیجئے، آٹا گوندھیئے، آلو، دال جو چیز میسر ہو، پکا کر مہمان کے آگے رکھیئے۔ وہ آپ کا مہمان اور آپ اُس کے میزبان ٹھیرے۔ آپ کو تکلیف ہوتی ہے، تو اُس کی بلا سے۔ مہمان کی خاطر مدارات آپ کا فرض ہے۔ آپ کو اپنے فرض میں کوتاہی کرنے کا کوئی حق نہیں!

دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں لوگ اپنے مہمانوں سے وہ دُکھ نہیں اٹھاتے، جو مشرق کے مہمان نواز لوگ اپنے مہمانوں سے نہ جانے کب سے اٹھاتے چلے آرہے ہیں اور کب تک اٹھاتے چلے جائیں گے۔ مغربی ممالک کے لوگ اپنے میزبان کے لئے کبھی باعثِ تکلیف نہیں ہوتے؛ وہ ہمیشہ اِس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کسی شخص کے گھر اطلاع دیئے بغیر نہ جائیں۔

اور جہاں تک ہوسکے، بے وقت نہ جائیں۔ اور اگر بے وقت جانا ہی پڑے، تو وہ کھانا کھا کر جائیں گے۔ رات کے وقت کسی شخص کو کھانا تیار کرنے کی تکلیف دینا تو بہت بڑی بات ہے، وہ لوگ اگر دن کو بھی کسی کے ہاں کھانا کھانے کے وقت کے بعد پہنچیں گے، تو نہ اپنے میزبان سے یہ توقع رکھیں گے کہ وہ اُن سے کھانے کے متعلق دریافت کرے گا۔ اور نہ خود ہی اُسے بے وقت کھانا تیار کرنے کی زحمت اُٹھانے دیں گے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے میزبان کے ہاں کھانا کھانے کے وقت سے آدھ گھنٹہ بعد پہنچے گا، تو وہ ہوٹل سے کھانا کھا کر ہی اُس کے گھر جائے گا۔

لیکن کوئی قانون، کوئی قاعدہ ایسا نہیں، جس میں استثناء کی گنجائش نہ ہو۔ بعض حالتوں میں اطلاع دینے کا موقع ہی نہیں ملتا، فوری ملاقات ضروری ہو جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہمان و میزبان کے تعلقات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اتنے گہرے کہ مہمان کا اطلاع دیئے بغیر آجانا، اطلاع دے کر آنے سے بھی کہیں زیادہ خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ بعض عزیزوں کے لئے انسان کے دل میں یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش! وہ اچانک ہی آجائیں۔ اُن کی بے وقت آمد سے نیند کا اُچاٹ ہو جانا، نیند سے زیادہ راحت بخش ہوتا ہے! اُن کی خاطر جو بھی تکلیف اُٹھائی جائے، قلبی مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ محبت کی دنیا تکلفات سے، رسمی آداب سے بے نیاز ہے۔ اُس کے اپنے جُدا قاعدے ہیں، الگ دستور ہیں اور الگ رسمیں! اُنہیں عام کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔

مہمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے میزبان کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہو، خوشی کا باعث ہو۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، جن کا اُسے پوری طرح خیال رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ میزبان کی مصروفیت اور فرصت دونوں پر اس طرح نہ چھا جائے۔ کہ وہ اپنے روزمرہ کے معمول میں رکاوٹ محسوس کرے۔ اُسے اپنی عادتیں میزبان کی عادتوں پر قربان کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے مثال کے طور پر اگر میزبان اور اُس کا کنبہ رات کا کھانا سرِ شام کھانے کا عادی ہے، تو اُسے بھی خوشی خوشی اُن کے ساتھ ہی کھا لینا چاہیئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ شام کے وقت لمبی سیر کے لئے نکل جائے یا سینما چلا جائے۔ اور گھر والے اُس کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ اسی طرح اُسے اپنے میزبان کے دوسرے معمولات سے باتوں ہی باتوں میں واقف ہو کر اپنے آپ کو اُن کے مطابق تیار کر لینا چاہیئے۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ اپنے میزبان کے سونے، جاگنے، سیر کرنے، نہانے، دھونے، ناشتہ کرنے اور کام پر جانے اور واپس آنے کے اوقات کا پورا پورا احترام کرے۔ اور اپنے مہمان ہونے کی وجہ سے کوئی ایسی رعایت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، جو میزبان کے لئے تردّد کا باعث ہو۔

میزبان تو یہ پوچھ سکتا ہے کہ مہمان کو کون سا کھانا زیادہ مرغوب ہے، لیکن خود مہمان کو کسی مخصوص کھانے کی فرمائش کبھی نہ کرنی چاہیئے۔ فرمائشیں صرف ہوٹلوں ہی میں زیب دیتی ہیں۔ میزبان کو کوئی مخصوص کھانا تیار کرنے کے کہنا بے تکلفی نہیں، چھچھورا پن ہے، جس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس ایک اچھا مہمان اشارے کنائے میں بھی یہ نہیں جتا سکتا کہ اُس کے لئے فلاں کھانا تیار کیا جائے۔ جو کچھ اور جیسا کچھ بھی میزبان تیار کر کے سامنے لے آئے، خوشی خوشی کھا لیتا ہے۔ اگر کھانے میں کوئی نقص ہو، نمک مرچ اُس کی اپنی عادت سے کم یا زیادہ ہو، جس معیار کا کھانا وہ اپنے گھر میں کھانے کا عادی ہو، ویسا نہ ہو، تو وہ میزبان پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر کے یا اُس کے کھانے میں نقص جتا کر اُسے کبھی شرمندہ نہیں کرتا، اگر کرتا ہے، تو یقیناً وہ اچھا مہمان نہیں۔

جب میزبان یہ کہتا ہے "کسی معاملے میں تکلف سے کام لینے کی ضرورت نہیں، اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھئے گا" تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مہمان سچ مچ گھر کا مالک بن گیا ہے۔ یہ بہت ہی ناپسندیدہ بات ہے کہ مہمان کے علم و اجازت کے بغیر اُس کی کوئی الماری کھول کر اُس میں سے کوئی چیز نکال کر استعمال کر لی جائے۔ ممکن ہے، اس الماری میں کوئی ایسی چیز ہو، جسے میزبان بالکل پرائیویٹ سمجھتا ہو اور یہ نہ چاہتا ہو کہ مہمان کو اس کا علم

ہوجاتے۔ بہت سے بیوقوف مہمان، میزبان کے خانگی سامان کو
اس طرح دیکھتے، ٹٹولتے اور الٹ پلٹ کرتے ہیں، جیسے وہ مہمان
نہیں، پولیس کے سپاہی ہیں اور کسی چوری کا سراغ لگانے
آتے ہیں۔ وہ ہر چیز کے متعلق مختلف قسم کے سوال کرتے ہیں،
قیمت دریافت کرتے ہیں؛ پوچھتے ہیں، فلاں چیز کہاں سے
خریدی گئی تھی۔ اگر میزبان یہ جواب دے کہ میں نے اسے گذشتہ
سال کشمیر سے خریدا تھا، تو وہ فوراً فرمائش کر دیتے ہیں: "ان
گرمیوں میں آپ جائیں، تو میرے لئے بھی ضرور لائیں۔"

بعض مہمان، میزبان کے گھر میں اس طرح رہتے ہیں
جیسے انہیں وہاں نظر بند کر دیا گیا ہو، ہر وقت بستر پر پڑے
رہیں گے یا ہر وقت باتیں ہی کرتے رہیں گے! میزبان اور
اس کے کنبے کو خلوت کا کوئی موقع ہی نہیں دیتے۔ گھر والوں
کو اپنے نجی معاملات کے طے کرنے کا یا الگ تھلگ ہو کر
صلاح مشورہ کرنے کا کوئی وقت ہی نہیں ملتا۔ مہمان کی موجودگی
میں انہیں کئی دفعہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاکر
کھسر پھسر کرنی پڑتی ہے۔ مہمان مطالعہ کے کمرے میں نہیں بیٹھتا
سیر و تفریح کے لئے باہر نہیں نکلتا۔ ایسے شخص سے میزبان بہت
جلد اُکتا جاتا ہے، وہ دل ہی دل میں بوجھ محسوس کرتا ہے۔

اچھا مہمان اپنے میزبان کی خلوت کا، اُس کے نجی معاملات کا
نہایت فراخ دلی سے احترام کرتا ہے۔ اگر میزبان عدیم الفرصت
ہو، تو وہ اپنی خودمختاری سے کام لے کر اکیلا ہی سیر و تفریح کے
لئے باہر چلا جاتا ہے، تاکہ اُس کی غیر حاضری میں میزبان سہولت
اور آزادی کے ساتھ اپنے خانگی معاملات سے عہدہ برآ
ہو سکے۔

مہمان کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ میزبان کے
گھر میں ایسا مہمان بن کر رہے، گویا گھر کا کوئی کام کرنا اُس کے
لئے ذلت یا عار کا باعث ہوگا۔ اچھا اور پیارا مہمان وہ ہے جو
میزبان کے خانگی کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے ہر وقت
تیار رہے۔ اگر مہمان عورت ہو، تو بہت بہتر ہو اگر وہ اپنی
میزبان کو کھانا وغیرہ تیار کرنے میں مدد دے، جس کام میں
اُس کی ضرورت محسوس ہو، بلاتامل اپنی مدد پیش کرنی چاہئے
مثلاً ضرورت کے وقت بازار سے سودا سلف لا دینے میں
مہمان کی کچھ شان نہیں گھٹتی۔ یہ باتیں بظاہر معمولی ہیں، لیکن انہی
چھوٹی چھوٹی باتوں سے محبت اور ہمدردی کے رشتے استوار
ہوتے ہیں۔

آج سے کئی برس پہلے جب میں ایک نو عمر طالب علم تھا،
مجھے اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اُس
وقت میرا خیال یہی تھا کہ میزبان کے ہاں کوئی کام کرنا مہمان کے
لئے باعث عزت نہیں۔ میرے میزبان نے مجھے ایک کام بتایا:-
"اُس بھینس کو کنوئیں پر لے جاؤ اور اسے پانی پلا لاؤ"۔ مجھے ان
لفظوں سے بہت اذیت پہنچی۔ میں نے مشکل سے اپنی ناراضی
چھپائی اور خاموشی کی صورت میں اپنے میزبان کا کہا ماننے سے
انکار کر دیا۔ اسی پر بس نہیں کیا، اُسی دن اپنے گھر واپس
آگیا۔ پورے پندرہ برس تک مجھے وہ لفظ ایک پھوڑے کی
طرح تکلیف دیتے رہے۔ میں پھر کبھی اُس رشتہ دار کے
گھر نہیں گیا۔

تجربے نے مجھے بتایا کہ میرا وہ خیال غلط تھا۔ میری ناراضی بے معنی تھی۔
میں نے خواہ مخواہ ایک بے جا تکلیف کا بوجھ اٹھائے رکھا۔ میرے لئے یہی بہتر
تھا کہ میں اپنے میزبان کا بتایا ہوا کام کر دیتا اور جتنے بھی دن اُس کے
ہاں رہتا، گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتا۔ میزبان کا ہاتھ بٹاتا۔

خود مختاری، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، مہمان کا ایک نہایت پسندیدہ
وصف ہے۔ میزبان اُس سے جائز طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اُس کے
گھر میں بے دست و پا ہو کر نہ رہے۔ اپنی ضرورتیں جہاں تک ہو سکے، خود
پوری کرے۔ اُسے بچوں کی سی بے چارگی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئے۔ مثلاً
یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد ہر بار اُس کے ہاتھ
میزبان ہی دھلائے۔ وہ اپنا کوئی بھی کام خود بخود نہ کرے، یہاں تک کہ
میزبان ہی اُس کی انگلی پکڑ کے سیر کے لئے باہر لے جائے۔ اُسے اپنی مخصوص
عادتوں کی طرف خود دھیان دینا چاہئے۔ میزبان سے یہ توقع نہ رکھنی چاہئے
کہ جن چیزوں کا وہ خود عادی نہیں، اُن کا بھی ٹھیک ٹھیک اہتمام کر سکے
گا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں اگر مہمان اپنے گھر ہی سے ساتھ لے جائے، تو
بہتر ہے۔ مثلاً کنگھی، تولیہ، دانت صاف کرنے کا پیسٹ اور برش وغیرہ
—— اس طرح کی چیزیں میزبان کے گھر سے لے کر استعمال کرنا تہذیب

سوسائٹی میں بالکل اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

میزبان کے گھر میں مہمان کا کسی اور شخص کو، بالخصوص کسی ایسے شخص کو جو میزبان کے لئے اجنبی ہو، دعوت دینا بہت ہی معیوب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص میزبان کے لئے پسندیدہ نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میزبان اُس کی ضیافت کو اپنے اُوپر ایک بوجھ محسوس کرے۔ اِس صورت میں پہلے مہمان کا احترام بھی اُس کے دِل میں گھٹ جائے گا۔ یہ تقریب میزبان کے لئے خوشی کے بجائے تکلیف اور تکلف کا باعث ہو گی۔ مہمان و میزبان دونوں کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے گا۔

جِس شخص کے ساتھ میزبان کے تعلقات اچھے نہ ہوں، مہمان کا فرض ہے، نہ اُس کی دعوت قبول کرے، نہ اُسے میزبان کے گھر بلائے اور نہ خود اُس کے گھر جاکر اُس کے ساتھ میل جول رکھے۔ رسمی مزاج پرسی اور معمولی صاحب سلامت کے سوا اُس کے ساتھ کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہئے۔

اِس اصول کی پابندی نہایت ضروری ہے کسی عزیز سے عزیز دوست کی خاطر بھی اُس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ وہ جِس شخص کے ہاں مہمان ٹھہرا ہے، اُسی کا مہمان بن کر رہے۔ اگر کوئی شخص میزبان کے خلاف کوئی شکایت کرے، باہمی شکر رنجی کے قصے کہانیاں سُنانے لگے، تو کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی جائے۔ نہ میزبان ہی تک اُس کی شکائتیں پہنچائی جائیں۔ مہمان کو اپنا یہ فرض کسی حال میں بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اُس کے کسی بھی فعل سے میزبان کو تکلیف نہ پہنچے۔ اُس کی خوشی بہ ہر صورت مقدم سمجھی جائے۔

مہمان کو میزبان کے ہاں کتنا عرصہ ٹھہرنا چاہیے؟ قطعی اور فیصلہ کن لفظوں میں اِس کا جواب دینا مشکل ہے۔ دونوں کے باہمی تعلقات ہی اِس کا بہتر جواب دے سکتے ہیں۔ لابولائے (Laboulaye) کا قول ہے:۔ "The first day a guest; the second day a burden; the third day a pest."

(پہلے دِن مہمان، دوسرے دِن بوجھ اور تیسرے دِن بلائے جان) یہ قول بہت حد تک سچا ہے، لیکن اِتنا سچا نہیں کہ ہر مہمان پر صادق آجائے۔ مہمان اور میزبان کے تعلقات اِتنے گہرے بھی ہو سکتے ہیں کہ تین دن تو کیا، تین ہفتے کی مہمان داری سے بھی میزبان کی حسرت پوری نہ ہو۔ اِس کے برعکس اگر کوئی شخص دعوت، محبّت اور اشتیاق کی بنیادی شرطیں پوری کئے بغیر آئے دِن کسی کا مہمان ٹھہرتا رہے گا، تو کوئی تعجّب نہ ہو گا، اگر میزبان اُس کے تین گھنٹے کے قیام کو بھی مصیبت سمجھے۔ اس قسم کے مہمان کو "خوش آمدید" اُس وقت نہیں کہا جاتا، جب وہ آئے، بلکہ اُس وقت کہا جاتا ہے، جب وُہ جانے لگے۔

جِس طرح یہ ضروری ہے کہ مہمان اپنی آمد سے میزبان کو باقاعدہ اطلاع دے، اُسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ وہ اُسے اپنی روانگی کے وقت سے پہلے ہی آگاہ کرے۔ اچانک، یک لخت اُٹھ کے چل دینا میزبان کے لئے بعض حالتوں میں تعجّب کا باعث ہو گا، اور بعض حالتوں میں پریشانی کا۔ ہو سکتا ہے، وہ اُس طرزِ عمل سے بھڑک اُٹھے۔ مہمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ گھر پہنچ کر میزبان کو خط لکھے اور اُس کی مہربانی اور میزبانی کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرے +

ضروری تصحیح ہمارے شمارہ بابت ماہ دسمبر میں پروفیسر پرشوتم لال صاحب ضیا ایم اے کی دو نظمیں "ہم اور لاہور"، اور "یہ انبالہ" شائع ہوئی تھیں۔ غلطی سے پہلی نظم میں دو شعروں کی حالت بگڑ گئی تھی۔ وہ شعر یوں پڑھئے گا:- دل کو بے حد عزیز تھا لاہور حد سے آگے نکل گیا لاہور

ایک یادگار جوبلی

از

جناب یزدانی جالندھری

بہت سی چیزوں کی طرح "جوبلی" کی وبا بھی ہندوستان میں مغرب ہی سے درآمد ہوئی ہے اور اس کے سب سے زیادہ پاؤں جمے ہیں ہماری صنعتِ فلم میں — جہاں کسی فلم کی کامیابی کا انحصار ہی جوبلی پر ہے اور جب تک وہ سلور جوبلی نہ منائے، کامیاب نہیں سمجھی۔ لیکن جناب خوشتر گرامی مدیر "بیسویں صدی" کا زرخیز دماغ جو ہر بات میں بات پیدا کرنے کا عادی ہے، بھلا "جوبلی" کے معاملے میں کیونکر خاموش رہ سکتا تھا؟ یہ بات تو کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ خوشتر صاحب کامیاب ادیب و صحافی ہیں اور اُن کی اس کامیابی میں جہاں ان کی کاروباری ذہانت، نظر، ہمت، محنت اور [illegible] کو کافی حد تک دخل حاصل ہے، وہاں سب سے بڑا حصّہ اُن کی دوست نوازی، خلوص و محبّت اور اتحاد پرورانہ خیالات کا ہے۔ اُن کا مذہب ہے انسانیت اور اُن کا مشرب انسان دوستی۔ وہ اکثر بڑے افسوس سے کہا کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ہندو اور مسلمان تو بہت ملتے ہیں لیکن انسان بہت ہی کم نظر آتے ہیں — — اور اُن کے ان خیالات و عقاید کا پتہ تو ہمیں "بیسویں صدی" میں بھی [illegible] ہے۔ تقسیمِ وطن سے قبل [illegible] کے اعتبار [illegible] [illegible] اور وہ بھی تنگ خیالی اور فرقہ پرستی کی رو میں بہہ گئے، لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ خوشتر صاحب آج بھی اتحاد و انسانیت کی اُسی بلند سطح پر ہیں، جہاں وہ تقسیمِ وطن سے پہلے تھے۔ "بیسویں صدی" جب لاہور سے شائع ہوتا تھا جب بھی ادب و انسانیت کا ترجمان تھا اور اب کہ خوشتر صاحب لاکھوں روپے کی جائیداد اور کاروبار کی تباہی کے بعد دہلی میں آکر نئی زندگی کا آغاز کیا ہے، "بیسویں صدی" اپنے مسلک پر قائم ہے، اُس کا مطمحِ نظر اب بھی ادب کی خدمت اور انسانیت کی ترجمانی ہے اور وہ اس بات پر بجا فخر کر سکتے ہیں کہ "بیسویں صدی" ہندوستان کے اُن محدودے چند رسائل میں سے ہے جنہیں ہندوستان اور پاکستان دونوں حصّوں کے ادبا و شعراء کا تعاون حاصل ہے اور وہ دونوں جگہ یکساں ہر دلعزیز و مقبول ہے۔

میں بھی کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ تو قریب قریب سب جانتے ہیں کہ خوشتر صاحب کامیاب ادیب و صحافی ہیں، لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ کھانے اور کھلانے میں بھی وہ پنجاب کی روایتی فراخدلی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور اُن کی دوسری خصوصیات کی طرح اس خصوصیت پر بھی تقسیمِ وطن کی کوئی چھاپ نہیں پڑی۔ چنانچہ "جوبلی" کے معاملے میں بھی اُن کے اختراع پسند دماغ نے نئی راہ کی داغ بیل ڈالی ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سالِ نو کے آغاز پر یکم جنوری کو انہوں نے جناب ڈاکٹر ایس۔ ایچ حیدر آف میسرز لے ایچ وھیلر اینڈ کو الہ آباد سے اپنے پچیس سالہ دوستانہ تعلقات کی "سلور جوبلی" ایک پُر تکلّف دعوتِ طعام کی صورت میں منائی۔ اس دعوتِ مرغ و ماہی میں جو محمدی دنیا جہان "مرغ و ماہی" کا اعلان کرنے والوں میں کئی بلند پایہ ادبا و شعرا، مقامی اخبار نویس اور دیگر اصحاب شامل تھے اِن میں سے دیوان گوپال اس بی آئی بی ٹی سابق ہیڈ ماسٹر سناتن دھرم ہائی سکول راولپنڈی، ڈاکٹر برج نارائن ماتھر ایم بی بی ایس، رائے صاحب صوفی لچھمن پرشاد آف مستانہ جوگی"، حافظ محمّد یوسف مدیر "شمع"، جناب انور علی مالک ماہنامہ "بانو" جناب سعید احمد مدیر "پیمانہ" کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

خوشتر صاحب نے فی البدیہہ تقریر میں جہاں ڈاکٹر حیدر صاحب سے اپنے پچیس سالہ روابط اور دوستانہ مراسم پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف کے اخلاقِ حسنہ اور جذبۂ دوست نوازی پر روشنی ڈالی وہاں اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ اس بزم میں مولانا عبدالمجید سالک مدیر "انقلاب" لاہور اور ڈاکٹر احمد نیشف پی سی۔ ایس سپرنٹنڈنٹ مینٹل ہسپتال لاہور ایسے مخلص احباب شریک نہیں۔ ان پُرخلوص احباب کا تذکرہ کرتے ہوئے خوشتر صاحب کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ انہوں نے کہا — کاش ہمیں اُن سے بھی اپنے دوستانہ مراسم کی جوبلی منانے کے قابل ہوتا اور آج وہ بھی یہاں موجود ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب نے جوابی تقریر میں خوشتر صاحب کی دوست نوازی اور اتحاد پرورانہ جذبات کو سراہتے ہوئے کہا کہ آج کے زمانے میں جب ایسی تقریبیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں، خوشتر صاحب نے یہ جوبلی منا کر اتحاد و وضعداری

بچوں کے لئے پُر لطف اور چٹپٹی کہانیاں

اِن میں سے ہر کتاب تین رنگ کے خوبصورت ٹائٹل چکنے کاغذ اور موٹے خوشخط حروف میں چھپی ہے - ایک ایک کتاب میں کئی کئی کہانیاں ہیں۔ بچے پڑھ کر ہنستے سوچتے اور اچھی اچھی باتیں سمجھ جاتے ہیں - یہ بچوں کو ہنسانے والی پاکیزہ اور دلچسپ کتابیں اخلاق بھی سکھاتی ہیں - پیارے بچوں کو یہ کتابیں پڑھنے کو دیں -

کتاب	قیمت
احمقوں کا بادشاہ	سات آنے
جناتوں کا شہر	چھ آنے
جموں دادا	پانچ آنے
کہانی جو بکری چبا گئی	چھ آنے
اکڑ صاحب کی باتیں	چھ آنے
مسکراتی کلیاں	آٹھ آنے
وہی ایک روٹی	پانچ آنے
چاندی کا محل	آٹھ آنے
مشیر کی دادی	دس آنے
اپنی کہانی	پانچ آنے
ننھے میاں	چھ آنے
فرشتہ کا پیغام	پانچ آنے
چوہا کیسے شیر بنا؟	پانچ آنے
جن کا باغ	چار آنے
ایک ہتھی راجکماری	چھ آنے
فردوسی حور	نو آنے
چین کی شہزادی	سات آنے
طلسمی گڑیاں	سات آنے
رات کی رانی	پانچ آنے
شہزادی نرگس	پانچ آنے
آپ بیتیاں	پانچ آنے
سی الف لیلے	پانچ آنے
چاند اور کوئل کی کہانی	چھ آنے
کنجوس کا جوتا	چھ آنے
لاڈلی بیٹی	سات آنے

کتاب	قیمت
سوتیلی ماں	دس آنے
بہن کی محبت	پانچ آنے
شیطان کی کھوپڑی	پانچ آنے
دو موتی	چھ آنے
سات ستارے	سات آنے
شہزادی نیلوفر	سات آنے
جھوٹ سچ	چھ آنے
مرد مکار ہیں یا عورتیں	پانچ آنے
شہید کربلا	پانچ آنے
زمین دوز شہر	پانچ آنے
اگر میں ڈکٹیٹر ہوتی	پانچ آنے
کیڑوں کا انتقام	پانچ آنے
انٹرنیس پاس دلہن	بارہ آنے
اسلم کی شادی پری سے	پانچ آنے
لندن کا چڑیا گھر	آٹھ آنے
ہماری عیدیں	چھ آنے
جانبازیاں	آٹھ آنے
لاڈلا شہزادہ	پانچ آنے
دلچسپ پہیلیاں	چار آنے
مزیدار پہیلیاں	چار آنے
بڑانی شہزادی	چار آنے
پری کی چھڑی	چار آنے

کتاب	قیمت
پرستان کی سیر	تین آنے
تارہ کا ڈنڈا	تین آنے
بونے کا ٹٹو	تین آنے
آب حیات	دو آنے
بڈھے شاہ	تین آنے
تاج میاں	تین آنے
بندریا شہزادی	چار آنے
شہزادی حور بانو	تین آنے
جادو کا شیشہ	تین آنے
طلسمی کھلونا	پانچ آنے
تین شرطیں	تین آنے
منی کا پرستان	پانچ آنے
بہادر سنار	بارہ آنے
طلسمی مینا	پانچ آنے
کیا چکمہ دیا	چودہ آنے
میرا نام چپلا بلا	بارہ آنے
ایک ٹانگ کا بادشاہ	دس آنے
غرور کا سر نیچا	چار آنے
بندر کا عقیقہ	چھ آنے
نادرہ	پانچ آنے
بنی ادی	پانچ آنے
کلو راجہ	چار آنے

کتاب	قیمت
سنجوگ	آٹھ آنے
سچی بہادری	آٹھ آنے
کہانی نانی کی زبانی	چھ آنے
بی سیدانی	چھ آنے
جادو کا ڈنڈا	چار آنے
نارنجی جوڑے سیر کو چلے	تین آنے
منی منی کہانیاں	چار آنے
حرکت میں برکت	آٹھ آنے
شہرزاد	آٹھ آنے
مرجینا	آٹھ آنے
بچپن کی یادیں	پانچ آنے
اچھی کہانیاں	پانچ آنے
نیا میلاد	آٹھ آنے
اچھی نقلیں	پانچ آنے
سنہری گھنٹی	پانچ آنے
چھوٹا پیغمبر	پانچ آنے
سچی لگن	پانچ آنے
روشن پری	پانچ آنے
پانچ کم تیس	دس آنے
انار راجہ	تین آنے
جھپو	چار آنے

ملنے کا پتہ

رسالہ بیسویں صدی دھلی

جناب خوشتر گرامی پرنٹر و پبلشر نے نعمانی پریس ترکمان گیٹ دہلی سے چھپوا کر دفتر رسالہ "بیسویں صدی" چرخے والان دہلی سے شائع کیا

خاوند اور بیوی کیلئے ان کتب کا مطالعہ
اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ ایک
انسان کیلئے ہوا اور غذا ضروری ہے
प्रेम शास्त्र
काम शास्त्र
गर्भ शास्त्र
گربھ شاستر
کام شاستر
پریم شاستر
پوشیدہ راز ـــ خفیہ باتیں ـــ کارآمد نکتے
تمام ریلوے بک سٹال بیچتے ہیں
اردو تین روپیہ
پریم شاستر
ہندی تین روپیہ
اردو تین روپیہ
کام شاستر
ہندی تین روپیہ
اردو تین روپیہ
گربھ شاستر
ہندی تین روپیہ
ان کتابوں میں طب
اور سائنس کی رو سے ایسے ایسے
خفیہ راز درج ہیں جو اکثر تجربہ کار
سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور
جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی اور جوانی کی
اصلی مسرتیں اور حقیقی لذتیں حاصل ہوں گی
ان کتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان
جیسے غریب ملک میں ان کتب کی چار لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی !
تینوں کتابیں اکٹھی منگوانے پر محصولڈاک صرف آٹھ آنے چارج کیا جاتا ہے !
ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دھلی

طاقت کی مشہور دوا
نامور ڈاکٹر اور سائنسدان یہ حقیقت تسلیم کر چکے ہیں
کہ ریڈیم ٹانک پلز مردانہ کمزوری کا یقینی علاج ہیں
زبردست مردانہ طاقت بڑھانے کیلئے ریڈیم ٹانک پلز
ریڈیم ٹانک پلز
رجسٹرڈ
ریڈیم ٹانک پلز
تندرست نوجوان ان دواؤں کے استعمال سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں
نامور ڈاکٹر ان دواؤں کے استعمال کی زبردست سفارش کرتے ہیں
ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ دھلی

پیدائشی اندھے پن کے سوا آنکھ کی
ہر بیماری کا علاج
تندرست آنکھوں والے استعمال کریں تو
بینائی بڑھاپے میں بھی تیز رہتی ہے
رجسٹرڈ
ریڈیم آئی ڈراپس
کرنے والوں کو تو "ریڈیم آئی ڈراپس" کا
استعمال ضرور کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ آنکھوں
کی آنے والی بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
قیمت فی شیشی صرف تین روپیہ محصول ڈاک ۱۰/
تمام مشہور انگریزی دوا فروش بیچتے ہیں
یا ہم سے طلب کریں:
انڈیا آفس
ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ دھلی

خاوند اور بیوی کیلئے اِن کُتب کا مُطالعہ
اِتنا ہی ضرُوری ہے جتنی کہ ایک
اِنسان کیلئے ہوا اور غذا ضرُوری ہے
پریم شاستر
کام شاستر
گربھ شاستر
प्रेम शास्त्र
काम शास्त्र
गर्भ शास्त्र
پوشیدہ راز ــــ خفیہ باتیں ــــ کارآمد نکتے
تمام ریلوے بک سٹال بیچتے ہیں
پریم شاستر
اردو تین روپیہ
ہندی تین روپیہ
کام شاستر
اردو تین روپیہ
ہندی تین روپیہ
گربھ شاستر
اردو تین روپیہ
ہندی تین روپیہ
ان کتابوں میں طِب
اور سائنس کی رُو سے ایسے ایسے
خُفیہ راز درج ہیں جو اکثر تجربہ کار
سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور
جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی اور جوانی کی
اصلی مسرتیں اور حقیقی لذتیں حاصل ہوں گی۔
اِن کُتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان
جیسے غریب مُلک میں اِن کُتب کی چار لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خُوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی!
تینوں کتابیں اکٹھی منگوانے پر محصُول ڈاک صرف آٹھ آنے چارج کیا جاتا ہے!
مِلنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دہلی

دہلی چلو	شورش کاشمیری	۳-۰-۰
آزاد ہند فوج کا البم	امداد صابری	۳-۰-۰
جواہر لال کی کہانی	محمد رحیم دہلوی	۵-۸-۰

مذہبی کتابیں

مسلمانوں کا روشن مستقبل	طفیل احمد	۴-۸-۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	مولانا اشرف علی تھانوی	۲-۸-۰
اسلام کیسے شروع ہوا	عبدالواحد سندھی	۲-۴-۰
اسلام کیسے پھیلا؟	"	۲-۴-۰
دوزخ کا کھٹکا	مولانا احمد سعید	۲-۴-۰

نظم، غزل، گیت

نئی دنیا کو سلام	سردار جعفری	۳-۰-۰
سنبل و سلاسل	جوش ملیح آبادی	۴-۸-۰
شعلہ و شبنم	"	۵-۰-۰
نقش و نگار	"	۳-۸-۰
فکر و نشاط	"	۲-۸-۰
حرف و حکایت	"	۳-۰-۰
عرش و فرش	"	۴-۰-۰
سیف و سبو	"	۴-۰-۰
رامش و رنگ	"	۶-۸-۰
شاعر کی راتیں	"	۱-۴-۰
شب آخر	کیفی اعظمی	۳-۰-۰
بستان بہزاد	بہزاد لکھنوی	۱-۴-۰
مصحف بہزاد	"	۱-۴-۰
کلام ربانی	نظر سوہانوی	۱-۱۲-۰
وطنی نظمیں	نیر	۰-۱۲-۰
گفتار بیخود	بیخود دہلوی	۲-۰-۰
اسلامی نظمیں	نیر	۰-۱۰-۰

مشرقی مغربی کشیدہ کاری رسالہ سے دوگنا سائز، مرکن طرز کی خوبصورت جلد، ڈیڑھ سو سے زائد بہترین کشیدہ کاری کے ڈیزائن، تکیہ کے اشعار، چادروں کے کونے، گریبان، بیلیں، ہر قسم کے انگریزی بیل بوٹے اور خوشنما پھول، میز پوش، فلاور باسکٹ کے حسین ترین ڈیزائنوں سے مزین ہے۔ کشیدہ کاری کی بہترین کتاب ہے۔ بچیوں کے جہیز میں ضرور دیجئے۔ اس کتاب کی ڈرائنگ دہلی کے ایک ایسے نامور آرٹسٹ نے کی ہے جو فن کشیدہ کاری کے بہترین ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مختصر سے عرصے میں تین ایڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے۔ اب چوتھا ایڈیشن اردو، ہندی مشترکہ دونوں زبانوں میں رسالہ "بیسویں صدی" کے دوگنے سائز پر شائع کیا گیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

رضیہ کراس اسٹچ کراس اسٹچ ورک کے لئے ایک بے حد خوشنما کتاب۔ اکثر مشرقی بہنوں کو کراس اسٹچ کے کام سے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ کراس اسٹچ کا فن کشیدہ کاری کے سلسلے میں ایک مرغوب فن ہے۔ اور سلیقہ مند خواتین کراس اسٹچ سے بہت شوق رکھتی ہیں۔ محترمہ رضیہ سلطانہ صاحبہ نے کراس اسٹچ کی ایک ایسی مفید کتاب تیار کی ہے جسے دیکھ کر آپ پھڑک اٹھیں گی۔ ایسی ایسی بیلیں، دامن، کونے اور مرکز آپ کو اس کتاب میں ملیں گے کہ آپ دیکھ کر محو حیرت ہو جائیں گی۔ مشرقی مغربی کشیدہ کاری کی طرح یہ مفید کتاب بھی رسالہ سے دوگنے سائز پر شائع ہوئی ہے مضبوط خوبصورت جلد، قیمت صرف چار روپے۔

رضیہ ماڈرن فیشن بک فیشن کی وبا سب سے پہلے لندن، پیرس، امریکہ کی خواتین میں نمودار ہوئی۔ اس کے بعد پنجاب کی خواتین نے اسے اختیار کیا۔ اور ہوتے ہوتے یہ فیشن تمام ہندوستان میں پہنچ گیا۔ چنانچہ مشرقی بہنوں نے فیشن ایبل کپڑے تیار کرنے پر لاکھوں روپیہ برباد کر دیا۔ محترمہ رضیہ سلطانہ صاحبہ چمن دہلوی نے فیشن ایبل کپڑے تیار کرنے کے لئے یہ کتاب تیار کی ہے۔ اس میں ڈھائی سو قسم کے فیشن ایبل کپڑے تیار کرنے کی ترکیبیں مع نقشہ جات درج کی ہیں اور ہر لباس میں خواتین اور بچوں کی قلمی تصویریں اس لباس کے ساتھ بنا دی گئی ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے فیشن ایبل خواتین اس کتاب کو بے حد پسند کریں گی۔ نمونہ کے مطابق فیشن ایبل کپڑے گھر ہی پر تیار ہو سکتے ہیں۔ بڑا سائز، خوبصورت اور مضبوط جلد، قیمت صرف چار روپے۔

رضیہ کا شاہی دسترخوان جب دہلی میں غدر پڑا اور دہلی کے باکمال کوڑی کوڑی کے محتاج ہوگئے۔ تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ اہل کمال لوگوں میں چلے آرہے تھے، غدر کے فاقوں سے تنگ آکر ان اہل کمال لوگوں نے اپنے صدیوں کے رازوں کو کوڑیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا "رضیہ کا شاہی دسترخوان" بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے، جو مغل بادشاہوں کے شاہی باورچی سے حاصل کی گئی تھی، قیمت صرف ساڑھے تین روپے +

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی

جناب خوشتر گرامی پرنٹر و پبلشر نے الامان پریس ترکمان گیٹ دہلی سے چھپوا کر دفتر رسالہ بیسویں صدی چرخے والان دہلی سے شائع کیا۔

وہ سلمیٰ کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ سلمیٰ زخمیوں کے کس کیمپ میں ہے، لیکن وہ ناامید نہ ہوا اور جلد ہی اُس کیمپ کا پتہ لگا لیا، جس پر دشمن کے بزدل طیارچیوں نے رات کی تاریکی میں بمباری کی تھی۔

جب خالد زخمیوں کے کیمپ میں پہنچا، تو اُس نے سب سے پہلے مرنے والوں کے نام دیکھے، جو بمباری کی زد میں آگئے تھے۔ اُن ناموں میں اُسے سلمیٰ کا نام بھی نظر آیا، لیکن اُسے یقین نہ ہوا۔

اُس نے زخمیوں کے کیمپ کے افسرِ اعلیٰ سے جب سلمیٰ کے متعلق استفسار کیا تو اُس نے خالد کو بتایا کہ سلمیٰ بچ سکتی تھی، لیکن جب اُسے کیمپ سے باہر نکلنے کو کہا گیا تو اُس نے زخمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں ان زخمیوں کو چھوڑ کر اپنی جان بچانا بزدلی سمجھتی ہوں —— جوں جوں خطرہ قریب آتا گیا، سلمیٰ نڈر اور بے باک ہوتی گئی...... اور مغلوب الغضب، شکست خوردہ غنیم نے بھاگتے بھاگتے زخمیوں کے کیمپ پر بمباری کر کے انسانیت و اخلاق کے منہ پر کالک پوت دی۔ تفصیلات سے آگاہ ہونے کے بعد خالد نے افسرِ اعلیٰ سے کہا کہ میری ایک گذارش ہے۔

کیا؟ افسرِ اعلیٰ نے پوچھا۔

"میں سلمیٰ کو اس ویرانے (میدانِ جنگ) میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔" خالد نے کہا، "میری گذارش ہے کہ سلمیٰ کی لاش مجھے دے دی جائے۔ اور میں جس طرح سلمیٰ کو اپنے ساتھ لے کر محاذِ جنگ پر آیا تھا، واپسی میں بھی سلمیٰ میرے ساتھ ہو۔" اتنا کہتے کہتے خالد کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

افسرِ اعلیٰ خود بھی سلمیٰ جیسی شجاع خاتون کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اُس نے خالد کی درخواست منظور کر لی۔

* * * * * *

آج شہر میں بڑی ہلچل ہے۔ آج قوم پرست سرفروش محاذِ جنگ سے اپنے مستقر کو واپس آرہے ہیں —— شہر قومی جھنڈوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے آراستہ کیا جا رہا ہے —— کچھ دیر کے بعد قومی نعرہ "جے ہند" کی آواز سے سارا شہر گونج اُٹھا ——

جب قومی فوج شہر میں داخل ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ فوج کے آگے آگے ایک فوجی ٹرک ہے، جس پر بے شمار پھول بکھرے پڑے ہیں۔ جب ٹرک قریب آیا تو دیکھنے والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے دیکھا کہ ٹرک پر ایک مرمریں تابوت رکھا ہے۔ جب ٹرک سے تابوت نکالا گیا تو سب نے دیکھا کہ تابوت پر سرخ جلی حروف میں لکھا ہے:۔

"شہیدِ وطن!" —— لیکن یہ راز صرف خالد ہی کو معلوم تھا کہ اُس کی سلمیٰ شہیدِ وطن بھی ہے اور شہیدِ محبت بھی! (طبع زاد)

"بیسویں صدی" کے تمام خریدار رسالہ بذریعہ رجسٹری منگواتے ہیں اور اُنہیں رسالہ نہ پہنچنے کی کبھی شکایت نہیں ہوتی۔ آپ بھی سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپے بھیجتے وقت سوا دو روپیہ رجسٹری خرچ یعنی سال بھر کے بارہ پرچوں کے لئے بحساب تین آنے فی پرچہ ضرور بھیجئے۔ رسالہ نہ پہنچنے کی آپ کو کبھی شکایت نہیں ہوگی۔

دلچسپ کتابیں

سرخ نقاد	تین روپے	پتھر سے ہیرا	دو روپے
رضیہ کے افسانے	پندرہ آنے	دفینے	سوا دو روپے
لعل و گوہر	سوا روپیہ	قیمتی جہیز	ایک روپیہ
باپ کا خط بیٹی کے نام	بارہ آنے	نئے خاکے	پونے دو روپے
فاطمہ کا لال	سوا دو روپے	افسانۂ غم	آٹھ آنے
نئی اُمنگیں	سوا دو روپے	زارینہ	ڈھائی روپے
انقلابی مولوی	پانچ آنے	شکوہ جواب شکوہ	چار آنے

ملنے کا پتہ:۔ بیسویں صدی دہلی

شہیدِ وطن

افسانہ

از

محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی

"پیاری سلمےٰ! ضد نہ کرو...."

"خالد! میں تمہیں تنہا محاذِ جنگ پر نہ جانے دوں گی!"

"لیکن سلمیٰ! محاذِ جنگ پر تمہارا کیا کام؟ تم محاذِ جنگ پر جا کر کیا کرو گی؟"

"تو کیا عورت اتنی ناکارہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی..... معاف کرنا خالد! تمہیں فرطِ محبت نے غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

ڈالا ہے بیخودی نے عجب راہ پر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے"

"یعنی؟" خالد نے استفسار کیا۔

یعنی کہ میں رائفل اور مشین گن نہیں چلا سکتی تو کیا زخمیوں کی خدمت بھی نہیں کر سکتی؟" سلمےٰ نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں کیا پڑی ہے کہ ان نازک ہاتھوں کو خدمت کی زحمت دو؟" خالد مسکرایا۔

"نہیں خالد، یہ نہیں ہو سکتا کہ تم محاذِ جنگ پر رہو اور میں گھر میں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں۔ سلمیٰ نے کہا۔" یہ زمانہ جدوجہد کا زمانہ ہے۔ آج کی عورت وہ عورت نہیں کہ آئینہ و شانہ لئے بیٹھی رہے۔ تم پر وطن کی خدمت کا فرض عائد ہوتا ہے، تو مجھ پر بھی تو وطن کا کچھ حق ہے۔ دور کیوں جاؤ آج یورپ کی عورت ہر معرکۂ حیات میں مرد کے دوش بدوش سرگرمِ عمل ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے، لیکن یورپ کی عورت اخلاق سے تہی دامن ہے۔" خالد نے طنز کیا۔

"لیکن خالد! تم اس وقت ایک مشرقی خاتون سے ہمکلام ہو، جو اپنی پاکیزگیٔ اخلاق میں آج دنیا میں مشہور و ممتاز ہے۔" سلمیٰ نے چیں بجبیں ہو کر جواب دیا۔

"بہت خوب سلمیٰ۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" خالد نے کہا۔

"قدر کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ میں ان جذبات کو بروئے کار لانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" خالد نے پوچھا۔

"اس طرح کہ تم محاذِ جنگ پر سرفروشی کا ثبوت دو، اور میں زخمیوں کی خدمت کروں۔" سلمیٰ نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

شہر میں ہر طرف ہنگامہ ہے۔ سڑکوں، شاہراہوں پر سپاہی جوق در جوق نظر آ رہے ہیں۔ بیجئے! بگل بجا اور سپاہیوں کا دستہ محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سرفروشوں کے اس دستے میں خالد و سلمیٰ بھی ہیں۔

سلمیٰ جب روانگی کے لئے تیار ہوئی تو اس کے ساتھ اور بھی محبّانِ وطن خواتین آ گئیں۔ محاذِ جنگ پر پہنچ کر سب نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ خالد نے پہلا مورچہ سنبھالا۔ اسی لئے سلمیٰ کو دورانِ جنگ میں خالد کی کوئی خبر نہ ملی اور ملتی بھی کیونکر؟ سلمیٰ مجروحین کے کیمپ میں تھی اور خالد میدانِ جنگ میں۔

جنگ شباب پر تھی.... گھمسان کا رن تھا.... دشمن اپنی پوری قوت سے حملہ آور تھا — خالد کمال دانائی سے مدافعتی جنگ لڑ رہا تھا۔ زمین پر سنگ، آسمان پر جنگ۔ ایک طرف مسلّح ٹینک شعلہ فشاں تو دوسری طرف ہوائی جہاز آتش ریز.... مجروحین کے کیمپ میں زخمی آتے جا رہے تھے اور سلمیٰ انتہائی توجّہ و دلجوئی سے زخمیوں کی مرہم پٹّی میں مصروف تھی۔

آج کی جنگ فیصلہ کن مرحلے تک پہنچ چکی تھی۔ خالد کی فوج نے غنیم کے لشکر کو شکست دی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

خالد کو جب جنگ سے مہلت ملی تو اسے سلمیٰ کی یاد نے ستایا۔

علامہ راشد الخیری مرحوم کی تصانیف

جو ہندوستان بھر میں ہمارے سوا اور کہیں نہیں مل سکتیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ماہِ عجم	دو روپے	تندرستی ہزار نعمت	پانچ آنے	خانہ داری کے تجربات	ایک روپیہ چار آنے
یاسمین شام	دو روپے	طوفانِ اشک	ڈیڑھ روپیہ	تمغۂ شیطانی	ایک روپیہ
عروسِ کربلا	دو روپے	سترونتی	آٹھ آنے	دعائیں	بارہ آنے
چمنستانِ مغرب	ڈیڑھ روپیہ	منظرِ طرابلس	آٹھ آنے	محبوبِ خداوند	ایک روپیہ چار آنے
[illegible]	بارہ آنے	بے فکری کے آخری دن	پانچ آنے	صنعت و حرفت	دو روپے بارہ آنے
موودہ	دس آنے	بنت الوقت	دس آنے	نالۂ زار	ایک روپیہ
فسانۂ سعید	بارہ آنے	داستانِ پارینہ	ایک روپیہ	بچہ کا کرتا	چار آنے
بیلا میں میلہ	ایک روپیہ	شادی کا انتخاب	دس آنے	سودائے نقد	چھ آنے
عالمِ نسواں	دس آنے	آفتابِ دمشق	ایک روپیہ بارہ آنے	نوبت پنج روزہ	دو روپے
گوہرِ مقصود	آٹھ آنے	مسلی ہوئی پتیاں	آٹھ آنے	دلی کی آخری بہار	ایک روپیہ آٹھ آنے
جوہرِ عصمت	دو روپے چار آنے	شاہین و دراج	بارہ آنے	سرگذشتِ ہاجرہ	ایک روپیہ
الزہرا	ایک روپیہ آٹھ آنے	منازلِ ترقی	چار آنے	ولائتی نقلی	آٹھ آنے
[illegible]	پانچ آنے	خدائی راج	ایک روپیہ بارہ آنے	بساطِ حیات	آٹھ آنے
سرابِ مغرب	دس آنے	جوہرِ قدامت	دو روپیہ آٹھ آنے	درِ شہوار	بارہ آنے
عروسِ مشرق	ایک روپیہ	چہار عالم	چار آنے	بلبلِ بیمار	بارہ آنے
نشیب و فراز	پانچ آنے	قرآنی قصے	ایک روپیہ آٹھ آنے	احکامِ نسواں	ایک روپیہ آٹھ آنے
ڈیڈیا کی سرگذشت	چار آنے	بزمِ رفتگان	بارہ آنے	تربیتِ نسواں	ایک روپیہ آٹھ آنے
یادگارِ تمدن	سات آنے	سیلابِ اشک	ایک روپیہ آٹھ آنے	نوحۂ زندگی	ایک روپیہ
نسوانی زندگی	دس آنے	آمین کا دمِ واپسیں	چار آنے	حیاتِ صالحہ	دو روپے چار آنے
[illegible]	دس آنے	فریبِ ہستی	سات آنے	حور اور انسان	ایک روپیہ
محسنِ حقیقی	آٹھ آنے	تفسیرِ عصمت	چھ آنے	طوفانِ حیات	ایک روپیہ بارہ آنے
خواتین کی دستکاری	دس آنے	شہنشاہ کا فیصلہ	چار آنے	منازل السائرہ	تین روپے :

ملنے کا پتہ ۔ رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

اعضائے تناسل میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اس ہیجان سے مجبور ہو کر نوجوان جلق کے عادی ہوجاتے ہیں۔ جلق کی عادت رفتہ رفتہ پختہ اور راسخ ہوجاتی ہے اور وہ اپنی جوانی، صحت اور تندرستی برباد کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس مضر صحت فعل کے عادی نہ ہوں تو مرچوں کے اثرات سے جریان، احتلام اور سرعت و رقت کی مخصوص شکائتیں قطعی پیدا ہوجاتی ہیں۔

ماہ پارے

از

جناب سردار جلیل ایم۔اے، ایل ایل۔بی

جس وقت کہ الفاظ پہ قابو نہیں رہتا
جذبات کے خاموش اشارے ہیں یہ آنسو

کیسے وہ، اُن کی مسیحانفسی کیا اب تو
یہ بھی احساس نہیں دردِ جگر ہے کہ نہیں

صیاد کہاں اور کہاں میرا نشیمن
خود مجھ کو مری ہمتِ پرواز نے مارا

ہر ایک آہٹ پہ دیکھتا ہوں پلٹ پلٹ کر میں جانبِ در
حقیقتاً منتظر نہیں ہوں مگر مجھے انتظار سا ہے

عمرِ دراز مجھ سے نہ کٹتی مرے خدا
اچھا کیا جو مرگِ جواں بخش دی مجھے

رُخ سے پردا اُٹھائے نہ ابھی
شام ہی سے سحر نہ ہوجائے

وہ اور یہ تجاہل دبے مہرباں، غلط
شاید ہمارے حال کی اُن کو خبر نہیں

جب سے کہ پلائی ہے ہم کو اک شوخ نے آنکھوں آنکھوں میں
اُس وقت سے ہم دخترِ رز کو ہونٹوں سے لگانا بھول گئے

صبح تا شام اشک و آہ ندیم
اب یہی زندگی ہماری ہے

یہ وسوسے، یہ توہم، یہ آرزو، یہ فریب
میں منتظر ہوں کوئی انتظار ہو کہ نہ ہو

وہ ابتدائے عشق میں پیہم کسی کی یاد
اب انتہا یہ ہے کہ انہیں کو بھلا چکے

دنیا جسے سُن کر سر دُھن لے، وہ بھی جسے سُن کر بے خود ہوں
ہم سازِ محبت کی لَے پر وہ گیت سنانے آئے ہیں

ہوکر مختلف قسم کی بیماریوں میں جگر کو مبتلا کر دیتا ہے۔ مثانے، گردے
روعیہ اور مجری بول تک مرچوں کے اثرات سے ماؤف ہوجاتے ہیں۔
جگر کی متعدد بیماریاں زیادہ مرچیں کھانے ہی سے ہوتی ہیں۔

جس روز مرچیں زیادہ استعمال کی جائیں، اُسی دن پیشاب گہرا
زرد اور جل کر آنے لگتا ہے۔ لیکن اس میں نقصان کی پروا کئے بغیر ہم
مرچوں کا استعمال جاری رکھتے ہیں۔ آخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مثانے
اور پیشاب کی نالی میں سوزش پیدا ہوکر جلد ہی پیپ پڑ جاتی ہے۔

مرچوں کے مسلسل اور خصوصاً زیادہ استعمال سے دیگر نقصانات
کے علاوہ بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ مادۂ تولید قطعی رقیق ہوجاتا ہے،
رقت، سرعت اور لگاتار احتلام کی شکائتیں پیدا ہوجاتی ہے۔
اور یہ شکایتیں بڑھتے بڑھتے ضعفِ باہ کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں دہلی اور یوپی کے
اضلاع میں لال مرچیں بہت زیادہ کھائی جاتی ہیں، اور اس کے نتیجہ
کے طور پر کوئی بواسیر میں مبتلا ہے، کوئی رقت و سرعت کا شکار ہے۔
کسی کو نزلہ اور زکام گھیرے ہوئے ہے۔ کسی پر اسہال و پیچش جیسے
امراض نے تسلط جما رکھا ہے۔

بات یہ ہے کہ مرچ کھاتے ہی منہ، حلق، مری اور معدے میں
سوزش ہونے لگتی ہے اور اس سوزش کی بنا پر آدمی بار بار پانی پیتا
ہے، لیکن پیاس نہیں بجھتی۔ معدے سے برابر ہل من مزید کی صدائیں
آتی رہتی ہیں۔ تشنگی کا تقاضا مسلسل جاری رہتا ہے۔ آخر پانی زیادہ
پینے سے قوتِ ہاضمہ کمزور ہوجاتی ہے، اور سوزش بڑھتے بڑھتے معدے
سے گذر کر آنتوں کو جالیتی ہے اور پھر خون جانے لگتا ہے یا اسہال و
پیچش کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے سرخ مرچوں کی زیادتی خون کو جلاتی اور
ہاضمے کو خراب کرتی ہے۔

معمولی مقدار میں مرچوں کے استعمال میں تھوڑی سی افادیت
بھی ہے اور یہ بالکل قدرتی چیز ہے۔ چونکہ اس پوری کائنات میں
کوئی ایسی تخلیق نہیں کی گئی جو اپنے اثرات کی بنا پر صرف نقصان دہ
اور مضرت رساں ہو، کیسی بھی ضرر رساں اور مضرت پہنچانے والی
چیز ہو، اپنے میں کچھ نہ کچھ افادیت کا عنصر ضرور رکھتی ہے۔ چنانچہ
لال مرچیں بھی حسب ذیل فوائد کی حامل ہیں:۔

مرچوں کو زیادہ تر مصالحہ کے طور پر سالنوں میں استعمال کیا
جاتا ہے۔ اس سے غذاؤں کے نفاخ کی اصلاح ہوتی ہے اور ہضم میں
مدد ملتی ہے۔ محققینِ طب اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ مرچوں کو
کم مقدار میں کھایا جائے تو ان کے اثرات سے معدے کی رطوبت
اور لعاب دہن زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ آنتوں کی حرکات دودھ بڑھ جاتی
ہیں اور یہ مدرِ لعابِ دہن مقوی معدہ اور کاسرِ ریاح بھی ہیں۔ محققین
طب ان کو محرکِ عروق و قلب، مُدرِ بول اور مقوی باہ بھی کہتے ہیں۔ آب و
ہوا کے تغیرات سے معدے پر جو مضر اثرات پڑتے ہیں، مرچیں اُن کو بھی
دور کرتی ہیں۔ دورانِ سفر میں جب مختلف مقامات کی آب و ہوا سے واسطہ
پڑے تو اُس وقت کی بے قاعدگی سے تندرستی کو جو نقصان پہنچ سکتا
ہے، مرچوں کا استعمال اس کا ازالہ کر دیتا ہے۔ جب شراب نوشی کی
زیادتی انسان پر ایک جنون سا طاری کر دیتی ہے، ایسے وقت میں مرچوں
کا استعمال شراب کی طلب میں نہ صرف کمی کر دیتا ہے بلکہ اس سے افعالِ
معدہ کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ اکثر طبیب ہیضے کے مریضوں کو لال مرچوں
کا استعمال کراتے ہیں۔ ہیضے میں معدے کو تقویت پہنچانے اور قلب و
عروق میں تحریک پیدا کرنے کے باعث لال مرچوں کو افادی حیثیت دی
جاتی ہے۔ یہ فوائد اندرونی طور پر ہیں۔ خارجی طور پر بھی لال مرچوں کو
دوا کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان میں خون کو جذب کرنے کی
صلاحیت ہے۔ اس لئے انہیں محمر کہتے ہیں۔ اگر سگ گزیدہ آدمی کے زخموں
پر مرچوں کو پانی میں پیس کر لگایا جائے تو زخم میں سوزش تو بہت
ہوگی، لیکن خون کے جذب ہوجانے کی وجہ سے زخم کا تمام زہر خارج
ہوجائے گا۔ زخم میں پیپ نہیں پڑے گی اور خشک ہوکر جلد اچھا ہوجائے
گا۔ یہ ہیں لال مرچوں کے فوائد، لیکن مضرات کے مقابلے میں قطعی ہیچ۔

ہندوستان میں مرد تو مرچوں کے استعمال میں قدرے احتیاط
برتتے ہیں، مگر عورتوں کو مرچوں والی چٹ پٹی قسم کی غذائیں بے حد
مرغوب ہیں۔ اسی بنا پر عورتوں میں ضعفِ بصارت اور دھندلا دکھائی دینے
کی شکائتیں عام ہیں اور اکثر عورتیں اندامِ نہانی کی خارش میں مبتلا
ہوتی ہیں۔ اور سیلان الرحم جیسے موذی مرض کا شکار ہوجاتی ہیں۔

اگر عورت بچے والی ہے تو مرچوں کا اثر دودھ کے ذریعے بچے
پر بھی پڑتا ہے۔ آنکھوں میں میل کچیل آنے لگتا ہے اور اکثر آنکھیں
دُکھنے آجاتی ہیں۔ پیچش کی شکایت تو عام ہے۔

لال مرچوں کا استعمال نوجوان کے لئے بھی سخت مضر ہے۔ اُن کے

سرخ زہر

لال مرچیں
سائنس کی روشنی میں

ہندوستان میں لال مرچوں کے استعمال کا رواج اس قدر عام ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گھر میں سالنوں اور ترکاریوں کے ساتھ مصالحہ کے طور پر بہ افراط کھائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک یورپ، امریکہ، افریقہ، عرب، شام، ٹرکی وغیرہ میں کہیں بھی لال مرچ نہیں کھائی جاتی۔ پٹھان جیسی اکھڑ اور تندخو قوم بھی اس کے استعمال سے گریز کرتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ حالت ہے کہ دونوں وقت کے کھانے میں دسترخوان پر کوئی ترکاری یا سالن ایسا نہیں ہوتا جس میں لال مرچوں کا کافی جز نہ ہو۔

اصل چیز یہ ہے کہ ہماری "لذت پرستیوں" اور زبان کے چٹخاروں نے ہمیں کسی چیز کے نفع نقصان کے متعلق سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اگر زہر میں بھی ہمارے لئے زبان کا چٹخارہ ہو تو شاید اُس کو بھی کھانے سے گریز نہ کریں۔ اس سلسلے میں نہ ہمیں اپنی صحت کا خیال ہے اور نہ اپنے بیوی بچوں کی تندرستی کا۔ ہماری یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا بچہ کچھ کھانے کے قابل ہوا اور ہم نے اُس کے منہ میں مرچوں کے سالن ٹھونسنا شروع کئے۔ اوّل اوّل تو بچہ منہ بنا بنا کر اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے، لیکن ہم اُس کی نفرت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آخر کار بچہ مرچیں کھانے کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ فطری جذبہ نفرت اُس کے دماغ سے محو ہو جاتا ہے۔

لال مرچوں کے نقصانات کی فہرست بہت طویل ہے اور فوائد کی حیثیت آٹے میں نمک کی سی۔

مرچوں کے مضر اثرات سب سے پہلے غذا کی اُس نالی پر پڑتے ہیں جو منہ سے شروع ہو کر مقعد تک گئی ہے۔ جب ہم کوئی ایسی چیز کھاتے ہیں، جس میں مرچیں تیز اور زیادہ ہوں تو سب سے پہلے اس تیزی اور جھنجھناہٹ کا اثر زبان محسوس کرتی ہے۔ گویا قدرت کے بنائے ہوئے جسمانی نظام کے مطابق ہمیں مطلع کیا جاتا ہے کہ ہم کوئی ایسی چیز کھا رہے ہیں، جس سے ہماری صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے لیکن ہم اس کی قطعی پروا نہیں کرتے۔

منہ بُری طرح جل رہا ہے، ناک بہہ رہی ہے، آنکھوں سے پانی جاری ہے، سی سی کر رہے ہیں، مگر بلانوشوں کی طرح زہر مار کئے جا رہے ہیں۔ منہ حلق اور زبان کی اس آگ کو تسکین دینے کے لئے گھڑی گھڑی ٹھنڈا اور سرد پانی پیا جا رہا ہے اور جب یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو نزلہ زکام اور کھانسی تک نوبت پہنچتی ہے اور یہ کھانسی مزمن ہو کر زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔

مرچوں سے مملو نوالہ زبان، منہ اور حلق کو جلاتا ہوا مری سے گذر کر معدے میں پہنچتا ہے۔ مری اس نوالے سے اس لئے کم متاثر ہوتی ہے کہ مری میں اسے ٹھہرنے کا موقع نہیں ملتا۔ معدے میں بھی مرچوں سے مملو نوالہ اپنے وہی مضر اثرات دکھاتا ہے، جن سے منہ کا واسطہ پڑا تھا۔ معدے کے غشائے مخاطی میں سوزش اور جلن ہونے لگتی ہے۔ اور اس سوزش کی وجہ سے رطوبتِ معدی کی تراوش بڑھ جاتی ہے۔ اور اس بڑھی ہوئی رطوبت سے ہضم خراب ہو جاتا ہے، بھوک کم لگنے لگتی ہے۔ ضعفِ معدہ لاحق ہو جاتا ہے اور معدے میں سرطان پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ لال مرچیں معدے سے گذر کر آنتوں میں پہنچتی ہیں تو وہاں بھی اپنے اثرات دکھائے بغیر نہیں رہتیں۔ صبح کو بیت الخلا میں غذائی نالی کے آخری حصے میں وہی سوزش اور جلن ہوتی ہے جس نے کھانے کے وقت زبان، منہ اور حلق کو جھلسا دیا تھا۔

جب مرچوں کی تیزی اور گرمی خون میں جذب ہو جاتی ہے اور یہ متاثر شدہ خون آنکھوں کے تغذیہ کے لئے پہنچتا ہے تو اپنے مضر اثرات آنکھوں پر بھی ڈالتا ہے۔ آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں، اُن میں کچھ آنے لگتا ہے۔ پپوٹوں میں رو ہے (ککرے) پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر جلد ہی تدارک نہ کیا جائے تو دھندلا دکھائی دینا شروع ہو جاتا ہے، بصارت کمزور ہو جاتی ہے اور یہی مرچوں سے متاثر شدہ خون جگر پر اثر انداز

چاہتا ہوں کہ تم عورت ہو اور عورت کمزوریوں اور مرد کی محتاجیوں کا ایک حسین نام ہے ——! پھر وہ اُٹھتا ہوا بولا۔ گھبراؤ مت۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ اور نہ اب یہاں ٹھہروں گا۔ شاید تمہیں میری موجودگی سے بھی تکلیف ہوتی ہو ——!

وہ یکایک تیزی سے مُڑا اور رات کی تاریکی میں ایک طرف غائب ہو گیا۔ وہ جنگل کا سماں اور چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی اور تاریکی۔ میرا جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ رونگٹا رونگٹا کانپ اُٹھا۔ اس کیفیت کی وجہ صرف جنگل، رات، تاریکی اور اپنی تنہائی کا احساس ہی نہیں تھا۔ بلکہ سریش کا جھنجھوڑ کر جگایا ہوا کوئی پوشیدہ جذبہ۔ اور میرے دل میں یکایک ایک سوال گونجنے لگا: تو کیا وہ واقعی مجھ سے رُوٹھ کر چلا گیا؟ اور اس سوال کے جواب نے میرے دل میں ایک طوفان اضطراب برپا کر دیا۔ اور میں بے اختیار چیخ پڑی۔ "سریش! —— سریش!! مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی"۔

اور اُٹھ کر تیزی سے اُسی طرف دوڑی، جدھر سریش گیا تھا۔ لیکن چند ہی قدم چل کر اندھیرے میں ایک جھاڑی سے پاؤں اُلجھا اور گر پڑی۔ ساتھ ہی پھر میرے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی "سریش ——!" دوسرے ہی لمحہ میں دو مضبوط بانہوں میں تھی۔ اور سریش مجھے سینے سے چمٹائے میرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے کہہ رہا تھا۔ "میں یہیں ہوں شیلا۔ مجھے معلوم تھا تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں ——!"

"آہ —— سریش۔ مجھے معاف کر دو!" میں اُس کے چوڑے سینے میں دھنستی ہوئی سی سسک کر بولی "میں تنہا نہیں رہ سکتی سریش۔ میں عورت ہوں۔ تنہا چھوڑنے کی چیز نہیں ہوں ——!" اور اُس نے پوری طاقت سے مجھے بھینچ لیا +

ریویو

ماہنامہ "ہم لوگ"

حضرت الطاف مشہدی کی ادارت میں زیرِ نگرانی حضرت جگر مرادآبادی سرگودھا سے جاری ہوا ہے، حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ سیماب اکبرآبادی اور حضرت فراق گھورکھپوری ایم اے جیسے فن کاروں کا کلام شریکِ اشاعت ہے۔ تعلمی معاونین کا حلقہ ہر لحاظ سے ممتاز ہے۔ حضرت الطاف مشہدی کا ذوقِ سلیم بھی رسالہ کی باطنی خوبیوں کا ضامن ہے۔ ظاہری خوبیوں میں اضافہ کی گنجائش ہے۔ نام بھی غیر مانوس سا ہے۔ قیمت فی کاپی آٹھ آنے اور سالانہ چندہ چھ روپے مقرر ہے۔ ماہنامہ "ہم لوگ" سرگودھا پاکستان سے طلب کریں +

سندیس

از

جناب راج کنول

(طبع زاد)

ساون کی رُت
رِم جھم، رِم جھم
برس رہی
گھٹا گھنگھور ——

دل میں آشا پگلی
جاگ اُٹھی
لے کر انگڑائی
میں ڈھونڈ رہی ہوں
کِت ہے من کا چور! ——

گیت برہا کے
گا نہ سکھی
ساجن، میرے
آتے ہوں گے
سُن —— !
بن بولن لاگے مور ——

پاپی پپیہا
جیا تڑپا نہ
باوری کوئلیا
کوُ کوُ نہ بول
آتے ہوں
میرے چت چور ——

سُن ری بدریا
کالی کالی
سندیس میرا تو
پی سے کہنا
کہنا —— راہ تکتی ہے
کوئی درد کی ماری

گھٹا گھنگھور —— برس رہی —— رم جھم، رم جھم —— ساون کی رت —— دل کا شیشہ نہ توڑ —— یوں تڑپا کے

اپنے گذشتہ حالات سُنائے تو کہنے لگا۔ "ابھی سے تو تمہارے خیالات عورتوں سے جُدا گانہ ہیں۔ کیونکہ تمہاری عمر کا بیشتر حصّہ صرف اپنے بھائیوں کی صحبت میں گذرا ہے۔ اور اُنہیں کے خیالات کے ماحول میں تمہاری سوچ اور فکر کی نشو ونما اور تربیت ہوئی ہے۔ پھر بھی تمہیں ایک دن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ چاہے تم اپنی ساری عادتیں مردانہ بنا لو اور مردوں کے سامنے کام کرنے لگو، لیکن رہو گی عورت ہی!"

یعنی عورت کچھ بھی ہو جائے لیکن رہے گی مرد کا کھلونا ہی — ؟"

میں پھر چڑ گئی۔

"تم اب بھی نہیں سمجھیں شیلا —" وہ تھکا ہوا سا بولا۔

"میں کیا نہیں سمجھی — ؟" میں نے کہا۔ "یہی نہ کہ عورت کو بیوی بنا کر ایک ناکارہ سے ناکارہ مرد بھی چوبیس گھنٹے کام دینے والی بے تنخواہ لونڈی اور اپنے حیوانی صفت نفس کی غذا پا جاتا ہے — ؟"

"یہی انتہا ہے نہ تمہاری سمجھ بوجھ کی — ؟" وہ جھنجھلا کر بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ صرف اسی نقطہ نگاہ سے شادی کرتے ہوں۔ تو یوں تو اکثر عورتیں بھی مردوں پر جھپٹے مارتی پھرتی ہیں۔ لیکن اصل میں شادی تو عورت اور مرد کی ایک بہت بڑی فطری کمی کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں حقیقت میں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے رہتے ہیں۔ اور دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے بغیر ایک نامکمل کہانی کی طرح پھیکی پھیکی، بے رس بے رس اور بے جان بے جان سی رہتی ہے اور اسی کمی کا تقاضا ہے کہ عورت مرد کی طرف یا مرد عورت کی طرف انجانے ہی میں کھنچنے لگتا ہے۔ اور اسی کا نام ہے محبّت۔ جسے کہتے ہیں کہ نہیں جاتی ہو جاتی ہے —" اُس نے نہایت فلسفیانہ انداز میں آخری جملہ کہا۔

پھر تھوڑی دیر تک ہم ایک دوسرے سے نہیں بولے۔ ندی کا راستہ ختم ہو گیا تھا۔ اور ہم جنگل میں داخل ہو رہے تھے۔ راستہ پتھریلا اور نیچا اُونچا تھا۔ یکایک میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ میں بھی زمین پر آنے ہی والی تھی کہ سریش نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوڑے پر سے کود کر مجھے اُوپر ہی اُوپر سنبھال لیا۔ گھوڑے کا پیر کافی زخمی ہو گیا تھا اس لئے اُس پر مزید سواری نامناسب تھی۔

سُورج اپنی آخری کرنیں پھیلائے ہوئے رخصت مانگ رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ دھندلکا اُترتا آ رہا تھا۔ میں نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"اب کیا ہو گا — ؟"

"اب تو مجبوراً یہیں رات کاٹنی پڑے گی — کیونکہ پیدل جنگلی راستے سے گذرنا عقل مندی کے خلاف ہو گا —!" اُس نے جواب دیا۔

مجھے اُس کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔ اور گھوڑوں کو ایک درخت سے باندھ کر ہم ساتھ لائے ہوئے کمبل کو بچھا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد ہم نے پانی سے بھرا ہوا تھرمس اور کھانے کا سامان نکالا۔ اور کھانے سے فارغ ہو گئے۔

اب رات ہو چلی تھی اور سردی جاڑے کی حد تک بڑھ رہی تھی۔ سریش نے آس پاس سے لکڑیاں چن کر آگ جلائی اور ہم اُس کے گرد بیٹھ گئے۔ گرمی محسوس ہونے پر ہمارے تھکے ہوئے جسم کو کافی آرام ملا۔ آگ کی روشنی میں میں نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ اُس پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اتنے میں اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں بھی ایک مرتبہ ہل گئی، اور کانپتی ہوئی بولی: "اوہ — یہ کیا —؟ مجھے چھوؤ مت۔ دیکھو سریش میں کہے دیتی ہوں، مجھ سے دُور ہی رہنا —!"

اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ میرے کندھے سے سرکا لیا اور تھوڑی دیر میرے چہرے پر عجیب انداز سے دیکھتا ہوا کچھ سوچتا رہا۔ پھر بھاری آواز میں کہنے لگا۔ "میں نے تو سوچا تھا کہ تم عورت ہو اور پیار کرنے کے قابل ہو، لیکن اب مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ وہ میری بھول تھی تم عورت تو کیا انسان ہی نہیں ہو۔ صرف ایک پتھر کی حسین مورت ہو۔ تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ محبّت مرد کی خود غرضی اور نفس پروری کا نام ہے، لیکن میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ محبّت چاہنے اور چاہے جانے والے دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے عقیدت اور احترام کی تخلیق کا نام ہے۔ محبّت سُکھ اور شانتی کی پیغام بر ہے۔ محبّت اپنے خالق کی طرف سے اپنے بندوں کے لئے سب سے بڑا عطیہ ہے۔ میں تو کہتا ہوں محبّت ہی ایک ایسی صفت ہے جو انسان کو فرشتوں کا ہم پلّہ بنا سکتی ہے۔ محبّت کائنات کی روح ہے۔ اور محبّت —" کہتے کہتے جیسے وہ کہیں دُور کھو گیا۔ میں اُس کی آواز کے ترنّم میں کھوئی ہوئی اُس کے چہرے اور آنکھوں میں چمکتی ہوئی ایک خاص کیفیت میں گم تھی۔ وہ پھر کہنے لگا۔ عورت اور مرد کی تخلیق کا منشا ہی صرف محبّت ہے۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مرد ذات کو سمجھ چکی ہو اور اُس سے کسی چیز میں کم نہیں ہو، لیکن میں تمہیں آج صاف بتا دینا

"یعنی کبھی تم نے کسی مرد کو بچّہ جنتے سُنا ہے ۔۔۔؟" وہ نہایت سنجیدہ صورت بنا کر بولا۔

"اور صرف اسی مجبوری کے باعث مرد عورت کے لئے سُنہری جال بُنتا ہے ۔۔۔؟" میں نے پھر طنز کیا۔

اس مرتبہ اُس نے میرا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور جھنجھلایا ہوا بولنے لگا۔ "دیکھو شیلا ۔۔۔ چاہے تم قبول کرو یا نہ کرو۔ لیکن تم عورت ہو۔ اور جس طرح دھارے کے خلاف پیر کر کوئی دریا پار نہیں کر سکتا، اُسی طرح کوئی مخلوق اپنی فطرت اور اپنے خالق کی مرضی کے برعکس سوچ کر اور عمل کر کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میں آج تم سے یہ بات منوا کر چھوڑوں گا۔ کیونکہ چاہے تمہیں یقین آئے یا نہ آئے آج میں ایک بات اور بھی کہے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ میں تم سے محبّت کرتا ہوں۔ اور یہ آگ میں کتنے دنوں سے اپنے اندر چھپائے ہوں، اس کا اندازہ تم یوں کر سکو گی کہ میں نے جتنے علموں میں کمال حاصل کیا ہے، صرف تمہیں پانے کے لئے۔ کیونکہ تم سے دُور رہتے ہوئے بھی میں مدّت سے تمہاری فطرت اور رجحان کا غائر مطالعہ کرتا رہا ہوں اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے مجھے کن کن مورچوں پر تم سے لڑنا پڑے گا ۔۔۔" اور اُس نے اپنی بات ختم کرتے ہی پاگل کی طرح مجھے اپنے چوڑے اور گداز سینے کی طرف کھینچ لیا۔

میں نے اُس کے اس فعل کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی۔ بلکہ یوں کہئے کر ہی نہیں سکی۔ جانے کس جذبے کے ماتحت جیسے بے بس سی ہو گئی تھی۔ اور دماغ ایک گہرے نشے سے مدہوش ہوتا جا رہا تھا۔ ایک میٹھی گدگدی کے ساتھ سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا، میرا رونگٹا رونگٹا مضطرب، وہ ستارے کی طرح لرز رہا تھا اور آسمان پر چاند اور ستارے ناچتے ہوئے سے دکھائی دینے لگے۔ اس مرتبہ بھی اُس نے مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن میرے ہاتھ اُس کی گردن کے گرد کسے ہی رہ گئے۔

اور اس مرتبہ بھی ہوش آتے ہی میرا ہاتھ پھر اُٹھا۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی نشیلی مسکراہٹ دیکھ کر بے دم سا ہو کر رہ گیا۔

اُس رات بھی بستر پر لیٹی تو پھر اُس کے خیال نے آ گھیرا۔ اور پھر مجھے محسوس ہونے لگا، جیسے میں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔ کیونکہ وہ مرد ہے اور اُس نے کہا تھا "تم سے محبّت کرتا ہوں"۔ یعنی وہ چاہتا ہے، میں اپنی خودداری اور آزادی اُس کے قدموں پر ڈال دوں۔

ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا، جیسے میرے خیالات کے ہجوم کو چیرتی ہوئی کوئی آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ "شیلا ۔۔۔، تم تسلیم کرو یا نہ کرو۔ لیکن تم عورت ہو۔ اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہ کرو گی تمہاری حقیقی زندگی کبھی سکھی نہیں ہو سکتی۔ میں تمہیں یہ بات منوا کر رہوں گا۔ کیونکہ میں تم سے محبّت کرتا ہوں"۔

میرے کانوں میں بار بار یہی آواز آتی رہی۔ یہاں تک سو جانے کے بعد بھی جیسے میرے اِرد گرد کوئی گنگنا رہا ہو۔ "میں تم سے محبّت کرتا ہوں، میں تمہیں پیار کرتا ہوں"۔

دوسرے دن صبح ہی سرتیش آ پہنچا۔ رات بھر بار بار نیند اُچٹ جانے کی وجہ سے اچھی طرح سو نہیں سکی تھی۔ اس لئے اب تک میں گہری نیند میں تھی۔ پھر بھی اُس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ آنکھیں کھلتے ہی میں نے اُسے سامنے کھڑا پا کر پوچھا۔ "اتنے سویرے کیسے ۔۔۔؟"

"ایک پروگرام تھا ۔۔۔" اُس نے بے تکلفی سے کہا۔

"وہ کیا ۔۔۔؟"

"اگر کوئی حرج نہ ہو تو آج گھوڑے پر کہیں دُور کی سیر رہے ۔۔۔!"

مجھے گزشتہ رات کی بات یاد آ گئی۔ آنکھوں میں غصّہ اُمنڈ آیا۔ اور میں اُسے کمرے سے نکل جانے کے لئے کہنے ہی والی تھی کہ وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہوا بولا۔ "ڈر گئیں شیلا ۔۔۔؟ میں جانتا تھا تم اب میرے ساتھ اکیلی ہرگز نہ جا سکو گی۔ یعنی اب تمہارے اندر سوئی ہوئی نسوانیت میرے جھنجھوڑنے سے جاگ رہی ہے ۔۔۔!"

اُس کا یہ طنز میں برداشت نہ کر سکی اور تن کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "اوہ ۔۔۔ یہ بات ہے تو چلوں گی ۔۔۔!" کیونکہ میں نے تو طے ہی کر لیا تھا کہ مرد سے صرف عورت ہونے کی وجہ سے شکست نہ قبول کروں گی۔

دو بجتے بجتے ہم روانہ ہو گئے۔ سرتیش کہیں سے ایک نقشہ لایا تھا۔ اُس کے مطابق ہمیں ندی کے کنارے کنارے پانچ میل چلنے کے بعد جنگل میں داخل ہو کر کسی پہاڑی مقام پر ڈیرہ جانا تھا۔ اور چاند نکلنے پر واپسی کی سکیم تھی۔

سردیوں کا موسم شروع ہو جانے کی وجہ سے ڈھلتی ہوئی دھوپ ہمیں بہت سُہانی معلوم ہو رہی تھی۔ سرتیش چلتے چلتے اپنے خاندان اور بچپن کے زمانے کے متعلق باتیں کرتا جا رہا تھا۔ اور جب میں نے

والی میں سوکھے پتّے کی طرح کانپ رہی تھی۔

اُس کے بعد دو دن مسز ٹیس مجھ سے ملا نہیں۔ لیکن تیسرے دن پھر اُس کی آواز سُنتے ہی میں حیرت اور غصّے سے کانپ اُٹھی۔ پھر بھی اپنے کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے طنز آمیز انداز میں کہا۔

"کہئے —— دو دن ——؟"

"کیونکہ اُس دِن تم کچھ ناراض ——!" اُس نے اپنے ہونٹوں پر وہی غرور آمیز مُسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "خیر —— بیتی باتوں کو کیا یاد کرنا؟ یہ تو بتاؤ تھیئٹر دیکھنے چل رہی ہو؟ بنگلور سے ایک مشہور پارٹی آئی ہے۔ میجر میرا کلاس فیلو ہے۔ اُس نے پوری فیملی کا پاس بھیج دیا ہے اور تم تو جانتی ہی ہو کہ یہاں فیملی دیکھی لے نام پر بس ——!"

میں اُس کی اِس تجویز کو ٹھکرا کر اُسے چوٹ دینے ہی والی تھی کہ دیکھا اُس کے ہونٹوں پر ایسی مُسکراہٹ چلی آرہی تھی، جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تو جانتا ہی تھا کہ تم ڈرگئی ہو۔ اور اب ہرگز میرے ساتھ نہ جاؤ گی۔ اس لئے میں نے فوراً ہونٹوں پر مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "شکریہ —— چلو اچھا شغل رہے گا۔"

مقررہ وقت پر مسٹر ٹیس آپہنچا۔ کار کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے کہا۔ "وقت کم ہے۔ مجھے چلانے دو تا کہ ہم جلد پہنچ سکیں۔" اُس نے فوراً بڑھ کر سٹیرنگ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "اوّل تو تم مجھے تھیئٹر دکھانے نہیں لے جارہی ہو۔ بلکہ میں تمہیں لے چل رہا ہوں۔ دوسرے جب میں کسی لڑکی کو ساتھ لے کر تفریح کے لئے نکلتا ہوں تو خود ہی موٹر چلایا کرتا ہوں —!" اُس کے ہونٹوں پر ایک شوخ دشریر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

میں اُس سے اِس وار کا جواب [illegible] آس کی تیز رفتاری میں کھو گئی تھی۔ اُس نے آندھی کی طرح [illegible] کی اور طوفان کی طرح چل پڑا۔ اُس کی مضبوط چوڑی کلائی سٹیرنگ پر حسین کھلونے کی طرح ناچ رہی تھی۔ اور شام کی دیوانی بھیڑ میں موٹر پانی میں مچھلی کی طرح تیرتی چلی جارہی تھی۔ بعض بعض موڑ پر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن وہ نہایت اطمینان سے موٹر اور بھیڑ کے ساتھ کھیلتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ یہ شخص واقعی خاص قسم کا مرد ہے۔ اور جانے کیوں میں پوچھ بیٹھی۔ "تم کرتے کیا ہو ——؟"

"بہت کچھ کرتا ہوں —— !" اُس نے پھر مُسکراتے ہوئے کہا۔ "کھانا کھاتا ہوں، کپڑے پہنتا ہوں، گانا گاتا ہوں، ستار بجاتا ہوں، موٹر پر کسی لڑکی کو تھیئٹر دکھانے لے جاتا ہوں۔ اور ہاں —— کبھی کبھی گھوڑے کی سواری بھی اور ——!" پھر کنکھیوں سے میرے تیور دیکھ کر بولا۔ "اچھا —— تمہارا مقصد پیشے سے تھا؟ میں ایک انشورنس کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں ——!" اور اُس کے چہرے پر ایک شوخ سنجیدگی بکھر گئی۔

تھیئٹر ختم ہوتے ہی ہم فوراً گھر کی طرف چل پڑے۔ فضا خاموش اور سنسان ہو رہی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ آسمان میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اور دُور اُفق میں سونے کی تھالی کی طرح آہستہ آہستہ چاند اُٹھ رہا تھا۔ اِن سب کے علاوہ مدھر مدھر چلنے والی ہوا کچھ ایسا نشہ بکھیر رہی تھی کہ مجھے یہ بھی نہیں محسوس ہوا کہ موٹر قریب قریب نہیں کے برابر چل رہی ہے۔ اور جس مرد ذات سے میں اِس قدر نفرت کرتی ہوں اُس کی ایک بانہہ میرے گلے میں پڑی ہوئی ہے۔

اتنے میں ایک جذبات آمیز سرگوشی میرے کان میں پڑی۔ "ستیلا —— تم اپنی صنف کی خلافِ فطرت اِس بغاوت کو کب ختم کرو گی؟ تمہارے اس نرم و نازک جسم پر اس مردوں جیسی پوشاک کے بجائے اگر جھلمل جھلمل کرتی ہوئی باریک اور ملائم ساڑی [illegible] حیثیت بلاؤز ہوتا تو کتنا دلفریب معلوم ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی نسائیت کو قبول کرتے ہوئے گھبراتی کیوں ہو؟"

"اِس لئے کہ میں اپنے کو مردوں کی جذباتی بھوک کی خوراک نہیں بنانا چاہتی ——!" مجھ پر پھر اپنا پُرانا بھوت آگیا تھا۔ میں بولنے لگی۔ "اپنی نسائیت کو قبول کرنے سے تمہاری مراد ہے، کسی مرد کی نفسانی خواہشات کا غلام ہو جانا۔ اُس کا کھانا پکانا۔ اُس کے کپڑے دھونا۔ اُس کے آرام کرنے کے لئے بستر لگانا۔ اور اُس کی یادگار کے طور پر بچّے پیدا کرنا۔ میں نہیں سمجھتی کہ جب عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو کہ مرد اپنے کو قابلِ پرستش سمجھتا ہے تو پھر عورت کیوں ——؟"

"میرے خیال میں ——!" وہ درمیان ہی میں بول اُٹھا۔ "ہاں عورت تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے کام بھی کر ڈالتی ہے جو مرد اپنی فطرت کے خلاف قیامت تک نہیں کر سکتا ——!" وہ مُسکرا رہا تھا۔

"یعنی ——؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

اُلٹے سیدھے ہی بیٹھ لیتے ہیں۔

شہر سے گذر کر جنگلی راستے پر پہنچتے ہی سرٹیس نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا " تو تم اُن عورتوں کو پسند نہیں کرتیں جو مردوں کے سامنے اپنے حُسن، جوانی اور آرٹ کا مظاہرہ کرتی ہیں ــــــ ؟

اُس کے مُنہ سے اچانک " تم " سُن کر میں تلملا اُٹھی۔ اور ساتھ ہی اسی لہجے میں بولی " اور تمہاری صنف کے اُن اوچھے لوگوں کو بھی ناپسند کرتی ہوں جو عورتوں کے سامنے اپنی تندرستی اور سینے مونڈھے خواہ مخواہ اچھالتے پھرتے ہیں ــــــ !

اس مرتبہ وہ ہنس پڑا۔ اب میں اور جھنجلا اُٹھی۔ اُس کی طرف تیکھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی " اچھا ــــ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی ــــــ ؟

وہ پھر بھی ہنسے ہی جا رہا تھا۔ اور ہنستے ہی ہنستے بولا " تم ــــــ عورتوں کو تو اس لئے نہیں پسند کرتیں کہ وہ مردوں کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں وہ حقیقی معنوں میں عورت ہیں؟ اور مردوں کو اس لئے ناپسند کرتی ہو کہ وہ اپنی مردانگی چھپاتے کیوں نہیں؟ خوب یعنی تم دونوں کی فطرت بدل دینا چاہتی ہو ــــ !

غصّے سے پاگل ہو کر میں نے ایڑ لگائی۔ میں اُس سے تھوڑی دیر کے لئے دُور ہو جانا چاہتی تھی۔ تاکہ کہیں براہ راست حملہ نہ کر بیٹھوں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں نے دیکھا سرٹیس کی ران کے نیچے آکر اُس سمت گھوڑے میں اتنی تیزی آگئی تھی کہ وہ مجھ سے بھی آگے ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا شاید سرٹیس اُس پر قابو نہیں رکھ سکا اور میرے گھوڑے کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر بدک کر آگے ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی جانے کیوں میں اس خیال سے سہم گئی کہ کہیں وہ شریر جانور سرٹیس کو اس اُونچی نیچی اور پتھریلی زمین پر گرا نہ دے۔ لیکن اُس کا اطمینان دیکھ کر مجھے مان لینا پڑا کہ یہ گھوڑے کی شرارت نہیں، بلکہ سوار کی چابکدستی ہے۔ جو ایسے ہٹیلے اور اڑیل جانور کو بھی اپنی مرضی کے مطابق اُڑا رہا ہے۔

اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ میں دُور چھوٹ گئی تھی۔ اس لئے وہ گھوڑا موڑ کر میرے پاس آگیا۔ میرا دم پھُول گیا تھا۔ مجھے اترتے دیکھ کر میرے قریب ہی خود بھی اُتر پڑا۔ اور ہنستا ہوا بولا " تو ایک مرد کو عورت کا یہ چیلنج تھا؟ خیر تم نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ مرد اُس کا مناسب جواب دے سکتا ہے ــــــ !

اور اس کے قبل کہ میں اپنی پھولتی ہوئی سانس پر قابو پاکر اس کا مُنہ توڑ جواب دے سکوں، اُس نے آگے بڑھ کر بلا جھجک مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں کس لیا۔ اور ــــــ !

ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میری ساری طاقتیں مفلوج ہو گئیں اور چند لمحوں کے لئے میں اُس کی آغوش میں کھوئی سی گئی۔ نہ تو میں اُسے دھکا دے کر ہٹا سکی۔ نہ ہاتھ ہی پاؤں مار سکی۔ یہاں تک کہ جب اس نے مجھے چھوڑ دیا تب بھی میں اُس سے خود الگ نہ ہو سکی اور جیسے نیند میں اُس کی طرف بے جان سی دیکھتی اور ہانپتی رہی۔

یکایک جیسے میری کھوئی ہوئی طاقت احساس واپس آگئی اور بجلی کی سی تیزی سے تڑپ کر میں نے اُس کے مُنہ پر ایک زور کا طمانچہ لگا دیا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اُڑ کر گھوڑے پر بیٹھتا ہوا نہایت بزدلی کے انداز میں گردن جھٹک کر بولا " چلتی ہو ــــ ؟ "

راستے بھر تو میں اُس عجیب الفطرت مرد کے متعلق سوچتی ہی آئی تھی۔ بقیہ دن بھر اور رات گئے تک بار بار وہی نقشہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ اس لئے نہیں کہ میں وہ واقعہ یاد کرنا چاہتی تھی، بلکہ اس لئے کہ میں اُسے بھلا نہیں سکتی تھی۔ دماغ میں بار بار وہی بات آجاتی اور بار بار میرا دل غصّہ اور شرم سے بھر جاتا۔ میں سوچنے لگتی۔ اُف ــــــ یہ مردذات۔ پہلے تو اُس نے اُلٹی سیدھی بک کر مجھے مشتعل کر دیا۔ اور پھر میری کمزوری پر ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ میری تھکن سے فائدہ اُٹھا کر ــــــ !

میں اُس سے بدلہ لینے کی سیکڑوں تجویزیں سوچتی۔ لیکن اُس کے استقلال کا خیال آتے ہی ساری تجویزیں فیل ہو جاتیں۔ آخر میں نے فیصلہ کیا آئندہ نہ تو اُس کے متعلق سوچوں گی۔ نہ اُس کی طرف نگاہ اُٹھاؤں گی۔ لیکن ساتھ ہی اندر سے کوئی بول اُٹھا۔ نہیں۔ یہ تمہاری شکست ہو گی۔ اس طرح تو ہمیشہ کے لئے وہی فاتح بنا رہے گا۔

اور رہ رہ کر مجھے وہی کیفیت یاد آتی رہی۔ جب اُس نے مجھے اپنے سینے میں پیوست کر لیا تھا۔ اور جیسے کسی میٹھے جادو نے زیر اثر میرے سارے اعضا شل اور سُن ہو گئے تھے۔ اپنے کو سب کچھ سمجھنے

نگاہ اُس کے اُوپر چھیکتی ہوئی نیچے اُتر آئی اور سوچنے لگی ۔ اچھا ہے
اچھے سے مورچہ لیا ہے مہاشے جی نے ۔ اور اگر زیادہ طبیعت نوازی
پر اُتر آئے تو کبھی وہ سبق دوں گی کہ ساری مردانگی دھری رہ جائے ۔
ابھی میں بیٹھک میں آکر اُس کی بدتمیزی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ
اچانک دروازے پر ایک زوردار دستک نے مجھے چونکا دیا ۔ دروازہ کھلتے
ہی میری حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ وہی نوجوان سامنے کھڑا کہہ رہا تھا ۔
"معاف کیجئے ——— میں نے آپ کو تکلیف دی ——!"
"اپنا مطلب کہیئے ——!" میں نے طنز کیا ۔
"دیکھئے ۔ میں آرٹسٹ کلب کی طرف سے آپ کے پاس آیا
ہوں ۔ ہم لوگ ایک نمائش کر رہے ہیں ۔ اُس میں ایک دن رقص اور موسیقی
کا بھی رکھا گیا ہے ۔ سنا ہے آپ بہت اچھا ناچتی ہیں !"
"اوہ —— تو آپ اپنی نمائش میں مجھے نچانا چاہتے ہیں ——؟"
میں نے چڑ کر پوچھا ۔
"جی ——!" اُس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا ۔
"اچھا تو سنئے مہاشے جی ——!" میں تنک کر بولی ۔ "میں نے حصولِ
فن کے طور پر یہ آرٹ سیکھا ضرور ہے ، لیکن مردوں کی دلبستگی کے لئے
اُس کی نمائش کو میں عورت ذات کی تذلیل سمجھتی ہوں ——!"
وہ میرے ہی جیسا کوئی ٹیڑھا جواب دینے کے بجائے نہایت
بے باکی سے مسکرا دیا ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اِس شخص میں قوتِ ضبط کا
غیر معمولی مادہ ہے ۔ اتنے میں وہ مجھ پر ایک نگاہ ڈال کر پھر اُسی مسکراہٹ
کے ساتھ بولا ۔ لیکن میرے نزدیک تو آپ کا یہ خیال ہی عورت کی تخلیق کی
منشا کا مذاق اُڑاتا ہے ۔ کیونکہ اصل میں عورت کی تخلیق ہی مرد کی دلبستگی
کے لئے ہوئی ہے ۔ اور اِس میں کامیابی ہی اُس کی سب سے بڑی
توقیر ہے ——!"
"یعنی آپ کے خیال میں عورت کے لئے مرد کا کھلونا بننا ہی باعث
عزت ہے —— ؟" میری آواز کسی قدر اونچی ہو گئی ۔
"کھلونا بننا —— ؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ "آخر آپ نے
عورت [illegible] بات کی ، نہ ؟ آپ اُس کا نام کھلونا بننا کیوں رکھتی ہیں ؟
[illegible] سے مرد کی زندگی [illegible] کیوں نہیں کہتیں ، جس کے بغیر مرد کی
[illegible] سونی اور گھر سُنی اُجاڑ رہتی ہے ——!"
"گرہستی —— ! جی ہاں ۔ وہی عورت کا خون چوسنے والا سنہری

جال —— !" میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا ۔ "ایک آخری پیشینگوئی مجھ سے سنتے
جائیے اور بس ۔ وہ یہ کہ آج کی عورت اب مرد کے اُس سنہری جال کو
نوچ کر آزاد ہو جانے کی طاقت اپنے اندر پیدا کر چکی ہے !"
"خیر اب میں چلا ——!" وہ جاتے جاتے اُسی سنجیدگی سے بولا ۔
"پڑوس میں رہتے ہوئے بھی اب تک ہم ایک دوسرے سے ناآشنا تھے ۔
اچھا ہی ہوا جو آج تعارف ہو گیا ۔ کبھی کام آئے گا —— ہاں میرا نام
سُرلیش ہے ۔ اور اگر ہرج نہ ہو تو آپ اپنا ——!"
"شیلا ——!" جیسے میں نے اُس کے منہ پر اپنا نام پھینک مارا ۔
"شکریہ ——!" کہہ کر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا ۔
سُرلیش کے جانے کے بعد میں اُسے گہری شکست دینے کی فکر میں
ڈوبی ہوئی سوچنے لگی ۔ اِس سرپھرے کو اپنی صنف پر جو گھمنڈ ہے ۔ میں اُسے
توڑ کر رہوں گی ۔
اُس رات میں طرح طرح کی سکیمیں سوچتی رہی ۔ اور صبح جیسے ہی
بھیّا دورے پر گئے ۔ میں نے نوکر کو بھیج کر اُسے بُلوا لیا ۔ دروازے میں قدم
رکھتے ہی اُس نے ایک فتحمندانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا ۔ "کہئے شیلا
دیوی کیسے یاد فرمایا —— ؟"
"ہاں —— کل پوچھنا بھول گئی تھی ۔ آپ گھوڑے کی سواری کر لیتے ہیں ؟"
میں نے اپنے خیال میں اُسے ایک ایڑ لگائی ۔
"جی —— بیٹھ تو لیتا ہوں گھوڑے پر اُلٹا سیدھا ——!"
وہ نہایت بے فکری سے بولا ۔
"تو صبح میرے بھائی کے گھوڑے پر میرے ساتھ تھوڑی دور
تک چلا کیجئے ۔ وہ کچھ دنوں کے لئے باہر چلے گئے ہیں ۔ سوچتی ہوں میری
مشق خراب نہ ہو جائے ——!"
اُس نے گردن ہلا کر رضامندی کا اظہار کر دیا ۔ اتنے میں تاکید
کے مطابق نوکر نے چائے کی ٹرے لا کر سامنے رکھ دی ۔ جھجکتے ہوئے سُرلیش
نے چائے قبول کر لی اور ہم اصطبل کی طرف چلے گئے ۔ میرے بھائی کا
گھوڑا دیکھنے میں بہت تندرست اور سیدھا تھا ، لیکن تھا چال کا بہت
اڑیل ۔ اور میں نے وہی گھوڑا سُرلیش کے حوالے کر کے سوچا ۔ آج
ہی تو مرد کو عورت سے پالا پڑے گا ۔ اُن کو اپنی حقیقت معلوم ہو جائے گی ۔
اور سُرلیش ، اُس پر سوار بھی ایسے ہوا جیسے دیوار پھاند رہا ہو ۔ میں
اندر ہی اندر مسکرائی ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے کہنے کے مطابق واقعی

وہ کتابیں جو آپ کو ضرور پڑھنی چاہئیں

بیگمات اودھ کے خطوط یہ رنگین و رومانی خطوط کیا ہیں؟ تاریخِ واجد علی شاہ کا ایک رنگین عکس، اودھ کے ایک حسین تاریخی دور کا حسین مرقع، شہنشاہی عیش پرستی اور عشق و محبت کی منہ بولتی تصویر۔ یہ خطوط لکھنؤ اور لندن کے عجائب خانوں میں قلمی نسخوں میں محدود تھے۔ اب ان کو بڑی جانفشانی سے یکجا کر کے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ہر لائبریری کے لئے یہ کتاب ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ دیدہ زیب مجلد، رنگین گردپوش۔ قیمت صرف دو روپے

جام و مینا بلند پایہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا بہترین انتخاب جس میں دورِ وسطیٰ کے تمام اہلِ قلم کے افسانے موجود ہیں۔ "جام و مینا" میں حضرت خواجہ حسن نظامی، حضرت مولانا سالک، منشی پریم چند، حضرت جوش، حضرت ایم۔ اسلم، نذر سجاد حیدر صاحبہ، پنڈت سدرشن، جناب افسر میرٹھی اور دیگر بلند پایہ افسانہ نگاروں کے شاہکار درج ہیں۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ڈھائی روپے۔

دنیائے تبسّم حضرت شوکت تھانوی کو کون نہیں جانتا۔ زبان کا تیکھاپن، بیان کی شیرینی، عبارت کی روانی، خیال کی شگفتگی اور پُر لطف مزاح آپ کی تحریر کی جان ہے۔ دنیائے تبسّم کے ہر مضمون میں زندگی اپنی پوری لطافتوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ مصنّف نے ایک چابکدست فنکار کی طرح الفاظ کے پیکر میں مسکراہٹیں بھر دی ہیں۔
قیمت فی جلد صرف ڈھائی روپے۔

جھروکے رومان اور شباب کے جھروکوں سے حضرت اشرف صبوحی نے زندگی کی جن نازک اور حسین حقیقتوں کو دیکھا ہے، انہیں نہایت خلوص سے ہو بہو اپنے افسانوں میں سمو دیا ہے۔ ایک ایک لفظ میں حسن و شباب اور سرمستیوں کے دھارے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ قیمت صرف ڈھائی روپے۔

خان صاحب مزاح نگاری ایک لطیف اور نازک فن ہے۔ کسی کو اس طرح ہنسانا کہ اپنی ہنسی نہ اڑے، حضرت ظریف دہلوی ہی کا حصّہ ہے۔ کوئی افسانہ اخلاق اور شائستگی سے گرا ہوا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کسی افسانہ کو پڑھ کر اپنے قہقہوں کو نہیں روک سکتے۔ قیمت صرف تین روپے۔

تازیانہ ایک خوبرو، نازک اندام دوشیزہ کی دلیری و جانبازی اور قابلیت و صلاحیت کی پُر لطف داستان ہے، جسے جناب محمد رحیم دہلوی نے اپنے زورِ قلم سے ناول نویسی کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ جو لوگ عورت کو ناقص العقل اور کمزور سمجھتے ہیں، ان کیلئے "تازیانہ" واقعی تازیانہ ہے۔ خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ تیسری مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

بھابی جان اس ناولٹ میں جناب فضل حق قریشی نے ہماری معاشرت کے کھوکھلے پن کو بالکل نئے زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ آنسوؤں اور قہقہوں میں سموئی ہوئی زبان میں ہندوستانی عورت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے، اس میں ایک زبردست افادیت جھلک رہی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے ۲

چھالے یہ افسانے منسوب ہیں سوسائٹی کے ان معصوم اور گنہگاروں کے نام جنہوں نے بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر گناہ کئے۔ ان خطاکاروں کے نام جو بے گناہ ہیں لیکن جنہیں بیگناہی کے باوجود سوسائٹی کے ظالمانہ قوانین نے سزا دی۔ ان بیواؤں کے نام جن کی دوسری شادیاں نہیں کی گئیں۔ اور انہوں نے فطری بھوک سے مجبور ہو کر گناہ کی زندگی گذاری۔ ان حوادثِ روزگار کے ہاتھوں ستائی ہوئی مظلوم دوشیزاؤں کے نام جنہیں جبر و ظلم کے شکنجے نے اپنی عصمت قربان کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ خوشنما مجلد مع سرورق، سفید کاغذ، حسین کتابت، عمدہ چھپائی ۲۵۶ صفحات قیمت صرف تین روپے

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

اور یہ انبالہ

ندیم! مجھ پہ ستم ڈھارہا ہے انبالہ
تری بلا کو خبر کیا بلا ہے انبالہ
وبالِ جاں ہیں یہاں کرم مکھیاں، مچھر
غمِ فنا سے سوا جانگزا ہے انبالہ
بن آئی موت کے ایجنٹ ہیں یہاں چوہے
بن آئی چاہنے والو! صلا ہے انبالہ
یہاں خدا کی خدائی کا ناک میں دم ہے
خدا گواہ، عتابِ خدا ہے انبالہ
دھوآں سا اور بگولے سے ہیں ہوائیں ہیں
جلے نصیب کی گویا چِتا ہے انبالہ
یہاں نہیں کوئی سنتا خدا کے بندوں کی
خدا کے حکم سے ناآشنا ہے انبالہ
یہاں کی خاک سے پانی ہوا ہوا ایسا
زباں کو آگ لگے، کربلا ہے انبالہ
یہاں حقیقتِ دنیا عیاں ہے ہر جانب
ہر اک لحاظ سے محنت سرا ہے انبالہ
مجال کیا جو یہاں سر چھپا سکے کوئی
ہجومِ خلق سے محشر بنا ہے انبالہ
یہاں نصیب کا رونا نہ عام ہو کیونکر
بشر کے خاص گنہ کی سزا ہے انبالہ
کسی بھی شے میں یہاں کوئی بھی نہیں خوبی
ضیا کو خوب نظر آچکا ہے انبالہ

مسرت کی تلاش

از: محترمہ ترلیشہ خاتون اُفق مظفرآبادی

اے حقیقی مسرت! میں تجھے کہاں تلاش کروں؟
لوگوں نے کہا،
"حقیقی خوشی خوش ذائقہ غذاؤں میں پوشیدہ ہے"
میں نے خوش ذائقہ غذائیں کھائیں
میں نے دنیا کی بہترین شرابیں پیں
جن میں مجھے عارضی خوشی ضرور محسوس ہوئی
لیکن اس کے بعد — پھر وہی تفکرات — وہی اندوہ و آلام
اے حقیقی مسرت!
میں تیری جستجو میں بال روم میں گیا
میں نے نرم و نازک جسم کا لمس محسوس کیا
یاقوتی لبوں سے میرے لب ملے
مرمریں بانہیں میری گردن کا ہار بنیں
پھر بھی میں — حقیقی مسرت سے محروم رہا
لیکن —
اے خوشی! میں نے تجھے پالیا
دنیا کے ہنگاموں سے دور — سبزہ زاروں کی وسعت میں
جہاں حدِ نگاہ تک مخملی فرش بچھا ہوا ہے
جہاں چرند اور پرند آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں
حقیقی مسرت کا خزانہ وہاں مستور ہے
جہاں زبردست زیردستوں کی تقدیر نہیں
جہاں سرمایہ افلاس کا مضحکہ نہیں اڑاتا
جہاں عصمت کا تقدس روٹی کے چند ٹکڑوں پر نہیں بکتا!
اور جہاں
بھائی بھائی کا گلا نہیں کاٹتا

(ولیم ایچ ڈیوس کی ایک نظم سے متاثر ہو کر)

ہم اور لاہور

از

جناب پروفیسر پرشوتم لال ضیا ایم اے

ہندوستان کی تقسیم کے سلسلے میں جس چیز نے ہمارے دلوں کو سخت ترین مجروح کیا ہے وہ ہے تبادلۂ آبادی۔ گھربار، مال و دولت سب کچھ بھلایا جا سکتا ہے۔ مگر وطن کی محبت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی جس طرح ہندوستان چھوڑنے والوں کو پاکستان کی نامانوس اور اجنبی فضا میں غریب الوطنی کا احساس ہمہ وقت مضطرب و بے قرار کئے ہوئے ہے، اُسی طرح پنجاب چھوڑ کر ہندوستان آباد کرنے والوں کے دلوں پر اپنے وطن کی یاد میں جو بیت رہی ہے، اُس کا اندازہ آپ ذیل کی دونوں نظموں سے لگائیے۔ دونوں نظمیں جناب پروفیسر پرشوتم لال ضیا ایم اے کے دلی تاثرات و جذبات کی آئینہ دار ہیں ——— ایک طرف ضیا صاحب اپنے ....محبوب وطن لاہور کو "خلد" کا درجہ دیتے ہوئے لطیف انداز میں خدا سے تلمیح آمیز شکوہ کر رہے ہیں ؎

کس گُنہ پر گئے نکالے ہم — ہم نے مانا کہ خُلد تھا لاہور

اور دوسری طرف ؎

یہاں خُدا کی خدائی کا ناک میں دم ہے — خُدا گواہ عتابِ خُدا ہے انبالہ

انبالے کو خدا کا عتاب کہہ کر "دوزخ" قرار دے رہے ہیں اور یہ ہے جذبۂ حُب الوطنی جو ایک دورافتادہ وطن کے دل میں جہنم کی طرح دہک رہا ہے۔ ہائے کیا کہا ہے کسی نے ؎

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے — بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے (ایڈیٹر)

دل کو بے حد عزیز تھا لاہور
آہ ہم سے بچھڑ گیا لاہور
تشنہ لب مر رہی ہے اِک دُنیا
آہ وہ چشمۂ بقا لاہور!
ہم غریبوں سے چھٹ گیا افسوس
ہم غریبوں کا آسرا لاہور
رات دن بیکلی سی ہے دِل میں
رات دِن ہے بُلا رہا لاہور
کیا کہیں ہم پہ کیا گذرتی ہے
کر گیا ہم کو کیا سے کیا لاہور

آج چھوٹے ہوئے ہیں لاکھوں جی
یعنی لاکھوں سے چھٹ گیا لاہور
بھول جاتا ہوں بار رہا سب کچھ
یاد آتا ہے بار رہا لاہور
اب نہیں رہ گئے کہیں کے ہم
اب ہمارا نہیں رہا لاہور
ہم تھے تیّار جان دینے کو
ہم سے لیتا نہ، اے خُدا، لاہور
کِس گُنہ پر گئے نکالے ہم؟
یہ تو مانا کہ خُلد تھا لاہور

خواب میں بھی نہ تھا خیال ہمیں
خواب بن جائے گا، ضیا، لاہور

بازار چلی گئی۔ اور وہاں کئی قیمتی ساڑیاں اور ریشمی کپڑے خریدے کچھ زیورات بھی خرید کئے۔ یہ دیکھ کر خادمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"سرکار، اتنی قیمتی ساڑیاں اور زیورات کس کے لئے خرید رہی ہیں آپ؟"

دلربا نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا "اپنی زندگی کو ویران کرنے کے لئے"

خادمہ کچھ نہ بولی۔ حیرت سے اُس کا منہ تکتی رہی۔ سادہ لوح خادمہ نے گھر پہنچتے ہی جانفزا کو خبر کر دی کہ ڈاکٹرنی صاحبہ بھاری بھاری کپڑے اور سونے کے زیورات خرید کر نہ جانے کس کے لئے لائی ہیں۔ جانفزا بے حد حیران ہوئی اور فوراً جا کر بجّی سے پوچھا کہ شاید اُسے کچھ علم ہو۔ بجّی نے جواب دیا۔

"جانفزا، تم پاگل ہو۔ آجکل دلربا آپا کا بوڑھا دماغ خراب ہو چکا ہے اُن کی باتوں میں ہمارا دخل ہونا حماقت ہے" جانفزا نے چُپ سادھ لی، لیکن اُس کے دماغ میں مختلف واہمے رینگ رہے تھے۔

علی الصبح دلربا نے بجّی کو بلایا اور نہایت سنجیدہ انداز میں کہا۔ "بجّی، خدا تمہیں جہاں رکھے، شاداں رکھے۔ اب میری زندگی ہی کیا ہے۔ مجھے زندگی کی کسی شے سے دلچسپی نہیں رہی۔ میں چاہتی ہوں اپنی آنکھوں کے سامنے جانفزا کی شادی تم سے کردوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس انتخاب سے اتفاق کروگے"

بجّی بھونچکا سا رہ گیا۔ اُسے جانفزا سے بے اندازہ محبت تھی وہ اُس کے خوابوں کی ملکہ تھی۔ لیکن بجّی کے دل میں بوڑھی دلربا کی محبت بھی پرورش پارہی تھی ——— اُن کے بوڑھے دل میں مچلتی ہوئی جوان تمنائیں ——— وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُس کے دل میں جذبات اور متضاد خیالات کا ایک طوفان برپا تھا ——— بیک وقت اُس کا جی چاہ رہا تھا ——— وہ پیکرِ ناز و شباب جانفزا ——— اپنی ہونے والی شریکِ خیالات کو دنورِ محبت میں آغوش میں کھینچ لے۔ اور ...... ساتھ ہی اُس کا دل چاہ رہا تھا، وہ بوڑھی دلربا آپا کے سرد ہونٹوں پر اپنے گرم ہونٹ رکھ کر کہے ——— "مجھے تم سے محبت ہے"

(طبع زاد)

THE TIME FACTOR!

وقت کی قدر

ہر ایک آدمی کے وقت کی قیمت ہوتی ہے۔ کسی کی کم کسی کی زیادہ۔ لیکن اس برقی طاقت اور مشین کے زمانے میں کوئی بھی آدمی اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر آپ کو پیٹنٹ ادویات مفردات یا مرکبات یا سامان متعلقہ دواسازی کی ضرورت ہو تو بازار میں جگہ جگہ بھٹکنے کی بجائے سیدھے ہمارے ہاں تشریف لائیں اپنے کرم فرماؤں کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانا ہم اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے ہیں!

نرائن داس بھگوان داس

تھوک دوافروش

چاندنی چوک دہلی ——— فون ۵۳۸۴

۶۰ دی مال ——— شملہ

وہ انہیں خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ بغل کے کمرے سے نجمی کے گنگنانے کی دلگداز آواز آنے لگی ؎

راتوں کو تصوّر اُن کا ہے اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے

دلربا کی بے قراری اور بڑھ گئی اور دل مسوس کر رونے لگی لیکن غریب کیا کر سکتی تھی۔ حیا کی دیوار آڑے تھی۔ گنگنانے کی آواز آہستہ آہستہ کمرے کی خاموش فضا میں گم ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت بجلی کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گئی اور ایک گہری الجھن میں کھو گئی ——— محبت اُسے جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی۔ "دلربا کیوں ہچکچاتی ہے جا، بارگاہِ حُسن میں اپنا سرِ نیاز خم کر دے"!

پھر دل کہتا —— "پگلی تیرا سر تو نہیں پھر گیا، تو کس بھلاوے میں مُبتلا ہے۔ شباب تیری بڑھی محبت کو ٹھوکروں پر اُڑا دے گا"!

محبت کہتی "دلربا کیوں پس و پیش کرتی ہے۔ اپنے ارادوں کو متزلزل نہ ہونے دے، جا آگے قدم بڑھا"!

غیرت کے لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ ناچنے لگی۔

وہ ایک دم عالمِ خیال سے چونک اُٹھی۔ جیسے کسی نے سوتے میں اُس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کی چھینٹیں مار دیں۔ وہ ہمت کر کے پلنگ پر سے اُٹھی اور آہستہ آہستہ نجمی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نجمی نیند کی آغوش میں بے خبر سو رہا تھا۔ دلربا اُس کے سرہانے بیٹھ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ آنسو کے قطرے نجمی کے چہرے پر جیسے ہی گرے، وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ سامنے دلربا سراپا محبت بنی آنسو بہا رہی تھی۔ وہ ڈر گیا اور متعجب ہو کر پوچھا۔ "کیوں رو رہی ہیں دلربا آپا، کیا ہوا آپ کو؟"

نجمی بھانپ چکا تھا کہ دلربا اپنا دل دے بیٹھی ہے۔ لیکن اُسے وقت کی نزاکت کا احساس تھا۔ اُس نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "دلربا آپا، آپ میری ماں کے برابر ہیں، کہیے میں آپ کی ہر ممکن خدمت کرنے کو تیار ہوں"!

دلربا پر بجلی سی گر پڑی۔ مایوس ہو کر اُس نے جھک کر پلنگ سے سر ٹیک دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے کوئی سرگوشی میں کہہ رہا ہے —— "دلربا، جب آفتاب کا رات میں نکلنا ناممکن ہے، تو اس بڑھاپے میں جوانی کے خواب کیسے؟ اُس کا دل ٹوٹ سا گیا، جیسے اندھیری محفل میں لڑکھڑاتے ہوئے شرابی کی ٹھوکر سے ساغرِ بلوریں چکنا چور ہو جائے۔

دلربا کی اس رحم طلب حالت پر نجمی کا بھی دل بھر آیا، کیونکہ وہ بھی محبت کی قدر کرتا تھا۔ اُس کے دل میں جانفزا کی محبت پرورش پا رہی تھی۔ وہ بھی رونے لگا۔

"تم کیوں روتے ہو نجمی؟ میں تو رونے ہی کے لئے پیدا کی گئی ہوں"!

دلربا بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

نجمی سسکیاں لیتے ہوئے بولا "اگر آپ نے وعدہ کیا تو میں عرض کروں"!

"کہو، ضرور کہو نجمی، میں تمہارے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگانے کو تیار ہوں" دلربا نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"دلربا آپا، مجھے جانفزا سے محبت ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں" نجمی نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

"ہاں ———! دلربا کے دیدے ایک دم پھیل گئے، اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، جیسے کسی نجومی نے کہہ دیا ہو کہ ستاروں کے حساب سے آج زلزلہ ضرور ہوگا۔

اب اس کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں چلی گئی، اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر مدّھم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ آنسوؤں کی دھاروں سے پاؤڈر، کریم سب دھل چکا تھا، اور چہرے کی بدنما جھرّیاں اُس کے بڑھاپے کی غمّازی کر رہی تھیں۔ وہ ایک چیخ مار کر پلنگ پر گر پڑی۔

محبت کی ناکامی بھی کس قدر دلفگار اور جانسوز ہوتی ہے۔

دلربا کی جو اس وقت کیفیت تھی، شاید قدرت بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ اُس کی زندگی کے تمام کیف زا لمحات بھیانک خوابوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اُس کی شکست خوردہ امیدیں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ اُس کا شیریں تبسم اور توبہ شکن ادائیں اب دم توڑ رہی تھیں۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اُس کے سازِ دل کے تاروں کو جھنجھوڑ ڈالا ہو اور ان گنت ادھورے ننھے مبہم سُروں میں تڑپ کر اداس فضاؤں میں بکھر گئے ہوں۔

اتوار کا دن تھا۔ غمناک اور اُداس دن —— ٹھیک دلربا کی آنکھوں کی طرح۔ عالمِ پریشانی میں نہ معلوم اُس نے کیا سوچا۔ عصری ناشتے کے بعد فوراً تانگے والے کو بلوایا اور نوکرانی کے ساتھ

مخصوص نسوانی ادا سے کہا۔ "اری او جانفزا! ذرا خادم سے کہہ دے دکان سے دہی لائے گی۔" یہ کہہ کر وہ جھٹ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جانفزا منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی لائی۔ نجمی نے اُسے کچھ اس انداز سے دیکھا کہ وہ شرم سے پسینہ میں شرابور ہوگئی اور لوٹا ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا اور سارا پانی چھلک کر نجمی کی پینٹ پر جا پڑا۔

"یہ کیا، تم ڈر گئیں سا نفزا مجھ سے ۔۔۔؟" ہاں، ہو سکتا ہے، دلربا آپا نے تم سے مردوں کی جی کھول کر شکائتیں کی ہوں گی۔ خیر میں بھی ردِّ عمل کے لئے تیار رہوں؟"

جانفزا کا گورا چہرہ فرطِ حیا سے انار کے دانوں کی طرح سُرخ ہو گیا اور وہ جھپٹ کر اندر چلی گئی۔

~~~~~~~~ ※ ~~~~~~~~

نجمی علی گڑھ کالج میں سائنس کا پروفیسر تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں وہ تفریح کی غرض سے ڈھاکہ چلا آیا تھا۔ پھر دلربا کو بھی دیکھے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ جب اُس نے جانفزا جیسی دلکش اور رُوح پرور لڑکی کو دیکھا تو اُس کا ارادہ جلد واپسی سے منتقل ہوگیا اور اُس نے ڈھاکہ ہی میں پوری چھٹیاں گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسے فطرتاً حسین لڑکیاں بہت بھلی لگتی تھیں اور وہ اُن سے پہروں دل بہلاتا رہتا۔ وہ جانفزا سے بھی ایسی ہی باتیں کرتا۔ جانفزا سے زیادہ دلربا کو نجمی کی میٹھی میٹھی باتوں میں لطف آتا تھا۔ اُس نے ہسپتال سے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی بھی منظور کرائی۔ جانفزا حیران تھی کہ دلربا آپا نے اتنی طویل رُخصت کیسے لے لی، دلیسے تو انہیں اتوار کی چھٹی بھی ناگوار گذرتی تھی۔

نجمی جب تک گھر میں رہتا، دلربا اُس کے پاس ہی بیٹھی باتیں کرتی رہتی اور نجمی بھی چٹخارے لے لے کر اُس کے حُسن و جمال کی خوب تعریفیں کیا کرتا۔ کبھی کہتا۔ "دلربا آپا آپ جتنی حسین ہیں اتنی ہی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ ایسی قابل لڑکیاں دُنیا میں بہت کم ہوں گی۔" یہ سُن کر دلربا کی رگوں میں مسرت کی لہریں دوڑ جاتیں اور وہ اپنے بڑھاپے کو یکسر بھول جاتی۔ رفتہ رفتہ نجمی سے اُس کی دلچسپی اور ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اُس نے دل ہی دل میں نجمی کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنا لیا اور اُس کی ہر طرح دلجوئی کرتی۔

اب دلربا، جانفزا کو نجمی سے پردہ کرنے پر مجبور کرتی اور اُسے اچھے کپڑے پہننے سے روکا کرتی۔ کبھی کبھی اُس پر خفا بھی ہو جاتی کہ جانفزا آجکل تو نوکرانی کا ہاتھ نہیں بٹایا کرتی ہے، کھانے اچھے نہیں تیار ہوتے، تیرا دھیان کام پر نہیں رہتا اور ہر وقت نجمی کے پاس بیٹھی قصے کہانیاں سُنتی رہتی ہے ۔۔۔۔۔ لیکن وہ خود نفیس کپڑے زیب تن کرتی، انگریزی فیشن سے بال سنوارتی، چہرے کی بدنما جھریاں سنو، پاؤڈر سے چھپانے کی کوشش کرتی اور دن بھر میں تین وقت لباس تبدیل کرتی۔

جانفزا دلربا کی اس تبدیلی پر حیران تھی اور پہروں سوچتی کہ اس مرجھائے ہوئے پھول میں شادابی کیسے آ رہی ہے؟ اِدھر نجمی اپنی فتحیابی پر مغرور تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ دلربا آپا بہت جلد کسی نہ کسی سے شادی کر لیں گی۔

جب دلربا سج دھج کر اپنے کمرے سے نکلتی تو نجمی چپکے سے کہتا۔ "دلربا آپا، اب تو آپ بالکل ملکہ معلوم ہوتی ہیں کاش آپ کسی کے دِل کی ملکہ بن جائیں!"

"ھش! بدتمیز کہیں کے۔" وہ ہنس دیتی، لیکن سوئے ہوئے جذبات انگڑائیاں لے کر جاگ اُٹھتے اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کائنات جوانی کے نشے میں جھوم رہی ہے۔

~~~~~~~~ ※ ~~~~~~~~

رات کا کوئی ایک بجا تھا۔ نجمی سینما دیکھ کر آیا۔ کپڑے تبدیل کر کے نایم قاسمی کا "آنچل" لے کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ غیرارادی طور پر ورق گردانی کر رہا تھا کہ دفعتاً اُسے ملحقہ کمرے سے بھاری بھاری سانسوں کی مسلسل آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ وہ گھبرا سا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد پلنگ پر کروٹیں بدلنے کی ناہموار آواز آنے لگی۔ اُس نے سمجھا شاید جانفزا جاگتی ہوگی۔ پھر اتنی رات گئے کون ہوگا۔ اُس کا دل خود بخود گداز ہونے لگا، اور شبابی جذبات چٹکیاں لینے لگے۔ لیکن وہاں تو معاملہ کچھ اور تھا۔

بیچاری دلربا بے قراری میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جیسے نیند اُس کی آنکھوں سے ڈھل چکی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اُس کے بستر پر کانٹے بچھا دیئے ہیں۔ دلربا جو کسی وقت مردوں کے سائے سے نفرت کرتی تھی، وہ آج نجمی کے قدموں پر آنکھیں بچھا رہی تھی۔ اُس کے دماغ میں عجیب وسوسے سر سرا رہے تھے۔ "نجمی اگر چلا جائے تو میں کیسے دیکھ کر جیوں گی۔ کاش، وہ میرے پاس ہی رہ جاتا۔ میں اُس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں"۔

ڈنیا کے نامور ڈاکٹر اور سائنسدان یہ حقیقت تسلیم کر چکے ہیں کہ ریڈیم ٹانک پلز
مردانہ کمزوری اور ناطاقتی کا بہترین علاج ہیں۔ ریڈیم ٹانک پلز جسم میں
نیا خون پیدا کر کے زبردست مردانہ طاقت بڑھاتی ہیں۔ کھوئی ہوئی جوانی
کو واپس لانے کے لئے ریڈیم ٹانک پلز دُنیا کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں

اس مفید دوائی کو لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں
قیمت فی شیشی مکمل خوراک چھ روپے

بیرونی نقائص اور کمزوری دُور کرنے کے لئے ریڈیم مساج نامی طلا استعمال
کریں۔ یہ طلا دُنیا کے تمام طلاؤں سے بہترین تسلیم کیا جاتا ہے قیمت فی شیشی تین روپے۔

تندرست نوجوان ان دواؤں کو استعمال کر کے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں
چوٹی کے ڈاکٹر ریڈیم ٹانک پلز اور ریڈیم مساج کے استعمال کی زبردست سفارش کرتے ہیں

انڈیا آفس

ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ دھلی

مُسکرانے کی کوشش کر رہا ہے - ایک ایسی مُسکراہٹ جس میں ایک زخمی دل کی چیخ گونج رہی تھی -

"یہاں آؤ میری کیتھی!" اُس نے کہا "میرے ہاتھ اب کافی اچھے ہو گئے ہیں، لیکن میرے بازو بالکل ٹھیک ہیں۔" اُس نے مجھے چوم لیا "میری ننھی ساحرہ! تم تو ایک طرح سے ہیروئین بن گئی ہو - تمہارا نام اخباروں کے پہلے صفحوں پر موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا!"

"اب اس بارے میں کوئی بات نہ کرو۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا - "آؤ ہم مستقبل کے بارے میں سوچیں - اور اب میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی - میری تنخواہ سے میرے پاس کافی روپیہ بچا ہوا ہے - اُس سے ہم ہیری کے لئے دکان دوبارہ تعمیر کرا دیں گے۔"

جانی مسکرایا - اُس کی آنکھوں میں وہی چمک پیدا ہو گئی - اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے میں اُس سے لپٹ گئی "اب ہم بہت جلد شادی کر لیں گے، میری روح! پھر میں تمہاری گھنی زلفوں کی چھاؤں میں زندگی گزار دوں گا - میں تمہاری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں گا - میری دلنواز....."

میں اُس سے لپٹ گئی - اور اُس نے اپنے ہونٹ میرے لبوں سے پیوست کر دیئے میں بے خود ہو گئی ---- کھو گئی ---- مدہوش ہو گئی!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں، اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں - بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں - (ایڈیٹر)

یاد

از

جناب مسٹر نعیم بھٹی ایڈیٹر "مستقبل"

کچھ بھولی بسری یادوں سے آنکھوں میں تلاطم برپا ہے
اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے، اک درد جگر میں ہوتا ہے
پھر لاکھ شرارے ماضی کے خاکسترِ دل میں جاگ اُٹھے
پھر زندہ ہوئی وہ شہنائی، پھر درد بھرے وہ راگ اُٹھے
پھر ذہن پہ میرے بننے لگیں وہ ماضی کی تصویریں سی
پہنائیں تصوّر نے مجھ کو پھر اُلفت کی زنجیریں سی
پھر رہ رہ کر یاد آتی ہیں رنگین ملاقاتیں مجھ کو!
پھر قلب و جگر کو تڑپاتی ہیں وہ کیف بھری راتیں مجھ کو!
باتیں کرتے کرتے اپنا مستی کی فضا میں کھو جانا
وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی مدہوش سا اپنا ہو جانا
وہ اُن کے وداعی بوسوں کی ہونٹوں پہ حلاوت باقی ہے
میں ترکِ محبت کر بھی چکا اک یادِ محبت باقی ہے
میں کیسے بھلا دوں تو ہی بتا آغوش کشائی کے منظر
پھرتے ہیں نگاہوں میں اب تک وہ شامِ جدائی کے منظر
ہم باہوں میں باہیں ڈال کے جب مصروفِ نیاز و راز رہے
کیا خوب تھے وہ ایّامِ حسیں میں سوز رہا تم ساز رہے
اب بیٹھے بٹھائے آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگ جاتی ہے
اور آنکھیں بھر آتی ہیں مری جب یاد تمہاری آتی ہے
سائے میں گھنیری زلفوں کے پھر عارضِ روشن یاد آئے
پھر گیسوئے مشکیں آنکھوں پہ برکھا بن کر لہرائے
پھر تیرا تبسم یاد آیا پھر برقِ درخشاں لہرائی
پھر تیرے لباسِ رنگیں کی عطر آلودہ خوشبو آئی

اُس مست جوانی کی باتیں پھر آنے لگی ہیں یاد مجھے
رنگین ادائیں رہ رہ کر پھر کرتی ہیں برباد مجھے

اور ایماندار ہے وہ ۔ وہ انتہائی ذمہ دار اور نیک نیت ہے ۔ اُس کا دل شبنم کی طرح پاکیزہ اور بے داغ ہے ۔ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا ۔ خدا اُس کا نگہبان ہے ۔

میں ٹیکسی کر کے سیدھی پولیس سٹیشن پہنچی ، اور تمام کہانی کہہ سُنائی ۔ کپتان نے دو ایک جگہ ٹیلی فون کیا ۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی سادہ کپڑوں میں اندر آئے ۔ انہوں نے مجھ سے کچھ سوالات کئے ۔ میں نے انہیں تمام واردات پھر سُنائی ۔ کپتان نے انہیں حکم دیا کہ وہ جا کر تمام معاملے کی تفتیش کریں ۔ وہ دونوں جانے لگے ، لیکن اُن میں سے ایک واپس مڑا اور میرے پاس آ کر کہنے لگا ۔ "آپ ہمارے آنے تک یہیں تشریف رکھیں ۔ شاید ہمیں چند سوالات کے جواب کے لئے آپ کی ضرورت پڑے ۔"

میرا خیال تھا کہ یہاں سے میں سیدھی جانی کے پاس جا کر اُسے خطرے سے آگاہ کروں گی ۔ لیکن اب ذہن ایک طرح سے گرفتار ہو گئی تھی ۔ کہیں نہ جا سکتی تھی ۔ چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں بیاں سانپ بننے لگے ۔

تھوڑی دیر بعد کپتان آیا ۔ "مجرم گرفتار ہو چکا ہے ۔ اُسے بلڈنگ سے باہر نکلتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ اُس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے اور سب سے مزے دار بات یہ ہے کہ ایک فائل سے بہت سے ناموں کی فہرست برآمد ہوئی ہے ، لیکن شہادت کا بہت سا حصہ آگ سے جل کر تباہ ہو گیا ہے ۔"

"آگ ۔۔۔ کیسی آگ ۔۔۔ ؟" میں چلائی ۔

"اُس نے تہ خانے میں جوتوں کے سٹاک کو آگ لگا دی ۔ تمام عمارت جل کر راکھ ہو گئی ہے ۔"

"کسی کے چوٹ تو نہیں آئی ؟" میری آواز ڈر کے باعث لرز رہی تھی ۔

"خوش قسمتی سے سب بچ گئے ہیں ، لیکن وہ نوجوان جس کی تہ خانہ کے اوپر دکان تھی ، اُس کے ہاتھ بہت بُری طرح جھلس گئے ہیں ۔ اور اب وہ ہسپتال ہے ، لیکن اُس نے عورت اور بچوں کو بچا لیا ہے ۔"

ہنری کی دکان اور اُس کا مکان سپنوں کے سنہرے شیش محل کی طرح ختم ہو گئے ۔ جانی کا کیا حال ہوا ہو گا ؟ جس کی زندگی ہی بھائی کی بھلائی کے لئے وقف تھی ۔ مکان کے جلنے کا اُس کے دل پر کیا اثر ہوا ہو گا ؟ میرا دل رونے لگا ۔ یہ سب کچھ میری حماقت ، بے وقوفی اور خود غرضی ہی کا نتیجہ تھا ۔

انہوں نے مجھے جانے دیا ۔ میں ہسپتال کی طرف بھاگی ۔ جانی سے ملنے کے لئے میرے پاؤں کو پر لگ گئے ۔ لیکن ۔۔۔ مجھے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی ۔

"اُسے سخت چوٹ آئی ہے ۔" نرس نے مجھے بتایا ۔ "تم اُس کے بھائی سے تو مل سکتی ہو ۔ وہ ملاقاتیوں کے کمرے میں ہے ۔ ہاں اگر جانی نے تم دونوں میں سے کسی سے ملنے کی خواہش کی تو تمہیں بلا لیا جائے گا ۔"

"اُس کا بھائی تو فوج میں ہے ۔" میں نے جواب دیا ۔

"وہ برخاست کر دیا گیا تھا ۔ وہ جب گھر پہنچا تو اُس کے مکان کی چھت گر رہی تھی ۔ بیچارے کو اس کا سخت صدمہ پہنچا ہے ۔۔۔۔ لو وہ خود ہی آ رہا ہے ۔" اور نرس چل دی ۔

ہنری آیا ۔ اُس کا چہرہ زرد تھا ۔ خوفناک حد تک زرد ۔ اُس کا ایک بازو بندھا ہوا تھا ۔ وہ گھوما اور اُس نے میری طرف دیکھا ۔ میں سمجھ گئی کہ وہ تمام کہانی سُن چکا ہے ۔

"میں گھر واپس آیا ۔" اُس نے کھلی آواز میں کہا ۔ "لیکن کس لئے ؟ تمہارے ہی باعث وہ تہ خانے میں رکھے گئے ۔ تم اور تمہاری حسین آرزوئیں ۔ تمہاری زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش ۔ خوبصورت کپڑوں کی تمنا ۔ زندگی کی آسائشوں کی خواہش ۔ میری بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ کس طرح تم دن رات جانی کے پیچھے پڑی رہیں کہ وہ یہ کام چھوڑ کر کوئی اچھا کام حاصل کرے ۔ اگر تم میں ذرا بھی شرافت ہے تو جانی کا خیال چھوڑ دو !"

"لیکن میں اُس سے محبت کرتی ہوں ۔ بے انتہا ، بے پایاں محبت ۔ پھر بھی میں یہ نہ سمجھ سکی کہ میں کیا کر رہی ہوں ۔ اور جب مجھے احساس ہوا تو میں نے اپنے آپ کو سُدھارنے کی کوشش کی ۔" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ۔

"ایک شخص اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کام کرے ، جبکہ وہ اپنے ملک کے لئے جنگ پر گیا ہو ؟ ایک شخص اس سے اچھا اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ ایماندارانہ زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے بھائی کے بیوی بچوں کی پرورش کرے ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری خواہشات نیک ہوں ، لیکن تم راستے سے بھٹک گئی تھیں ۔ پھر بھی تم نے بلیک مارکیٹ کرنے والوں کو گرفتار کروا کر ایک بڑا کام کیا ہے ۔"

مجھے بتایا گیا کہ جانی مجھ سے ملنا چاہتا ہے ۔ میں گئی ۔ وہ میری طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا ۔ ایک لمحہ تک میں نے محسوس کیا کہ وہ

بات نہ مانی۔ یکایک مجھے خیال آیا، دھنتری کی دکان کے نیچے ایک تہ خانہ خالی ہے۔ اس کے کرایہ سے انہیں کافی مالی مدد مل سکے گی۔

"مسٹر مکنز! مجھے ایک ایسی جگہ کا پتہ ہے۔ وہ ذرا راستے سے ایک طرف ہٹ کر ہے۔ لیکن وہ خشک اور صاف ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، اگر تم گاہکوں کا خیال رکھ سکو تو میں جا کر دیکھ آتا ہوں۔ اگر پسند آیا تو سامان بھی رکھوا آؤں گا۔ ذرا دیر ہو جائے گی۔ شاید یہ بہتر ہے کہ تم گاہکوں سے اچھی طرح نپٹ لو گی۔"

"کیوں نہیں۔ میں تمہیں ہر روز گاہکوں سے بات چیت کرتے دیکھتی ہوں۔ میں بخوبی سنبھال لوں گی۔ تم جا سکتے ہو۔" اور وہ کار میں بیٹھ کر تہ خانہ دیکھنے چلا گیا۔

اس کے جانے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر ایک گاہک آیا۔ یہ مسز ستارسن تھی۔ اس کا خاندان بہت بڑا ہے۔ خاندان کے کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اگلے انتخابات میں اس کا خاوند میئر کے عہدے کا امیدوار تھا۔

اس نے کہا "میری دو لڑکیاں ہیں، دونوں جڑواں ہیں" یہ کہا۔ "مجھے دو ایک جوڑے سوئٹر کے چاہئیں۔"

میں نے اسے تین نمونے دکھائے۔ اس نے تینوں پسند کر لئے۔ میں حیران تھی کہ یہ تینوں کیسے لے جائے گی۔ اس نے مجھے سو ڈالر کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "باقی رقم جمع کر دو اگر بچ دی جائے۔" میں نے اس سے جوتوں کے راشن کوپن مانگے۔ اس نے میری طرف سرد مہری سے دیکھا۔ پھر کھسیانی سی ہنسی ہنس دی اور شوروم سے باہر چلی گئی۔

تب مجھے پتہ چلا کہ اس دکان پر جوتوں کی بلیک مارکیٹ بھی ہوتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے ہاں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رہوں گی اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ مسکراتا ہوا آیا۔ "تہ خانہ مل گیا ہے۔ بہت اچھا صاف تہ خانہ ——— لیکن یہ کیا تم میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا دیکھ رہی ہو؟"

میں نے اسے تمام ماجرا سنا دیا۔

"تم بھی عجب بے وقوف لڑکی ہو۔ تم نے اس سے راشن کوپن کیوں مانگے؟ تم اتنے دنوں تک کیا کرتی رہیں یہاں؟"

"میں تو تمہیں بہت ایماندار سمجھتی رہی۔ میں ایماندار آدمیوں سے سروکار رکھتی ہوں، لیکن اب پتہ چلا کہ تم چور بازار کے تاجر ہو۔ میں اپنا کام چھوڑ کر جا رہی ہوں، اور سب سے پہلے پولیس میں تمہاری رپورٹ کروں گی۔"

میں دروازے کی طرف چل پڑی۔ وہ آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیتھی! بیوقوف مت بنو۔ تم ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ہو۔ تمہارے دل میں ارمان مچلتے ہیں۔ تمہیں زندگی کی خوشیاں حاصل کرنی ہیں۔ تمہیں ابھی اپنی کافر جوانی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ میں یہ سب کچھ تمہیں مہیا کر سکتا ہوں، میری جان!" اس نے مجھے زبردستی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ "مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ بے پایاں عشق ہے! جب میں نے تمہیں پہلی ہی بار دیکھا تو میں اسی لمحہ تمہاری الفت کے دام میں گرفتار ہو گیا۔ میں اپنے دل میں تمہارے لئے محبت کی کسک محسوس کرنے لگا۔ میں تمہارے اوپر مرمٹا۔ میری پیاری کیتھرین! میری شریکِ حیات بن جاؤ۔ میں زندگی کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں پر نچھاور کر دوں گا۔ میں تمہارے لئے فلک کے ستارے توڑ لاؤں گا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آج سے بلیک مارکیٹ بند کر دوں گا۔" اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور میرے لبوں پر اپنے آتشیں ہونٹ رکھ دیئے۔ میں نے اپنا تمام زور لگا کر اپنے آپ کو اس کے جسم سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ لمبے لمبے ناخنوں سے اس کا چہرا نوچ ڈالا اور آخر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں دروازے کی طرف بھاگی، لیکن وہ لپک کر دروازہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ہر شخص بلیک مارکیٹ میں جوتے خریدتا ہے۔ پھر بھی یاد رکھو۔ جتنی دیر تک تم یہاں پولیس لاؤ گی، اتنی دیر میں میں سب انتظام کر چکا ہوں گا۔ پولیس کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ میں ہر طرح کے خطرے کے لئے تیار ہوں۔ اور پھر تہ خانہ جوتوں سے بھرا پڑا ہے میں جانی کو گرفتار کروا دوں گا کہ یہ مال اس کا ہے۔ پولیس اسے گرفتار کر لے گی۔ تم اس سے محبت کرتی ہو نا؟ میری بجائے وہ جیل میں جائے گا۔ جانی، تمہارا عاشق۔ ہا ہا ہا۔"

اس نے میرا راستہ چھوڑ دیا۔ دو ایک گاہک دکان میں آ گئے تھے۔ میں ایک لمحہ کے لئے ششدر رہ گئی۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ جانی اس طرح خواہ مخواہ پھنس جائے گا۔ میں نے وہاں ٹھہرنا اپنی ذلت سمجھی اور وہاں سے چلی آئی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو، میں پولیس کو خبر کر دوں گی۔ چاہے مجھے بھی کیوں نہ گرفتار ہونا پڑے۔ دنیا جانتی ہے کہ جانی بہت ایماندار شخص ہے۔ اس نے اپنے بھائی کے لئے میری محبت کی پروا نہ کی۔ کتنا وفادار

لڑکی نظر آئی - وہ جینی وائس تھی - لڑکپن میں ہم دونوں اُسے اچھی طرح جانتے
تھے - وہ بھی جانی سے محبت کرتی تھی - اور اُس نے جانی کو مجھ سے بدظن کرنے
کے لئے ہر ممکن کوشش کی - جب میں اندر داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کر اُس
کے چہرے کی مسکراہٹ اِس طرح غائب ہوگئی، جیسے سورج کی کرنوں کو دیکھ
کر دھند کے بادل -

"دیکھو کون آرہا ہے۔" جینی نے کہا۔ میں اُس وقت زرد رنگ
کا نیا سوٹ اور سرخ سینڈلوں کا جوڑا پہنے ہوئے تھی - جسے میں نے
پال بکر سے نہایت سستے داموں خریدا تھا - اُس کا خیال تھا کہ یہ جوڑا
اُس کے گاہکوں کے لئے بہت گھٹیا ہے - اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اِس
جوڑے کے لئے راشن کوپن کی ضرورت ہے۔

مجھے دیکھتے ہی جانی کی آنکھیں چمک اٹھیں "تم اندھیرے دل کی
روشنی ہو میری روح!" وہ چلایا - وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا -

"جانی، میں جا رہی ہوں - میں کل صبح اپنا جوڑا لینے آؤں گی" جینی
نے کہا -

جانی نے ہاتھ لہرا کر اُسے الوداع کہی اور پھر میری طرف متوجہ ہوا -

"میری روح! میرے سامنے کھڑی ہو جاؤ - میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا
چاہتا ہوں - تم کتنی خوبصورت ہو - تمہاری آنکھوں سے زندگی کے شرارے
پھوٹ رہے ہیں - تمہاری چاندنی میں سموئی ہوئی آواز کانوں کی راہ سے
میرے دل میں اُتر رہی ہے - تم کتنی من موہنی ہو - میں اتنے روز تک تمہاری
صحبت کے لئے ترستا رہا"

"میرے پیارے!" میں نے اپنے بازو اُس کی طرف پھیلا دیئے، اور
اُس سے لپٹ گئی - اُس نے میرے ہونٹ چوم لئے - اُس کی آنکھوں میں درد
جھلک رہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ میری غیر موجودگی کو واقعی اُس نے
نہایت شدت سے محسوس کیا تھا -

"پیارے جانی! اپنی طرح تمہیں بھی میں اچھے اچھے کپڑوں میں ملبوس
دیکھنا چاہتی ہوں" اُس کے ہاتھ نیچے لٹک گئے اور اُس کی آنکھوں میں پھر
غم کی جھلک دکھائی دی -

"کیتھی! میں ایسا نہیں کر سکتا - مولی کو پچھلے تین ماہ سے ہرنی کے
بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا - وہ نہایت افسردہ اور فکرمند ہے - میں اُسے
بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا - اُس کا میرے بغیر گزارہ نہیں چل سکتا - اور ---
میں بہت شرمندہ ہوں گا - میرے جذبات کو ٹھیس لگی - کوئی بھی -

لڑکی یہ پسند نہیں کرتی کہ وہ دو زانو ہو کر کسی آدمی سے شادی کی بھیک
مانگے، چاہے وہ اُس سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو، لیکن ہو سکتا ہے
وہ مجھ سے محبت ہی نہ کرتا ہو اور مجھ سے پیچھا چھڑانے کا کوئی بہانہ
تلاش کر رہا ہو -

ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے، جانی!" میں
چلائی - شاید تم جینی کی طرح کی کوئی لڑکی پسند کرتے ہو" میں نے زہر میں
بجھے ہوئے لہجے میں کہا -

اُس نے کوئی جواب نہ دیا - اُس کے سکوت نے مجھے اور بھی بھڑکا دیا -

"میں اپنی محبت کے کشکول میں تم سے شادی کی بھیک مانگ رہی
ہوں، منت کر رہی ہوں" میں چلائی "مگر تم مجھے کھو دینا چاہتے ہو، تو
تمہیں میرا کہنا ماننا پڑے گا - میرا خیال ہے جانی! تم اپنی زندگی کی سب سے
بڑی غلطی کر رہے ہو - ایک دن آئے گا کہ تم افسوس سے ہاتھ ملو گے"

میں دروازے کی طرف چل پڑی - میرا خیال تھا کہ وہ آئے گا اور
میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہے گا کہ اُسے جینی جیسی لڑکیوں سے کوئی واسطہ نہیں
اور کہے گا کہ اُسے مجھ سے والہانہ محبت ہے اور پھر --- اور پھر وہ
میری گردن میں اپنے بازو حمائل کر دے گا - میرے ہونٹوں سے اپنے
ہونٹ پیوست کر دے گا - اور --- اور ---

لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں اور اُس نے مجھے جانے دیا -
شاید میرا خیال درست تھا کہ جانی کو مجھ سے محبت نہیں - شاید میرے دیر
تک دور رہنے کے باعث جینی نے اُس کے دل میں گھر کر لیا ہے - جینی
نے کبھی اُس کے کام میں نقص نہ نکالا تھا - وہ اُسے بہت اچھا اور قیمتی
انسان سمجھتی تھی - میں بھی اُسے ایسا ہی خیال کرتی تھی - میں جانتی تھی کہ وہ
نہایت ہی اچھا آدمی ہے اور اگر میں اُسے حاصل نہ کر سکی تو میری زندگی کی
تمام رنگینی، تمام حسن، تمام جاذبیت ختم ہو جائے گی -

پال شو روم میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا - وہ مجھ سے اخبار
میں شائع کرانے کے لئے اشتہار کا ایک مضمون ٹائپ کروانا چاہتا تھا -

"میں کوئی سٹور روم یا تہہ خانہ کرائے پر لینا چاہتا ہوں - کیتھی:
میرے پاس کچھ جوتوں کے ڈبے ہیں، میں انہیں رکھنا چاہتا ہوں" اُس
نے کہا "تم لکھ دو کہ اس کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا"

میں نے ٹائپ کرنا شروع کر دیا - "ضرورت ہے ایک سٹور روم

رہی ہے۔

"جانی! میں نے شو سٹور والی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ وہ ــــ اُس کے مالک کا آوارہ چھوکرا ــــ کمینہ ــــ مجھے اِس طرح دیکھتا ہے، جیسے میں کوئی کھانے کی چیز ہوں ــــ پیسٹری ــــ چاکلیٹ ــــ اُس نے کئی مرتبہ مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی، لیکن میں نے ہر بار نہایت درشتی سے علیحدہ کر دیا۔ اب مجھے ایک اور جگہ نہایت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ ۵۰ ڈالر فی ہفتہ اور پھر اوور ٹائم اس کے علاوہ۔ وہ بھی ایک شو سٹور کا مالک ہے۔ وہاں مجھے صرف گاہکوں کو جوتوں کے ماڈل دکھانے ہوں گے۔ بس اور کوئی کام نہیں۔"

"کتنی دُور ہوگی وہ جگہ؟" ہنری نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جگہ تو یہاں سے کافی دُور ہے۔ اب میں دوپہر کو تمہارے ساتھ کھانا کھانے بھی نہ آسکوں گی۔ مجھے افسوس ہے، لیکن ــــ"

جانی کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ اُس کے چہرے پر حزن و ملال اور تفکرات کے سائے پھیلنے لگے۔ اُس کے ہونٹ سِل گئے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اگر تمہیں پسند نہیں تو میں یہ ملازمت چھوڑ دیتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں، میں نے کب کہا۔ تنخواہ تو معقول ہے۔"

"ہاں، پھر کام بھی باعزت ہے۔ پال ہکنز کی دُکان پر نہایت امیر اور باوقار عورتیں آتی ہیں۔ امیر لڑکیاں، فلم ایکٹرسیں، نامور سیاستدانوں کی بیویاں وہ مصروفیت کے باعث دن کے وقت نہیں آسکتیں۔ اِس لئے شام کے وقت اور اوور ٹائم سے کافی معاوضہ مل جایا کرے گا۔ مسٹر ہکنز بہت اچھا شخص ہے اور اُس کا شو روم سٹوڈیو کی طرح خوبصورت ہے۔ جانی، میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اس قسم کا کوئی کام کرو۔ وہ بہت صاف ستھرا اور دلفریب ہے۔ اور پھر نہایت اچھے اچھے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔"

"کیتھی! میری جگہ یہی ہے لیکن اگر تم یہی کچھ چاہتی ہو تو بہتر ہے ورنہ تمہاری مرضی۔ تم جانتی ہو کہ میرے پاس محبت کے سوا اور کچھ بھینٹ کرنے کے لئے نہیں ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں تو میں مجبور ہوں۔"

"بہت اچھا جانی! نہ جانے اب کب ملاقات ہوگی۔" میں نے افسردگی سے کہا، اور دروازے کی طرف مڑی۔ یکایک وہ میری طرف لپک کر آیا، مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔ "کیتھی! مجھے اُمید ہے کہ تم کوئی ایسی بات نہ کروگی جس سے ہماری محبت میں فرق پڑ جائے۔ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔ کاش، میں بتا سکتا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے ــــ محبت ہی نہیں عشق ہے، لیکن مجھے ہنری کے آنے تک انتظار کرنا پڑے گا۔" اُس نے دِل شکستہ ہو کر کہا۔

"بہت اچھا جانی! اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو اسی طرح سہی۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "میں شاید جلد ہی تمہیں ملنے آؤں گی" ــــ اور میں چلی آئی۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اتنی دُور کام کرنے کی اجازت نہ دے گا اور مجھے کہے گا کہ میں تمہاری خواہش کے مطابق اچھا کام تلاش کروں گا۔ اور اِس طرح ہماری شادی جلد ہو جاتی، لیکن اُس نے مجھے ایسا نہ کہا اور مجھے جانے دیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر اُمڈ آیا۔

"وہ مجھے یہ کام زیادہ دنوں تک نہ کرنے دے گا۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اُسے کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑے گا۔ میں زیادہ دنوں تک اُس سے جُدا نہیں رہ سکتی۔" پھر بھی مجھے اِس بارے میں پورا یقین نہ تھا۔

تعلیم کے آغاز ہی میں میں جانی سے منسوب کر دی گئی تھی۔ اسی باعث میں کالج میں داخل نہ ہوسکی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ جانی فوج میں بھرتی نہیں کیا گیا۔ تو میں نے خیال کیا کہ اب ہماری شادی بہت جلد ہو جائے گی۔ لیکن انہیں دنوں میرے والد کی موت ہوگئی، اور مجھے اپنا پیٹ پالنے کے لئے شو سٹور میں نوکری کرنی پڑی۔ لیکن یہاں معقول آمدنی نہیں تھی۔ اور جب میں نے یہ سنا کہ جانی غیر معین عرصہ کے لئے اپنے بھائی کی بوٹوں کی دُکان میں کام شروع کرنے والا ہے تو میری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اور ایک مبہم سے ڈر کے احساس سے میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ لیکن میں نے اس وقت خیال کیا تھا کہ جانی میری بات رد نہیں کرے گا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتا ہے۔ اُس کی محبت ستاروں کی طرح اچھوتی اور پاک ہے۔ لیکن ــــ میں جانی کو نہ سمجھ سکی۔

جانی کے بغیر زندگی اجیرن تھی۔ اُسے ملے ہوئے مجھے دو ہفتے ہوگئے تھے۔ ایک صبح مجھے یکایک اُس سے ملنے کا خیال آیا۔ میں نے سوچا۔ ایک بار پھر جانی کو کہہ دیکھوں۔ شاید وہ مان جائے۔ اُس کے بغیر مجھے زندگی سنسان بھیانک رات نظر آرہی تھی۔

لیکن جب میں جانی کی دُکان میں داخل ہوئی تو مجھے وہاں ایک اور

زُلفوں کی چھاؤں میں

ایک انگریزی شاہکار

از

جناب مانک ٹالہ بی۔ اے

"لیکن جانی! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اِس موسم گرما میں بھی ہماری اور تمہاری شادی نہ ہو سکے گی"۔ میں چلائی۔

جانی کنے بچے کا بوسیدہ بُوٹ نہایت جانفشانی اور محنت سے مرمت کر کے سُکھانے کے لئے ایک طرف رکھ دیا۔ اُس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ سنہرے بالوں کی ایک سرکش لٹ اُس کی پیشانی کا بوسہ لے رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹایا اور اپنی مست آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میں بے خود ہو گئی، مدہوش!

"نہیں میری رُوح! یہ بات نہیں، میں تو خود چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے شادی ہو جائے اور میں تمہارے حُسن کی رعنائیوں میں کھو جاؤں، تمہارے گدازبازو، سینے کے کھِلے ہوئے شگفتہ کنول، تمہارے پنکھڑیوں کی طرح گُلابی ہونٹ، تمہارے جوانی کی گرمی سے دہکتے ہوئے خوب صورت رخسار، ہرنی کی طرح مست آنکھیں اور سورج کی کرنوں جیسے سنہری گیسو۔ کیتھی! جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو بے تاب ہو جاتا ہوں۔ میں تم میں جذب ہو جانا چاہتا ہوں، میں تمہارے حُسن کی گرمی میں جل کر راکھ ہو جانا چاہتا ہوں"۔ اُس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ میرے لبوں پر رکھ دیئے۔ میں نے بھی اپنے بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اور پھر میں نے اپنے آپ کو آسمان کی بلندیوں پر تیرتا ہوا محسوس کیا۔ "لیکن" اُس نے اپنے آپ کو مجھ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "میری کیتھرین! میں مجبور ہوں، بے بس ہوں، ہمیں ہنری کے جنگ سے واپس آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ہنری نے مجھے اپنی دکان دی ہے۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُس کی بیوی اور بچوں کی پرورش کروں گا۔ اس آمدنی میں بہت مشکل سے گذارا ہوتا ہے" اُس کی آنکھوں کی چمک کسی بیوہ کے دِل کی طرح بُجھ گئی۔

میں نے ایک گہرا سانس کھینچا تاکہ بات کرتے وقت میری آواز میں کپکپی پیدا نہ ہو۔ "لیکن میرے دل کی دھڑکن! اگر تمہیں فوج میں نوکری مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر تمہارے گھٹنے میں چوٹ نہ آئی ہوتی، تو آج تم ایک اچھے عہدے پر پہنچے ہوتے اور وہ مکان اس وقت ہماری ملکیت ہوتا۔ اُس میں ہم نیا فرنیچر لاتے۔ لیکن پیارے! میں یہ سب کچھ اپنے لئے نہیں کہہ رہی۔ مجھے اِن چیزوں کی بالکل خواہش نہیں۔ مجھے تو ان ننھے منے بچوں کا خیال ہے جو ہماری شادی کے بعد آتے۔ میں اُنہیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ جانی! کیا تم برداشت کر سکتے کہ وہ ہم سے خوبصورت فراکوں کا تقاضا کرتے اور ہم میں اتنی استطاعت نہ ہوتی کہ ہم اُنہیں رنگ برنگے خوبصورت فراک خرید دیتے۔ لیکن پیارے! یہ اب کبھی ہو سکتا ہے۔ آخر تم اپنے بھائی کی پُرانی، بوسیدہ دُکان کیوں نہیں چھوڑتے؟ تمہیں اس سے بہتر کام مِل سکتے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ اس سے چمٹے ہوئے ہو"۔ ——

"کیتھی! میری جان! صبر کرو۔ ڈارلنگ انتظار کرو۔ بہت جلد انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں اور ایک حسین رات اپنے دامن میں سرور و نوشیاں سمیٹے آئے گی۔ پھر —— پھر ——"

"انتظار کرو، انتظار کرو۔ آخر کب تک انتظار کروں؟ جب میرے رخساروں کے دہکتے انگارے راکھ ہو جائیں گے۔ جب میرے جوان سینے میں مچلتے ہوئے ارمان —— تڑپتی ہوئی آرزوئیں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیں گی اور تمہارے سنہری بال مدقوق مریض کے چہرے کی طرح زرد ہو جائیں گے؟"

میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے، لیکن اُس کا چہرہ گہرے سمندر کی طرح پُرسکون تھا۔ وہ میری آنکھوں میں عجیب انداز سے جھانک رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں تیروں کی طرح میرے جگر میں اتر گئیں۔ میں بے چین ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دل کے زخموں کو کوئی کرید رہا ہے۔ میں اُٹھی اور جانی سے بے اختیار لپٹ کر سسکنے لگی۔ وہ میرے بالوں پر آہستہ آہستہ نہایت محبت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ اُس نے میرے آنسو پونچھ ڈالے اور وہ بھنورے کی طرح میرے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح شگفتہ ہونٹوں کا رس چوسنے لگا۔ میں نے محبت کی انتہائی شدت سے اپنے لب بھینچ —— اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری رُوح ایک سرمدی مسرت کے گہوارے میں جھول

حاملہ عورتوں، دودھ پلانے والی ماؤں اور شیر خوار بچوں کی صحت کا حقیقی ضامن
کیلسیم اے - ڈی
جس میں
کیلسیم اور وٹامنز اے ڈی
شامل ہیں
سالہا سال کی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد سائنسدانوں نے ثابت کیا ہے کہ انسانی جسم کو جن معدنی نمکیات اور وٹامنز کی ضرورت ہے، اُن میں سب سے اہم اور ضروری کیلسیم اور وٹامنز اے ڈی ہیں۔ حمل کے زمانے کے ساتھ ساتھ کیلسیم کی کمی بھی حاملہ کے جسم میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اور اس کا باعث یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ اپنی پرورش اور ہڈیوں کی تعمیر کے لئے ماں کے خون سے کیلسیم حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ حمل میں ماں کے خون کا کیلسیم بہت تیزی کے ساتھ بچے کے پیٹ میں پہنچتا رہتا ہے اور ماں کے اسی کیلسیم سے بچے کی پرورش اور نشوونما ہوتی ہے۔ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ زمانہ حمل اور دودھ پلانے کے زمانے میں عورتیں کی خوراک میں کیلسیم اور وٹامنز اے - ڈی کی کمی ہی سے عورتیں زرد رو، لاغر اور کمزور ہو جاتی ہیں۔
بچوں کی جسمانی نشوونما، ہڈیوں اور دانتوں کی پرورش کے لئے کیلسیم اے - ڈی بہت ضروری ہے۔ اس کی کمی سے جسمانی نشوونما رُک جاتی ہے۔ ہڈیاں کمزور اور دانت خراب ہو جاتے ہیں جو بچے دیر سے چلنا سیکھتے ہیں اور جن بچوں کے دانت دیر سے نکلتے ہیں اُن کے جسم میں کیلسیم اور وٹامنز اے ڈی کی کمی ہوتی ہے ہڈیوں کے ٹیڑھے ہو جانے اور نرم پڑ جانے کا مرض بھی اسی کمی سے پیدا ہوتا ہے جسم اور قد کی نشوونما، ہڈیوں کی ساخت اور پرورش کیلئے کیلسیم اے - ڈی بہت ضروری ہے۔ یہ دوا نہیں بلکہ غذا ہے۔ اسے دوا نما غذا کہنا چاہیے۔
عقلمند اور دور اندیش والدین اپنے بچوں کو روزمرہ کی دوسری غذاؤں کی مانند کیلسیم اے - ڈی بھی استعمال کراتے ہیں۔ ملک کے کونے کونے میں اسے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔
کمزور مریضوں، حاملہ عورتوں، دانت نکالنے والے بچوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کیلئے ملک کے نامور ڈاکٹر کیلسیم اے ڈی کے استعمال کی زبردست سفارش کرتے ہیں
قیمت
فی شیشی ساٹھ گولی
تین روپے
انڈیا آفس
ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ دہلی

ڈنلپ نے سب سے پہلے ایسا ٹائر ایجاد کیا جس میں ہوا بھری جائے۔

ڈنلپ نے اس ملک میں سب سے پہلے ٹائر کا کاروبار شروع کیا۔

ڈنلپ نے اس ملک میں ٹائر کا پہلا کارخانہ کھولا۔

ڈنلپ ہی پہلی ٹائر کمپنی ہے جسے اس ملک میں اپنی پچاسویں سالگرہ منانے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

عمدگی اور کارگزاری میں ہمیشہ سب سے آگے

میری محبت کو اور بھی دوبالا کر دیا کہ خوبصورت ہوتے ہوئے بھی اس
فرشتہ خصلت انسان نے اپنے آپ کو محض اس لئے بھدا بتایا (اور
دوسروں سے بھی کہلوایا) کہ مجھے اپنے اندھیا پے کا رنج نہ ہو
میرے والدین چلے گئے تو انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے
کہا: کس قدر دلفریب ہو تم!"

میں جواب میں بولی: "خوشامدی!"
جس پر وہ کہنے لگے: "نہیں ہرگز نہیں۔ جب صرف میں ہی تمہارا
آئینہ تھا۔ اُس وقت بھی میں نے تمہیں حسین بتایا اور اب اِس وقت
میرا یہ حریف، یہ قدِ آدم آئینہ بھی میرے بیان کی تصدیق کر رہا ہے!"
(لیو پیپے کی انگریزی کہانی سے ماخوذ)۔

مجھے منظور نہیں

از
جناب سیّد حُباب ترمذی

دردِ پیہم کی دوا ہو مجھے منظور نہیں!
کوئی راضی بہ رضا ہو مجھے منظور نہیں
حُسن اور مجھ پہ فدا ہو مجھے منظور نہیں
عشق خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں
دیکھ اے ساقیٔ رعنا مجھے اتنی نہ پلا
خطرۂ لغزشِ پا ہو مجھے منظور نہیں
حُسن مانوسِ تبسّم ہو سرِ منظرِ عام
میری بے باک نگاہ ہو مجھے منظور نہیں
آپ ہرگز نہ نقابِ رُخِ زیبا اُلٹیں
بزم میں حشر بپا ہو مجھے منظور نہیں

چشمِ ساقی میں یہ مانا کوئی شے ہے لیکن
مَے اندوہ رُبا ہو مجھے منظور نہیں
اُن کی ہر بات گوارا مگر اے شیوۂ دل
اِس میں توہینِ وفا ہو مجھے منظور نہیں
زلف بر دوش نہ آئے کوئی خورشید جمال
دِل گرفتارِ بلا ہو مجھے منظور نہیں
باعثِ لُطف ہے میرے لئے اندازِ جفا
کوئی مجبورِ وفا ہو مجھے منظور نہیں
دلِ ناکام بھی ہے بانیٔ بربادیٔ دِل
اِس میں صرف اُن کی خطا ہو مجھے منظور نہیں

ناگہاں میرے لئے بحرِ محبّت میں حُباب
ناخدا ڈوب رہا ہو مجھے منظور نہیں

کرنے کو بہت تھوڑا عرصہ نصیب ہو گا!

بملا: میری عجیب حالت ہے، اندھا رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا اور بینا ہونے سے بھی ڈر لگتا ہے کہ ناحق سب طلسم ٹوٹ جائے گا۔ بہرحال دعا کرو بملا! ممکن ہے میں تمہارے خط اپنی آنکھوں سے پڑھنے کے قابل ہو جاؤں۔

میری پیاری سہیلی!

ایک ہفتہ ہوا آپریشن کیا گیا۔ ایک لرزاں ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا گیا۔ میرے منہ سے دو فلک دوز چیخیں نکلیں، اور مجھے دن سورج روشنی اور رنگ ذرا ذرا سے نظر آتے ہوئے معلوم ہوئے، لیکن میرے عرق آلود ماتھے اور آنکھوں پر فوراً ایک پٹی کس کر باندھ دی گئی۔ اگر میں سات دن اور صبر سے گذار سکوں تو ممکن ہے آنکھیں ٹھیک ہو جائیں۔ لیکن میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی! میں نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا، وہ کیوں؟ ذرا سنو۔ ماں ننھی کو میرے پاس لائی۔ ننھی نے اپنی توتلی آواز میں کہا۔ "اماں"! مجھ سے رہا نہ گیا۔ محبت کی دیوانگی اور مامتا کے جوش میں میں نے پٹی کو پھاڑ کر پھینک دیا، اور زور زور سے چلانے لگی "میری بچی! آج میں نے تمہیں دیکھ ہی لیا آخر! کتنی پیاری ہو تم"! خادمہ نے جلدی سے پٹی پھر میری آنکھوں پر باندھ دی، لیکن اب میں مطمئن تھی۔ اب میں اس غلطی پر پشیمان نہ تھی، کیونکہ میری بچی کا نقشہ میرے تصور میں محفوظ ہو گیا تھا۔ اب مجھے دوبارہ اندھے ہو جانے کا مطلق خوف نہ تھا۔

کل شام میری والدہ میرا سنگھار کرنے آئیں اور مجھے بنانے سنوارنے میں غیر معمولی وقت صرف کر دیا۔ جب فارغ ہوئیں تو انہوں نے کہا "پٹی اتار دو"! میں نے امید و بیم کی حالت میں حکم کی تعمیل کی۔ اگرچہ کمرہ شفق سے بہت دھندلا سا روشن تھا۔ لیکن مجھے دنیا عجیب حسین معلوم ہوئی۔ اور میں نے ماں، باپ، ننھی سب کو باری باری خوب بھینچ بھینچ کر گلے لگایا۔ اتنے میں والد بولے "تم نے ابھی اپنے آپ کو تو دیکھا ہی نہیں"!

"اور وہ کہاں ہیں؟" میں چلائی۔

میری ماں نے کہا "وہ چھپے چھپے پھرتے ہیں"۔ اور ساتھ ہی مجھے اُن کی بھدی شکل، ننھی جسم اور چیچک زدہ چہرہ یاد آنے لگا۔ میں پھر بولی "نہیں، نہیں، انہیں بلوا دیجئے، وہ تو میری نظروں میں یوسف سے بھی زیادہ حسین ہیں"!

اماں بولیں "جب تک ہم ستندر کا انتظار کرتے ہیں، تم اپنے آپ کو تو آئینے میں دیکھ لو"!

کچھ استعجاب اور کچھ خود بینی کی وجہ سے میں نے تعمیل ارشاد کی۔ لیکن میرا دل اس خوف سے دھڑکنے لگا کہ کہیں میں بدصورت نہ ہوں۔ جس طرح ہماری مفلسی کو مجھ سے چھپایا گیا تھا، اسی طرح میری بدصورتی کو بھی مجھ سے پوشیدہ نہ رکھا گیا ہو! لیکن آئینہ دیکھ کر تو میں ششدر سی رہ گئی۔

میرا سرو سا قد، میری پتلی کمر، میرا گلاب سا چہرہ، میری نرگسی آنکھیں..... لیکن میں آئینے میں پوری طرح اپنا جائزہ نہ لے سکی، کیونکہ آئینہ کچھ لرز سا رہا تھا، اس ارتعاش کی وجہ معلوم کرنے کے لیے میں نے آئینے کے پیچھے جو جھانکا تو ایک نوجوان کو پایا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، خوبصورت اور بارعب چہرہ اور کالے کوٹ پر ڈکٹوریا کراس میڈل آویزاں۔ ایک اجنبی کی موجودگی میں اس قدر غور اور انہماک سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کے احساس سے میں عرق عرق ہو گئی، لیکن میری ماں نے اجنبی کی ذرا بھی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"ذرا غور سے تو دیکھو! تم کس قدر حسین ہو، ایک تازہ گلاب کے مانند"!

میں چلائی "اماں جان"!

لیکن میری اماں نے بے پروائی سے میری آستینوں کو اوپر کھینچتے ہوئے پھر کہا "ذرا اپنی گوری گوری کلائیوں کو تو دیکھا ہوتا"!

میں نے پھر چلا کر کہا۔ "یہ آخر دوسروں کے سامنے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

وہ بولیں۔ "دوسرا کونسا؟ آئینہ ہی تو ہے"!

میں "میرا مطلب آئینے سے نہیں، بلکہ اُن صاحب سے ہے جو آئینے کے پیچھے کھڑے ہیں"!

اماں "اری، یہ تمہارے میاں ہیں میاں"!

باہیں پھیلائے میں آگے بڑھی، لیکن جھجک کر پیچھے کو گر گئی۔ وہ کس قدر خوبصورت تھے! کتنی خوش قسمت ہوں میں! اندھی ہوتے ہوئے میں ایک خیالی ستندر سے محبت کرتی رہی، لیکن اب اس احساس نے

ارزش کرتے ہیں۔ بھلا مجھے کیا پروا ہے اُن کی بدصورتی کی؟ مجھے اب اس بات کا احساس تک بھی نہیں۔ کہ حسن کیا چیز ہے اور بدنمائی کسے کہتے ہیں، لیکن اس بات کی مجھے ضرور خبر ہے کہ کوئی مجھ پر فریفتہ اور مہربان ہے!

بھلا! خدا کرے ہر لڑکی کی زندگی ایسی ہی مسرّت آمیز ہو!

میں ایک ننھی سی بچی کی ماں ہو گئی ہوں۔ پیاری بلا! لیکن میں اُسے دیکھنے سے محروم ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچی بہت پیاری ہے اور ہو بہو میرا نقشہ ہے۔ لیکن میں اُس کی دید سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتی۔

نیلا آسمان، جھلملاتے ستارے، رنگین پھول، وفادار میاں کا چہرہ، فرشتہ خصلت والدین کی صورت، غرض کہ فطرت کے ہزاروں سحر طراز نظارے ہیں جن کو میں نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن ان تمام حسین مناظر کو نہ دیکھ سکنے کا احساس مجھے اس قدر تکلیف نہیں دیتا جتنی اپنی ننھی سی بچی کے دیکھنے کی حسرت! خدا کی شان، مامتا کس قدر زبردست طاقت ہے۔

اگر میری آنکھوں کو نور سے محروم کرنے والا پردہ ایک منٹ، محض ایک چشم زدن کے لئے دور ہو جاتا تاکہ میں اپنی ننھی کے معصوم چہرے کی ایک جھلک ہی دیکھ سکوں، تو میں ساری عمر کبھی دوسری دعا کے لئے خدا کے سامنے ہاتھ نہ اٹھاؤں۔ مامتا! — امتا!!

اس تسکین کے لئے تو میں بھی ماں سے نہیں کہہ سکتی۔ میرا شوہر بھی بینائی سے قاصر ہے! وہ ہزار یہ بتائیں کہ میری ننھی کے بال گھونگھر والے ہیں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہیں، تبسم شیریں اور دلفریب ہے، لیکن میرے کس کام؟ جب میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتی کہ کس وقت میری ننھی میری طرف پیاری پیاری بانہیں پھیلا کر ہنستی ہے۔

پیاری بلا!

میرے میاں فرشتہ ہیں، فرشتہ! بھلا بتاؤ کیسے؟ سنو وہ بغیر مجھے خبر کئے گذشتہ دو سال سے ایک کوشش میں تھے۔ وہ میری بینائی واپس لانا چاہتے ہیں۔ اور بھلا ڈاکٹر کون ہے؟ وہ خود! جس نے محض میری خاطر یہ تکلیف دہ پیشہ اختیار کیا ہے۔

ایک دن وہ بولے "پیاری! تمہیں معلوم ہے میں تمہاری بینائی واپس لانے کے خیال کے درپے ہوں؟"

میں: "کیا یہ ممکن ہے؟"

وہ: "ہاں ہاں! وہ غازے جو میں تم کو اس بہانے سے ملوا تا رہا ہوں کہ چہرے کو صاف کریں گے کسی اور مطلب کے لئے تھے۔"

میں: "کس مطلب کے لئے آخر؟"

وہ: "وہ تمہاری آنکھوں کا موتیا بند رفع کرنے کے لئے آپریشن کی تیاری تھی۔"

میں: "کیا آپ کا ہاتھ کانپے گا تو نہیں؟"

وہ: "ہرگز نہیں، راہِ عشق میں لغزش کا کیا کام؟"

میں وفورِ محبت میں اُن سے ہم آغوش ہوتے ہوئے بولی "آپ تو سچ مچ فرشتہ ہیں۔"

وہ بولے: "میری جان! اس دھوکے اور ریاکاری کے آخری لمحوں میں مجھے جی بھر کے پیار کر لینے دو۔"

میں: "یعنی؟"

وہ: "پھر تم بینا ہو جاؤ گی۔"

میں: "اور پھر؟"

وہ: "پھر؟ پھر؟ پھر تم مجھے میری اصلی حالت میں دیکھو گی! پست قد، منحنی، سیاہ فام، بدصورت!"

ان الفاظ پر میں جوش میں کانپنے لگی اور ان سے یوں مخاطب ہوئی: "سنئے! اگر آپ کو میری محبت پر اعتماد نہیں، میری وفا پر یقین نہیں، میری شوہر پرستی پر بھروسا نہیں، تو چھوڑ دیجئے، مجھے میرے حال میں رہنے دیجئے، مجھے ایسی بینائی سے بے بصری ہزار درجہ بہتر ہے۔"

انہوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ محض میرے ہاتھ کو آہستہ سے دبا دیا اور بس۔

میری ماں نے بتایا کہ آپریشن میں ابھی ایک مہینہ باقی ہے۔

اب مجھے اپنے میاں کے متعلق ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ والدہ بتاتی ہیں کہ وہ چیچک زدہ ہیں۔ والد فرماتے ہیں کہ اُن کے سر پر بال بہت کم ہیں۔ نوکر کا خیال ہے کہ وہ ذرا عمر رسیدہ ہیں۔ چیچک رو ہونا تو خیر کوئی بات نہیں کیونکہ تقدیر پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ گنج ذہانت اور قابلیت کی نشانی سہی، لیکن عمر رسیدگی؟ یہ تو بہت برُی بات ہے۔ اگر مقتضائے فطرت وہ جلد ہی اگلے جہان کو چلتے بنے تو مجھے محبت

بملا! میری بہن!! تمہیں کیا معلوم کہ اِس گفتگو نے مجھے کس قدر عذاب میں مبتلا کر دیا —— ہاں، تو میرے والدین میری بے نور آنکھوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں! اِس اندھیرے میں مجھے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرا رہے ہیں، لیکن صرف مجھے! واہ ری ماتا! اگر خدا مجھے زمین و آسمان کے سب خزانوں کا مالک بھی کر دے، میں جب بھی والدین کے اِس ایثار اور محبت کا صلہ نہیں دے سکتی۔

بملا پیاری!

میں نے کبھی پر بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے اپنے والدین کے افلاس کا حال معلوم ہو چکا ہے کیونکہ اِس اظہار سے میری محبت کی دیوی ماں دل شکستہ ہو جائے گی، لیکن میں نے اِس آڑے وقت میں اپنے والدین کی مدد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے، وہ کیسے؟ تمہیں رفتہ رفتہ خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

مسٹر ستندر بوس (میرے خواستگار) مجھ سے پھر ملنے آئے، اور —— الٰہی توبہ —— میں نے اپنے ارادے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انہیں کس قدر عشوہ و ناز دکھائے!

میں نے سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا: "اب تک تو آپ سب حالات پر غور فرما چکے ہوں گے - کیا آپ کے دل میں ابھی تک میری وہی قدر ہے؟"

وہ :- "کیوں نہیں؟ میں آپ پر اس لئے فریفتہ ہوں کہ آپ بے انتہا حسین اور بے انتہا شرمیلی ہیں۔"

میں :- "اور میرا قد؟"

وہ :- "سرو سے زیادہ دلفریب!"

میں :- "خوب! اور میری پیشانی؟"

وہ :- "چودھویں کے چاند سے زیادہ روشن!"

میں :- "واقعی؟" اور میں نے قہقہہ مار کر ہنسنا شروع کر دیا۔

وہ :- "کیوں؟ آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟"

میں :- "کچھ نہیں! یہ سوچ کر کہ —— کہ —— آپ میرے آئینے ہیں! میں آپ کے الفاظ کے ذریعے سے اپنا عکس دیکھ رہی ہوں۔"

وہ :- "جانِ من! کاش میں ہمیشہ کے لئے تمہارا آئینہ بن سکوں! تاکہ تمہاری سیرت اور صورت دونوں مجھ میں منعکس ہوتی رہیں۔ میں قدرے امیر بھی ہوں، تمہیں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی، میں تمہیں اور تمہارے والدین کو خوش رکھنے کے لئے اپنے مال اور اپنی جان تک سے دریغ نہیں کروں گا۔ کاش تم میری ہو جاؤ!"

میں :- "اگر میری شادی آپ سے ہو جائے تو آپ کے جذبۂ خود ستائی کو سخت ٹھیس لگے گی کیونکہ میں آپ کو دیکھ نہیں سکتی۔"

وہ :- "افسوس! مجھے بھی ایک بات کا اقبال کرنا ہے۔"

میں :- "کہئے، کہئے!"

میں :- "میں مادرِ گیتی کا بہت بدنصیب بچہ ہوں۔ نہ میرا قد خوشنما ہے اور نہ میری شکل دلفریب، اور اِس پر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ میرا چہرہ چیچک کے داغوں نے اور بھی کریہہ المنظر کر دیا ہے - تو —— تو —— ایک نابینا لڑکی سے شادی کر کے میں اپنی خود غرضی کا ثبوت دے رہا ہوں۔"

میں :- "میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ یہ حقیقت ہے یا آپ کا انکسار —— لیکن آپ مجھے مخلص، راست گو اور ایماندار معلوم ہوتے ہیں —— لہٰذا مجھے جیسی بھی میں ہوں، قبول فرمائیے۔ دُنیا کی کوئی چیز مجھے آپ سے بے پروا نہ کر سکے گی - آپ کی محبت مجھے اس صحرائے کوری میں خیاباں کا کام دے گی۔"

پیاری بملا! میں نے ٹھیک کیا یا غلط؟ لیکن والدین کی مدد مجھ پر فرض ہے۔

پیاری بملا!

تمہاری مبارکباد اور نیک دعاؤں کا شکریہ۔ میری شادی کو دو مہینے ہو چکے ہیں اور شاید ہی روئے زمین پر کوئی عورت مجھ ایسی خوش نصیب اور مسرور ہو! مجھے مطلق کوئی تکلیف نہیں۔ میرے میاں مجھ پر پروانہ وار فدا اور میرے والدین مجھ پر پہلے سے زیادہ مہربان ہیں۔ اب مجھے اپنی بے بصری کا احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ قدرت نے مجھے ستندر جیسی آنکھیں عطا کی ہیں۔

شادی کے دن میرے آئینے نے مجھے ایسی نفاست سے سنوارا کہ آئینۂ سکندری بھی اس سے زیادہ میری مدد نہ کر سکتا۔

شام کو ہم باغ میں ٹہلتے ہیں تو وہ مجھے پھولوں کی خوشبو سنگھا سنگھا کر، پھلوں کا رس چکھا چکھا کر اور پرندوں کے راگ سنا سنا

میں :- "اچھا تو پھر اور کون ہے"؟

وہ :- "آپ!"

میں :- "میں؟ کیا مطلب ہے آپ کا"؟

وہ :- "جی ہاں، اگر اجازت ہو تو.... مجھے آپ سے سچی محبت ہے"

میں :- "مجھ سے؟ آپ کو اور مجھ سے"؟

وہ :- "واقعی، دیوانہ وار!"

یہ سن کر میں ذرا الجھا سی گئی، اور گھبراہٹ میں خواہ مخواہ اپنی ساڑھی سے دست و گریبان ہوتی ہوئی بولی :- "آپ بہت عجلت پسند معلوم ہوتے ہیں"۔

وہ :- "میرے اس دعوے کی حقیقت اور صداقت آپ میری حرکات و سکنات اور میری آنکھوں کو دیکھ کر معلوم کر سکتی ہیں"۔

میں :- "لیکن میں تو بے بصر ہوں، مجھے کیا خبر!"

وہ :- "مجھے آپ کی بے بصری کی مطلق پروا نہیں —— کیا آپ کا بوٹا سا قد، آپ کے ننھے ننھے سے پیر، گورے گورے ہاتھ، عنبریں زلفیں، صراحی دار گردن، کلی سا دہن، گلاب سے رخسار، جنت کی حسین ترین حور کو بھی نہیں شرماتے؟ اور....؟"

تو گویا ان کی باتوں کا یقین کرتے ہوئے میرے ہاتھ گورے ہیں، میری زلفیں عنبریں ہیں، میری گردن صراحی دار ہے، میرا دہن کلی سا ہے اور میرے رخسار گلاب ایسے ہیں —— گویا میں حسین ہوں!

بملا! پیاری بملا!! عام لڑکیوں کے خواستگاروں کی اس قسم کی گفتگو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، لیکن مجھ جیسی اندھی لڑکی کے لئے وہ میرا محض عاشق ہی نہیں بلکہ آئینہ ہے

ہاں تو، پھر ذرا کوشش کر کے گفتگو کا سلسلہ شروع رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "کیا میں واقعی ایسی ہوں؟"

وہ :- "میں تو ابھی حقیقت کا عشرِ عشیر بھی بیان نہیں کر سکا"۔

میں :- "تو پھر آپ کا مطلب کیا ہے"؟

انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "جس طرح میں آپ کا ہو چکا ہوں، کاش آپ بھی میری ہو جائیں!"

میں :- "کیا واقعی آپ کی یہ خواہش ہے؟ ایک اندھی کی ایک انکھیارے سے شادی؟ رات کا دن اور سفید کا سیاہ سے ملاپ؟ مجھے شادی کا جوڑا بھی ٹٹول کر پہننا پڑے گا!.... نہیں نہیں، میرے والدین کافی امیر ہیں، انہیں اکلوتی بیٹی کبھی بوجھ نہیں معلوم ہو گی"۔

وہ اس فقرے کا جواب دیئے بغیر چلے گئے، لیکن خیر، وہ مجھے یہ تو پڑھا گئے کہ میں حسین ہوں، اور پتہ نہیں کیوں، آج کچھ میرے دل میں بھی چبھن سی محسوس ہو رہی ہے، کیا یہ محبت کی کسک ہے؟ آہ میرے آئینے!

—— ببو ——

میری بملا!

انسان کس قدر بدنصیب ہے! کس قدر مجبور ہے! میں یہ لکھوا رہی ہوں اور آنسو میرے رخساروں پر سے بہ بہ کر میرے آنچل کو تر کر رہے ہیں۔

اپنے "آئینے" کی ملاقات کے کئی دن بعد میں اپنی والدہ کے سہارے اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی، میری والدہ کو کچھ دیر کے لئے مجھے باغ میں چھوڑ کر تنہا اندر جانا پڑا۔ وہ ابھی چند ہی قدم گئی ہوں گی کہ میں نے اپنے باغ کی دیوار کے بیرونی طرف دو آوازوں کو گفتگو میں مشغول سنا، ممکن ہے انہیں یہ خیال ہو کہ وہ تنہا ہیں، لیکن بملا! تمہیں معلوم ہے کہ جب خدا ہمیں ایک حس سے محروم کر دیتا ہے تو دوسری حسوں کو زیادہ تیز کر دیتا ہے، اسی لئے اندھوں کے کان زیادہ تیز ہوتے ہیں، اگرچہ باتیں بہت ہی آہستہ آواز میں ہو رہی تھیں، لیکن میں نے ان کا لفظ لفظ سن لیا۔ یہ تھی وہ گفتگو :-

پہلی آواز :- "بدقسمت خاندان! بینک کی بربادی کا ایک نیا شکار"۔

دوسری آواز :- "اور لطف یہ ہے کہ ان کی لڑکی کو وہم و گمان تک نہیں کہ محض اس کی نابینائی کی وجہ سے اس کے والدین اسے خوش رکھنے میں کامیاب ہو رہے ہیں"۔

پہلی آواز :- "یعنی؟ اس پہیلی کا کیا مطلب؟"

دوسری آواز :- "اور اس میں تو شک نہیں کہ جہاں جہاں اس کا ہاتھ پڑتا ہے مہاگنی اور مخمل پر پڑتا ہے، لیکن اس معصوم کو کیا خبر کہ گھر کا ساز و سامان نیلام ہو چکا ہے اور اس نئے سامان کی یہ حالت ہے کہ نہ اس کی مہاگنی پر روغن باقی ہے اور نہ مخمل پر روئیں! اسے کیا معلوم کہ جب کھانے کے وقت وہ پلاؤ اور مرغ کے مزے اڑاتی ہے، اس کے پاس ہی اس کے والدین باسی روٹی کے سوکھے ٹکڑے چبا رہے ہوتے ہیں"۔

آئینہ

افسانہ

از

جناب افضل ایم - اے

میری پیاری بملا!

تم مجھ اندھی سے کیوں اصرار کرتی ہو کہ تمہیں خط ضرور لکھا کروں؟ کیا تم میرے غمناک خطوں سے اُداس نہیں ہوتیں؟ کیا تمہیں ان تاریک خیالات سے ڈر نہیں لگتا، جو اندھوں کو پریشان رکھتے ہیں؟

بملا! تم کتنی خوش قسمت ہو کہ تم دیکھ سکتی ہو!..... بینائی!--- نیلے آسمان اور درخشاں آفتاب کو دیکھنا، اور مختلف رنگوں میں تمیز کرنا.... آہ، کیا نعمت ہے بینائی! یہ سچ ہے کہ میں بھی کبھی اس نعمت سے بہرہ ور تھی، لیکن میں آٹھ سال کی مشکل سے ہوں گی کہ میری بینائی مجھے دھوکا دے گئی۔ اب میں سترہ سال کی ہوں۔ نو سال سے میرے گرد و پیش کی ہر چیز اس قدر سیاہ ہے، جیسے کالی رات۔ پیاری بہن! میں کئی دفعہ فطرت کی رنگینیوں کو یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن تقریباً سب رنگ میرے حافظے سے اُتر چکے ہیں۔ میں گلاب کی خوشبو سونگھتی ہوں، اُنگلیوں سے اس کی نرمی محسوس کرتی ہوں، لیکن میں اُس کے اُس رنگ سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہوں جس سے حسین عورتوں کے رخساروں کو تشبیہ دی جاتی ہے۔

کبھی کبھی میں آنکھوں میں چمک سی محسوس کرتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، دورانِ خون ہے، جس سے امید ہے کہ میں کسی دن پھر بینا ہو سکوں۔ آہ! وہم، خیال، دھوکا!

ابھی کل ہی مجھے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بہت عجیب---

میں اپنے کمرے میں کچھ ٹٹول رہی تھی کہ مجھ اندھی کے ہاتھ ایک آئینہ لگ گیا۔ اور میں نے اُس آئینے کے سامنے بیٹھ کر گڑیا کی طرح اپنے بال سنوارے! کیا میں... واقعی حسین ہوں؟ کیا میری جلد اتنی گوری بھی ہے جتنی نرم؟ کیا میری لمبی پلکوں کے نیچے خوبصورت آنکھیں بھی ہیں؟ کاش میں یہ سب کچھ اُس آئینے میں دیکھ سکتی!

تمہارا خط ابھی ابھی پڑھ کر مجھے سنایا گیا ہے، اس میں تم نے پوچھا ہے کہ کیا تمہارے والدین واقعی ایک بینک کے ٹوٹ جانے سے برباد ہو گئے ہیں؟ بہن! یہ بات محض دشمنوں نے اڑائی ہوگی! ہم اب تک امیر ہیں، میرے آرام کا سب سامان اُسی طرح موجود ہے، میں جہاں جہاں چھوتی ہوں، مخمل و اطلس پاتی ہوں، میری پلیٹیں اُسی طرح نفیس کھانوں اور نفیس مٹھائیوں سے بھری ہوتی ہیں۔

پیاری بہن! مجھے اسی طرح گاہے گاہے یاد کرتی رہا کرو۔ تمہارے خطوں سے مجھے خلوص کی بو آتی ہے۔

--- ✻ ---

پیاری بملا!

میں جو کچھ تمہیں بتانے والی ہوں، اُسے تم وہم و گمان میں بھی نہیں لا سکتیں۔ شاید تم یہ خط پڑھ کر پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کر دو یا ممکن ہے یہ خیال کرو کہ میری بینائی کے ساتھ میرے حواس بھی زائل ہو گئے ہیں، یعنی میرے بھی ایک چاہنے والے ہیں!!

ہاں ہاں پیاری بملا! مجھ اندھی، مجھ نابینا کا چاہنے والا مجھ پر اس قدر فریفتہ ہے کہ شاید کسی حسین سے حسین شہزادی کو ایسا عاشق نصیب نہ ہوا ہو۔

مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں کے ہیں؟ کیا کام کرتے ہیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ کل کھانے کے وقت وہ میری بائیں جانب بیٹھے تھے۔ کھانے کے دوران میں انہیں اپنے پر بہت زیادہ مہربان دیکھ کر میں بولی: "شاید مجھے آپ کی ملاقات کا شرف پہلی دفعہ حاصل ہوا ہے!"

وہ بولے: "لیکن میں آپ کے معزز والدین کو ایک عرصے سے جانتا ہوں۔"

میں: "میں آپ سے بہت خوش ہوں کہ آپ میرے محبوب والدین کو اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

وہ:- "اس گھر میں صرف وہی نہیں ہیں جو میری نظروں میں عزیز ہیں"

ناشتہ ہو یا دعوت
ہر موقعہ پر پھلوں کے یہ لذیذ مربّے اور آچار آپکے کھانے کو لذیذ تر اور پُر لطف
بنائیں گے اب یہ سائینٹفک طریقے پر بغیر ہاتھ لگائے ڈبوں میں بند کئے جاتے
ہیں اس لئے عرصہ دراز تک تر و تازہ رہتے ہیں *
LION BRAND
51 Famous Varieties
HARNARAIN GOPINATH
ہر شہر میں دستیاب ہو سکتے ہیں
ہمیشہ شیر مارکہ لیبل دیکھ کر خریدیئے۔ جو بہترین کوالٹی کا ضامن ہے
HG
THE HALL MARK OF QUALITY
ہرنارائن گوپی ناتھ کھاری باؤلی دہلی و کناٹ پلیس نئی دہلی

گئی تھی ——! اور پجاری کے پیروں کی طرف اُس کے ہاتھ بڑھ گئے۔
پجاری نے جھپٹ کر اُسے جھکنے سے پہلے ہی اٹھا لیا۔ مندا کنی کی آنکھیں پجاری کے چہرے پر جم گئیں اور پلکوں پر آنسوؤں کی بوندیں کانپنے لگیں۔

پجاری نے دیکھا، اُس کی آنکھوں سے نفسانیت کی وہ غلاظت ندامت کے آنسوؤں سے دُھل چکی تھی اور پلکوں پر لرزتے ہوئے قطروں میں تقدّس اور پاکیزگی چمک رہی تھی۔

(طبع زاد)

غزل

از

جنابِ اطہر شیر صبا عظیم آبادی

چھائی ہیں اودی اودی گھٹائیں اُف ری محبت ہائے جوانی
ایسے میں وہ آ کر جو بلائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

نہر کنارے، چاندنی راتیں، کیف سے مملو پیار کی باتیں
حُسن میں بھیگی بھیگی ادائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

تاب کہاں یہ آنکھ ملائیں، ڈر ہے کہیں وہ دِل نہ چرائیں
سحر نظر ہیں اُن کی ادائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

تارے ہیں بکھرے، چاندنی چھٹکی، دل میں اُمنگیں، لب پہ ترانے
آؤ ترانے عشق کے گائیں، اُف ری محبت ہائے جوانی

آہ لبوں پر، در پہ نگاہیں، میری تو گذری یونہی ہمیشہ
وعدہ کی شب وہ آئیں نہ آئیں، اُف ری محبت ہائے جوانی

چھائی ہیں چاروں اور گھٹائیں، مست فضائیں، بہکی ہوائیں
ایسے میں وہ اور یاد نہ آئیں اُف ری محبت ہائے جوانی

ہوتی ہیں کیسی ہجر کی راتیں چھائی ہوں جیسے کالی بلائیں!
ظلمت ہجراں کس کو دکھائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

ہجر میں مجھ کو جس نے دلایا، وصل کا اپنے بھول کے وعدہ
دیتا ہوں اُن کو دل سے دُعائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

مجھ کو ہیں پیاری جان سے اپنی، نام خدا قائم رہیں یوں ہی
اُن کی جفائیں، اپنی وفائیں، اُف ری محبت ہائے جوانی

لب پہ خموشی، قلب میں دھڑکن، آنکھوں میں ڈورے، بال پریشاں
درد میں ڈوبی ڈوبی ادائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

گلشنِ دِل میں پھر وہ آئیں، عیش کی کلیاں اِس میں کھلائیں
رشکِ ارم پھر اِس کو بنائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

مشقِ تصوّر کا ہے یہ ثمرہ، آئی صدا جو کانوں میں ایسی
دُور سے مجھ کو جیسے بُلائیں اُف ری محبت ہائے جوانی

گذرے فسانے کس کو سنائیں چھپ کے صبا وہ پیار کی گھاتیں
کاش! وہ دِن پھر لوٹ کے آئیں اُف ری محبت ہائے جوانی

میں کمزور پڑگئی ہے اور شکست کھا کر گھٹنے ٹیک ہی دینے والی ہے، اس لئے وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اتنے میں مندا کنی نے اُس کے دونوں بازو پکڑ کر پلنگ پر قریب قریب گراتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو نہ ---!"

مندا کنی کے لمس سے اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی بجلی سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کے لئے پجاری جلدی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لیکن بپھری ہوئی مندا کنی نے ساتھ ہی دوسرا حملہ کیا۔ وہ اپنے گلے سے مہاراج چندن کا دیا ہوا ہار اُتار کر پجاری کے گلے میں ڈالتی ہوئی بولی۔ "دیکھوں تو تمہیں یہ کیسا لگتا ہے" پھر پجاری کے دونوں کندھے پکڑ کر اُس کی آنکھوں میں اپنی مخمور آنکھیں گاڑتی ہوئی بولی۔ "اُف! دیوتا بن گئے ہو اس وقت تم---!"

پجاری کو محسوس ہوا جیسے شراب اور شباب سے ہاری ہوئی مندا کنی کی عقل کی طرح وہ بھی مندا کنی کی آنکھوں سے شکست کھا جائے گا پھر بھی اپنے کو سنبھال کر بولا۔ "کیوں مذاق اُڑاتی ہو میرا؟ اس کی زینت تو تم جیسی اپسراؤں ہی سے ہے---!" اور ہار اتارنے لگا۔

"نہیں نہیں یہ مجھ سے زیادہ تمہیں کو اچھا لگ رہا ہے۔ اِسے نہ اُتارو!" اُس نے پجاری کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی اپنی بانہوں کو اُس کی بانہوں میں اُلجھا کر اپنا سر پجاری کے کندھے پر ٹیک دیا۔

اب پجاری بالکل ہی گھبرا اُٹھا اور کسی قدر بھاری آواز میں بولا۔ "مندا کنی! مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے پیار کرتی ہو، اور اس میں شک نہیں کہ میں بھی تم سے پریم کرتا ہوں۔ لیکن ---"

"لیکن کیا پجاری---؟" وہ بیچ ہی میں بول اُٹھی۔

"یہی کہ انسان کو زندگی کا ہر کام دھرم اور سماج کی حدوں کے اندر ہی رہ کر کرنا چاہئے" پجاری نے جواب دیا۔

"تو کیا پریم کرنا دھرم اور سماج کے خلاف ہے؟" مندا کنی نے آنکھیں نچا کر کہا

"نہیں مندا کنی، پریم ہی پر تو دھرم اور سماج کی بُنیاد ہے---!" پجاری نے نہایت میٹھے انداز میں کہا۔

"پھر---؟"

"پھر یہی کہ تم پریم تو کرتی ہو، لیکن تمہارا پریم انجان ہے اور انجان سے ساری غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ کسی انجانے کو بُرے اور بھلے کی تمیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر پریم اپنی حقیقت کو سمجھ لے تو اس سے کبھی غلطی اور بُرائی ہو ہی نہیں سکتی---!"

"پریم کی حقیقت کیا ہے؟" مندا کنی نے پوچھا۔

"پریم لوگ کرتے کیوں ہیں---؟" پجاری نے بھی سوال کیا۔

مندا کنی خاموش تھی۔

"اسی لئے نہ کہ اُس میں ہمیں لطف اور سکون حاصل ہو گا---؟"

پجاری نے نہایت سنجیدہ انداز سے کہنا شروع کیا۔ "لیکن یہ اُن کی بہت بڑی بھول اور کم علمی ہے۔ انسان اور انسانی حُسن کی طرح اُس کا پریم بھی فانی ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان اور انسانی حُسن دونوں فانی ہیں تم نے بھی سُنا اور دیکھا ہو گا کہ وہی عورت جو ایک دن اپنے شوہر کے تھوڑی دیر رُوٹھ جانے سے بے چین ہو جایا کرتی ہے اور اُسے اپنی زندگی ہی بے مزا معلوم ہونے لگتی ہے۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے ساتھ ہی تڑپ کر مر نہیں جاتی، خوشی خوشی دوسری شادی کر لیتی ہے۔ اور پھر اُس کے ساتھ بھی اُسی پریم اور محبت کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ تم نے اکثر ایسا بھی سُنا ہو گا کہ اگر شادی میں دیر ہوئی تو شرم و حیا اور لوک لاج کو چھوڑ کر وہ طرح طرح سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے لگتی ہے---"

مندا کنی کھوئی سی بیٹھی تھی، اور پجاری اپنی دُھن میں بولتا جا رہا تھا "پریم کرنے کے لائق تو صرف ایشور ہے۔ جو خود بھی امر اور لافانی ہے، اور اس کا پریم بھی امر اور لافانی ہے۔ اور اگر تم اُس کے پریم کو اپنی آنکھوں میں بسا کے اُسے تلاش کرو تو تمہیں کہیں جانا بھی نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ ایک دن اور میں تم سے کہہ چکا ہوں، ایشور ہر جگہ اور ہر شے میں ہے۔ یہاں تک کہ جو چیز تمہیں میری طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ بھی ایشور ہی کا حُسن ہے۔ دُنیا کی ہر چیز اُسی کا آئینہ ہے۔ اُسی کا عکس ہر چیز میں جھلکتا رہتا ہے۔ پھر عکس پر کوئی کیوں رِیجھے؟ حقیقت اور اصل ہی سے کیوں نہ لگاؤ پیدا کرے؟ کیونکہ عکس تو عکس ہی ہے۔ جب تک آئینہ ہے عکس ہے اور جیسے ہی آئینہ ٹوٹا عکس بھی غائب ہو گیا، اور آئینے کا ٹوٹنا لازمی ہے۔ کیونکہ آئینہ لافانی تو ہے نہیں۔ پھر اس فانی آئینے کے عکس پر ریجھنا کم عقلی نہیں تو اور کیا ہے مندا کنی؟ آئینہ کے ٹوٹتے ہی وہ حسین عکس اوجھل ہو جاتا ہے اور رہ جاتی ہے صرف ایک اتھاہ تاریکی! جس میں انسان اپنی آخری سانس تک بھٹکتا اور ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ اور اُسے کبھی سُکھ اور شانتی نصیب نہیں ہوتی۔"

"بس کرو پجاری---!" مندا کنی کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ جیسے کسی گہرے خواب سے چونک کر بولی۔ "معاف کرنا--- میں بھٹک

پڑتے ہی طرح طرح کے ساز بج اٹھے اور مندا کنی کے پیروں میں بندھے ہوئے
گھنگھروؤں کی جھنکار سے سارا دربار جھوم اٹھا۔ ساز کے اتار چڑھاؤ کے
ساتھ مندا کنی کے لوچدار جسم کا ہر ہر عضو ناگن کی طرح بل کھا رہا تھا۔ اور
اس کی ہر ہر حرکت پر تماشائیوں کے دل کچل کچل کر چھوڑے ہوئے سانپ کی طرح
اینٹھ رہے تھے۔

دو گھنٹے تک رقص کرنے کے بعد مندا کنی نے رقص بند کر دیا۔ سارے
تماشائی جیسے کسی سہانے خواب سے چونک پڑے۔ سب کی تشنہ نگاہوں سے
معلوم ہوتا تھا، جیسے مندا کنی نے دو ہی چار لمحوں کے بعد ناچ بند کر دیا ہو
اور پُرشوق آنکھوں کی سیری نہ ہوئی ہو۔ خود مہاراج چندر گپت نے اپنے
گلے کا قیمتی ہار اتارا اور اٹھ کر مندا کنی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تالیوں کی آواز
کے ساتھ لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر مندا کنی نے وہ ہار اسی وقت
پہن لیا۔ جس سے اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا۔

آج مندا کنی بہت خوش تھی۔ تماشائیوں کی بھیڑ ختم ہوتے ہی
وہ سیدھی پجاری کے پاس پہنچی۔ پجاری نے اس کے رقص کی بہت تعریف
کی اور مہاراج کے دیئے ہوئے انعام کے لئے ساتھ ہی مبارکباد بھی پیش کی۔

مندا کنی نے ہنس کر پھول بکھیرتے ہوئے کہا "آپ نے تو میری کامیابی
پر صرف زبانی تعریف اور مبارکباد سے کام نکال لیا، لیکن میں اتنی بخیل
نہیں ہوں۔ جنگ میں آپ کی فتح یابی کی خوشی میں آپ کو دعوت دیتی ہوں،
آج کا کھانا آپ کو میرے ہی ساتھ کھانا ہو گا ——!"

مندا کنی کو معلوم تھا کہ [illegible] میں زیادہ دیر تک ناچنا ہو گا۔
اس لئے اس نے تھوڑی سی شراب بھی پی لی تھی۔ تاکہ ہلکے سے سرور میں رقص
بھی اچھا ہو اور جلد تھکان بھی نہ آئے۔ دوسری بات یہ کہ فتح کی خوشی
میں تو ان لوگوں نے بھی تو خُم کے خُم لنڈھا لئے تھے، جو کبھی جام چھوتے
بھی نہ تھے۔ مندا کنی تو رقاصہ ہی تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک چلتا پھرتا ساغر!

کھانے سے فارغ ہو کر پجاری نے مندا کنی سے گھر جانے کی اجازت
مانگی، لیکن وہ سنتی کیسے؟ وہ تو کھڑکی سے باہر نگاہیں جمائے بادلوں کے
ساتھ چاند کی آنکھ مچولی دیکھنے میں کھوئی ہوئی جانے کیا سوچ رہی تھی! ایک
مرتبہ آدھا چاند بیچ سے اس طرح سرکتا ہوا دکھائی دیا، جیسے کوئی مدہوش
کسی تنومند نوجوان کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی جذبات کی فراوانی سے
کانپ رہی ہو۔ مندا کنی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "پجاری، ذرا جلدی
سے ادھر آؤ!"

اس کی آواز میں گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ ایسا ارتعاش تھا
کہ پجاری بھی گھبرا کر اس کے نزدیک آتا ہوا بولا "کیا ہے مندا کنی ——؟"

"ادھر آجاؤ" مندا کنی اسی طرح کانپتی ہوئی بولی۔

"بولو بھی تو —! بات کیا ہے؟" پجاری نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔
تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟"

"میرے پاس آؤ بھی تو —!" وہ بھاری آواز سے بولی۔

"پاس ہی ہوں مندا کنی، کہو کیا کہتی ہو ——؟" پجاری تھوڑا سرک
کر بولا۔

"اُف!" مندا کنی بہت تھکی ہوئی بولی۔ "اتنی دور سے نہیں ——
میں کہتی ہوں اور قریب —— میرے پلنگ پر ——!"

پجاری آہستہ سے پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ مندا کنی نے
ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "وہاں سے نہ
دیکھ سکو گے، کہتی ہوں یہاں آجاؤ ——!" اور پھر پجاری کو قریب قریب
اپنے اوپر کھینچتی ہوئی بولی۔ "آہ! آخر تم نے دیر کر دی، چاند کیسا ایک
بادل کے ٹکڑے کی گود میں کھیل رہا تھا۔ اب تو وہ اسی میں کھو گیا۔ دیکھو نہ
اب تو اندھیرا ہو گیا ہے ——!"

"ہاں مندا کنی ——!" پجاری اٹھنے کی کوشش کرتا ہوا آہستہ سے
بولا۔ "وہ کھیل ایسا عارضی ہوتا ہی ہے اور اس کے بعد بھیانک اندھیرا۔
بالکل دم گھونٹ دینے والا ——!" پھر یکایک جھٹکے سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔
"اچھا مندا کنی چلتا ہوں۔ بارہ بج گئے ہیں، تم بھی سو رہو!"

مندا کنی کی عقل و ہوش پر شراب چھاتی جا رہی تھی، اور اس
کا سہارا پا کر جوانی کا نشہ اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

انسان کے دل میں کچھ آرزوئیں اور خواہشیں ایسی ہوتی ہیں
جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا ہے، لیکن شرم، خودداری، لوک لاج اور
دوسری مجبوریوں کی بنا پر عقل اسے اس کی اجازت نہیں دیتی، لیکن
جب خواہشات اور احساسات جذبات کی مدد سے غالب آجاتے ہیں تو
عقل سے زبردستی اس کی اجازت لے لیتے ہیں۔

بہت دنوں سے یہی کیفیت مندا کنی کی بھی تھی۔ اس کی خواہشات
اور اس کے جذبات عقل کے ساتھ پوری طاقت سے جنگ آزما تھے۔
اور پجاری کو اس کی اس اندرونی جنگ کی خبر تھی، لیکن اس وقت وہ دیکھ
رہا تھا کہ شراب کی گہرائی میں ڈوبتی، تیرتی ہوئی مندا کنی عقل سے زور آزمائی

جیسے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ نیچے بہتی ہوئی جوانی کی الہڑ لہریں چودھویں کے چاند کو اپنی آغوش میں جھولا جھلا رہی تھیں۔ اور اُس کا دل کسی کی یاد کی متوالی لہروں پر نیچے اُوپر ہو رہا تھا۔

پجاری کو میدانِ جنگ میں گئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ لیکن اب تک واپسی کی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ مندا کنی اس انتظار میں رات دن اور صبح و شام کھڑکی پر کھڑی رہتی تھی کہ شاید کوئی قاصد جنگ کے متعلق کچھ خبر لے کر آتا ہوا اور دور سے آتی ہوئی ہر گھوڑے کی ٹاپ کی آواز پر اُس کے مضطرب دل کی دھڑکن اور بڑھ جاتی تھی کئی دنوں سے اسی طرح ٹکٹکی لگائے، راہ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ کم خوابی سے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے اور دل بیٹھ سا گیا تھا۔

آج وہ گھبرا کر شاہی باغ کی طرف نکل گئی تھی۔ اور ایک کنج میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہی تھی کہ یکایک کسی کے پیروں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔ گردن گھما کر دیکھا تو راجکمار نے اُس کے بالکل قریب آتے ہوئے اُس کے چہرے پر پُر شوق نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ "اِن آنکھوں میں کئی دنوں سے پریم کی بھینٹ لئے قدموں میں ڈال دینے کے لئے تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن —!

"راجکمار —!" مندا کنی بیچ ہی میں بول اُٹھی۔

راجکمار نے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پیار کی مٹھاس کے بجائے غصے کی تلخی جھلک رہی تھی۔ اور گلابی چہرہ سرخ ہو آیا تھا۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مندا کنی کے تیور دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ اتنے میں مندا کنی خود ہی بول اُٹھی۔ "راجکمار! مجھے معلوم نہیں تھا کہ اُس دن وہ ہار میری کلا کا انعام نہیں تھا، میرے روپ کی قیمت تھی —!

"نہیں مندا کنی تم اب بھی نہیں سمجھیں —!" راجکمار نے کسی قدر لجاجت سے کہا "میں اس قابل کہاں کہ تمہاری کلا کا انعام اور تمہارے اِس فردوسی حُسن کی قیمت دے سکوں؛ وہ تو ایک پجاری کی طرف سے پریم کی ایک حقیر بھینٹ تھی —!"

"راجکمار —! شاید آپ بھول رہے ہیں کہ آپ پاٹلی پتر کی راجدھانی کے سنگھاسن کے وارث ہیں! اور میں صرف مندا کنی نام کی ایک رقاصہ! جس کی جگہ سنگھاسن کبھی بھی نہیں ہو سکتا!"

"یہی تو میں بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں مندا کنی! کہ اس رقاصہ کی جگہ تو پاٹلی پتر کے وارث کے دل کے سنگھاسن پر بن چکی ہے۔ پریم کا دربار تو اتنا اُونچا ہوتا ہے کہ اُس میں آکر سمراٹ اور بھکاری سب ایک برابر ہو جاتے ہیں۔ وہاں دل کے سوا کسی دوسری چیز کی کوئی اہمیت اور قیمت نہیں ہوتی!"

"تو پھر راجکمار —!" مندا کنی جیسے اپنے مطلب کی کوئی بات پا کر بولی۔ "تب تو شاید آپ مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کریں گے کہ میں پریم کے اُسی قانون کے مطابق اپنے دل کا سودا کر چکی ہوں —!"

راجکمار کو ایسا دھکا لگا، جیسے اچانک اُس کا نشہ اُکھڑ گیا ہو۔ وہ اپنے ہی لفظوں میں بندھ چکا تھا۔ اس لئے آگے بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ اتنا بھی نہ پوچھ سکا کہ آخر وہ ہے کون خوش نصیب جو پاٹلی پتر کے سنگھاسن کے وارث کو بھی شکست دے سکتا ہے۔ وہ گردن جھکائے آہستہ سے چل پڑا۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد جیسے کسی چیز میں بندھا ہوا پھر لوٹ آیا، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "مندا کنی! میں دولت اور طاقت سے تمہارا پیار خریدنا نہیں چاہتا۔ لیکن کیا اتنا پوچھ سکتا ہوں، کہ تم مجھے چاہو یا نہ چاہو، مجھے اپنے دل میں پوجنے کا اختیار دے سکتی ہو؟"

"راجکمار —!" مندا کنی نگاہیں نیچی کئے، اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئی تھکی تھکی آواز میں بولی۔ "جو چیز میں آپ کو نہیں دے سکی اُسے آپ سے پانے کے لئے کس منہ سے درخواست کر سکتی ہوں؟؟؟"

اتنا کہہ کر مندا کنی اپنی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے مجبوری کے آنسو چھپانے کے لئے تیز تیز قدموں سے اپنے محل کی طرف چلی گئی۔ اور راجکمار نہ جانے کب تک وہیں کھویا ہوا سا کھڑا رہا۔

آج صبح چندر گپت کی فوج سیلوکس کو شکست دے کر پاٹلی پتر میں واپس آئی تھی۔ سارا شہر خوشیاں منا رہا تھا۔ ہر طرف قصر و محلات پر جگمگاتے ہوئے دیپکوں کی روشنی نے جیسے رات کی تاریکی کو پاٹلی پتر سے باہر نکال دیا تھا۔ جگہ جگہ شادیانے بج رہے تھے۔ آج رات مندر بھی خاص طور سے سجایا گیا تھا۔ اُس میں بہت بڑا جشن منایا جانے والا تھا۔ مندا کنی کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے فن کار بلائے گئے تھے۔ کیونکہ مہاراجہ چندر گپت خود بھی آنے والے تھے۔

بہت سے فنکاروں کے بعد مندا کنی کی باری آئی۔ تماشائیوں کی نگاہوں کے ہجوم میں وہ سٹیج پر آئی۔ بے شمار اور رنگ برنگی روشنی میں اُس کا حسن اور بھی چمک اُٹھا۔ آج سنگھار بھی اُس نے خاص طور سے کیا تھا۔

مندا کنی نے جھک کر مہاراجہ چندر گپت کو پرنام کیا۔ پیروں کی تھاپ

رہی تھی۔ اُس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ آج پجاری سے کچھ کہنے کا موقعہ تلاش کر رہی ہو۔ اتنے میں آہستہ سے دروازہ کھلا اور اچانک راج کمار داخل ہوئے۔ جھٹکے سے کھڑے ہوتے ہوئے پجاری نے کہا "آج راجکمار نے پرشاد لینے میں بہت دیر کر دی!"

"ہاں! آج مجھے دیر ہو گئی پجاری جی ——!" راجکمار نے کنکھیوں سے مندا کنی کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھنڈی آہ کے ساتھ جواب دیا "یہ تو سب بھگوان کی مرضی پر منحصر ہے نہ؟ وہ جس دن، جب چاہتے ہیں جب ہی بھگت کو درشن نصیب ہو سکتا ہے!"

"تو پھر پرشاد کے لئے بھی تھوڑے صبر سے ہی کام لیجئے!" پجاری نے سادہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں باغ سے ابھی ابھی کچھ پھل توڑ کر لا دوں!"

پجاری کے چلے جانے کے بعد مندا کنی سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی اتنے میں راجکمار کی آواز اُس کے کان میں آئی "بہت اچھا ناچتی ہو مندا کنی ——!"

"جی راجکمار ——!" مندا کنی کے منہ سے یہ مہمل جملہ خود بخود نکل گیا۔

"اگر اپنی اور اپنے کمالِ فن کی تحقیر نہ سمجھو تو ایک معمولی سا تحفہ قبول کر لو ——!" کہہ کر راجکمار نے اپنے گلے سے قیمتی جواہرات کا ہار اُتار کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

مندا کنی ہلکے سے کانپ گئی۔ اُس کی آنکھیں غیر ارادی طور پر ایک بار راجکمار کی طرف اُٹھیں اور دوسرے ہی لمحے اُن کے قدموں پر جھک گئیں جیسے اپنی خاموش زبان میں کہہ گئی ہوں "میں اتنی عزّت افزائی کے قابل کہاں"۔

اتنے میں پجاری پھل لے کر آ گیا اور مورتی کے قدموں پر گرے ہوئے کچھ پھول اُٹھا کر پھلوں کے ساتھ ملا کر راجکمار کو دے دیا۔ راجکمار نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مندا کنی پر ڈالی اور چلنے کے لئے پجاری سے اجازت طلب کی، تو چند قدم تک پہنچانے کے خیال سے پجاری بھی اُن کے ساتھ ساتھ مندر کے احاطے کے باہر تک چلا گیا۔

واپسی پر مندا کنی کو مندر میں نہ دیکھ کر پجاری نے سوچا، ہو سکتا ہے۔ دیر ہونے کے خیال سے وہ بھی پچھلے دروازے سے چلی گئی ہو، اور اپنے آسن پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے بھگوان کے دھیان میں لگ گیا۔

چند ہی لمحے کے بعد ایک کنول کا پھول اُس کی گود میں آگرا۔ یہ سوچ کر کہ ہوا کے ساتھ مورتی کے اوپر سے آگرا ہوگا۔ اُس نے کوئی توجّہ نہ دی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک پھول اُس کے گال پر آلگا۔ اور اس مرتبہ ساتھ ہی آنکھیں کھل گئیں۔ ابھی وہ اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ مورتی کے پیچھے سے آواز آئی "پجاری ——! تمہاری بھگتی سے ہم خوش ہوئے، مانگو کیا مانگتے —— ہو؟؟؟"

پجاری نے مندا کنی کی بناوٹی آواز پہچانتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا "دیوتا کو بھگت پرگٹ روپ میں دیکھنا چاہتا ہے"۔

"خوش ہو جاؤ کہ تمہاری یہ کامنا پوری کی گئی ——" مندا کنی مورتی کے پیچھے سے نکل کر مسکراتی ہوئی سامنے کھڑی ہو گئی۔

پجاری مندا کنی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اتنے میں وہ پھر کسی قدر تحکمانہ انداز میں بولی "دیکھتے کیا ہو؟ پھل اور پھول کے ساتھ دیوتا کا سواگت کرو!"

پجاری نے مورتی کے .... پیروں کے سامنے گرے ہوئے کچھ پھول اُٹھا کر اُس کے پیروں پر ڈال دیئے۔ اور اپنے گلے کی مالا اُتار کر اُس کے گلے میں ڈال دی۔ مندا کنی اپنی ہنسی دبائے پجاری کی یہ سب حرکتیں دیکھتی رہی۔ لیکن جب پجاری اُس کے قدموں پر سر رکھنے کے لئے جھکا، تو جھپٹ کر اُس کا سر اپنے ہاتھوں میں روکتی ہوئی گھبرا کر بولی "اُف! یہ کیا کر دیا پجاری تم نے ——؟"

"اپنے بھگوان کی پوجا ——!" پجاری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بھگوان تو سب جگہ اور سب ہی میں ہیں نہ! اُن کی پوجا کہیں اور کسی جگہ بھی کی جا سکتی ہے۔ بس تو تم میں اور خود اپنے میں بھی اُسی بھگوان کو دیکھتا ہوں، جو اِس پتھر کی مورتی میں ہے اور ہر روز صبح و شام میری گردن اپنے سامنے جھکواتا ہے"۔

مندا کنی کی سمجھ میں یہ تو نہ آ سکا کہ پجاری نے یہ روشنی اُسی کو دکھائی تھی، تاکہ وہ مادّی محبّت کے تاریک غار میں بھٹکنے کے بجائے حقیقی محبّت کی پاک روشنی میں سیدھے راستے پر لگ جائے، لیکن پجاری کی اِس حرکت اور اِس خشک تقریر نے اُس کے جذبات کے نشے پر ترشی کا کام کیا اور وہ کچھ اُداس اور خفیف سی ہو گئی۔

اپنے محل کی کھڑکی پر کھڑی دور اُفق میں نگاہیں جمائے مندا کنی

افسانہ

رقّاصہ کی محبّت

از

قیصر جمالی ایڈیٹر "انجم"

قدیم ہندوستان کا حسن و رومان میں ڈوبا ہوا ایک نہایت دلکش اور حقیقت آگیں شاہکار

"کون ——؟" دستک کی آواز سن کر پجاری نے چونک کر پوچھا۔

کوئی جواب نہ پا کر اُس نے دروازہ کھولا۔ مندا کنی کنڈی پکڑے کھڑی مسکرا رہی تھی، پجاری نے کہا "اوہ! تم اس وقت ——؟ آج تم آرتی کے وقت بھگوان کے مندر میں کیوں نہیں آئیں مندا کنی؟"

"اب تو آئی ہوں نہ ——!" مندا کنی نے شوخ ہونٹوں پہ سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے کہا "بھگوان کے دوار تو بھگتوں کے لئے سدا کھلے رہتے ہیں نہ، یہی ہمیشہ سنتی آئی ہوں!"

"تم بہت ویسی ہوتی جا رہی ہو مندا کنی ——!" پجاری نے اُس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی شرارت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو میں ویسی ہوتی جا رہی ہوں ——؟" مندا کنی کسی قدر ٹھنک کر بولی "بھلا بتاؤ تو کیسی ——؟"

"یہی کہ ——" پجاری اُس کی کھنچی ہوئی بھوؤں کی زد سے جیسے اپنی نگاہوں کو بچاتے ہوئے کچھ رک کر بولا "میرا مطلب ہے —— پہلے تم کتنی سیدھی تھیں ——!"

"اور اب کہاں کہاں سے ٹیڑھی ہو گئی ہوں، ذرا سنوں تو ——؟" مندا کنی نے مچل کر پوچھا۔

"اچھا تم اپنا پرشاد لے کر جاؤ گی، یا جھگڑا کرنے کی ٹھان کر آئی ہو؟" پجاری نے بناوٹی غصّے سے کہا۔

"اگر میری سیدھی بات میں بھی جھگڑے کی تیاری معلوم ہوتی ہے تو لاؤ میرا پرشاد۔ میں جاتی ہوں ——!" وہ سادگی سے منہ پھلا کر بولی۔ "اب بھگوان کے دوار سے بھی بھگت بھگائے جائیں گے تو اور کہاں شانتی پائیں گے ——؟" اور پرشاد لے کر باہر نکل گئی۔

پجاری نے دروازہ بند کرتے کرتے مندا کنی کا یہ شوخ اور معنی خیز طنز سنا اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اندر چلا گیا۔

مندا کنی مہا راجہ چندر گپت کے مندر کی رقّاصہ تھی اور ہر روز بھگوان کے سامنے اپنے فن کا کمال دکھایا کرتی تھی۔ اُس وقت وہ جوانی کی حدیں چھو رہی تھی۔ اُس کے عضو عضو سے شوخیاں اور شرارتیں کونپلوں اور کلیوں کی طرح چٹک رہی تھیں۔ اُس کی ہر حرکت کی اوٹ سے جوانی مسکراتی نظر آتی تھی۔ جب وہ راج مندر میں لپکتے ہوئے شعلوں اور چٹختی ہوئی چنگاریوں کی طرح رقص کرنے لگتی تو نوجوان اور بڈھوں کی نگاہیں اور دماغ و خیالات بھی بھگوان کی مورتی سے ہٹ کر بھگوان کے اس زندہ شاہکار پر مرکوز ہو جاتے!

پجاری کا نام تھا دھرت سین۔ اُس کا بیس اکیس سال کا نوجوان خون اُس کے چہرے میں دوپہر کے سورج کی طرح تمتماتا رہتا تھا۔ اُس کے درشن ہی سے مردہ دلوں میں زندگی بیدار ہو جاتی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں درختوں کی چوٹیوں اور پاٹلی پتر کے محلوں اور ایوانوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ مندا کنی کا رتھ آہستہ آہستہ راج مندر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اُس کے روپ اور جوانی کے پجاری سڑکوں اور گلیوں میں جگہ جگہ آنکھیں بچھائے کھڑے تھے۔ اور جنگلی ہرنی کی طرح اُس کی شوخ نگاہیں رہ رہ کر اُن کے دلوں کی دھڑکن کو تیز سے تیز تر کر دیتی تھیں۔

مندا کنی کے مندر میں پہنچنے سے پہلے ہی بھگوان سے زیادہ اس کے بھگتوں کی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اُس دن بھی زیادہ دیر نہیں ناچ سکی۔ ادھر کئی دنوں سے وہ جیسے کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ جیسے وہ جلد سے جلد اپنا کام ختم کر کے تنہائی ڈھونڈتی محسوس ہوتی تھی۔

ناچ ختم ہوا۔ تماشائی اداس دلوں اور تھکتے قدموں کے ساتھ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ مندا کنی پجاری سے اپنا پرشاد لے کر [illegible]

Lipton's
Flowery Orange
Pekoe
LIPTONS
لپٹن
کے معنی
عمدہ چائے

وہ ان کو چائے پسند ہے ... مگر وہ نہیں جانتے اچھی چائے کیا شئے ہے کیسے جان ہی سکتے ہیں! کیونکہ دودھ چائے پلھچی ہی میں ملا دیتے ہیں

اور ڈھالنے کے پہلے ہی خراب ہو جاتی ہے۔ اچھی چائے کے لئے ضروری ہے کہ دودھ پیالی میں ملائی جائے نہ کہ چائے پلھچی میں یہ

لاکھوں آدمی چائے سے خوش اور مفرح ہونے کی اُمید رکھتے ہیں۔ کسقدر افسوس کی بات ہے کہ کثیر تعداد میں چائے پینے والے نہیں جانتے کہ اچھی چائے کیا شئے ہے۔ اچھی چائے بنانے میں خرچ زیادہ نہیں ہوتا محض پانچ آسان اُصولوں کے پابندی کا نتیجہ ہے۔ اپنے پیسے کا ٹھیک فائدہ اٹھانے کے لئے اور اپنے چائے کے پورے خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان اُصولوں کو زبانی یاد کر لیجئے اور خیال رکھئے کہ گھر میں ان پر ہمیشہ عمل ہوتا رہے۔

"پرل اور بکی دونوں کو اسی نے سٹیٹ آفس میں ٹائپسٹ کی جگہ دلوائی تھی ——"

ایوا نے بیٹھے بیٹھے شدید بے چینی کا احساس کیا، جیسے نیچے پڑا ہوا سٹول اُس کے جسم میں گھسا جا رہا ہو۔ سٹول کی سختی محسوس کر کے اُس کے چہرے پر سے چمک غائب ہو رہی تھی۔ وہ کروٹ بدل کر سیدھی ہو بیٹھی۔ اور اچانک اُس کے اندر ایک قہقہہ لگانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ اس قہقہے کی گونج اُس کے ذہن نے پیش از وقت محسوس کی، اور اُس میں جوزف کا ستا ہوا چہرہ اور حقارت آمیز لب و لہجہ سب گم ہو گئے۔ چکر کھاتے ہوئے دکھائی دیئے اور دھپ سے کوئی اندر آ گھسا۔ گھبرایا ہوا —— تیز تیز ——!

"اوہ! ——" ایوا جوزف کو دیکھ کر چونک پڑی۔ جوزف ایک نظر برن کو دیکھ کر ایوا کی طرف بڑھا —— "ہیلو —— یہ تم ہو ایوا۔ **Charming** [illegible] ایوا مجھے افسوس ہے کہ سکول سے تمہیں ساتھ نہ لے جا سکا۔ مجھے بہت جلدی تھی۔ امید ہے تم نے مجھے معاف کر دیا ہو گا۔ ڈیئر برن! تم اِسے کہو، کہ معاف کر دے!"

وہ برن کی طرف دیکھ کر ایک کھسیانی ہنسی ہنسا۔ ایوا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا سہما سہما دل —— سسکتا ہوا دل —— اُبلنے لگا۔ تحقیر کے پھوڑے پھر جاگ اُٹھے۔ اور جیسے کسی نے راکھ کے ڈھیر میں زور سے پھونک مار دی ہو اور دبی ہوئی چنگاریاں سُلگ پڑی ہوں اور جیسے کسی نے اُسے سڑک کے کنارے پڑے اور سسکتے ہوئے دیکھ کر پچکارنے کی کوشش کی ہو، اور وہ بھڑک اُٹھی ہو۔ وہ اپنی کتابیں بغل میں دبا کر باہر جاتے ہوئے بولی۔ "برن —— میں گھر جا رہی ہوں"

اور جلدی جلدی پیر مارتی —— باہر نکل گئی۔ برن ٹیلیفون چھوڑ کر جوزف کی طرف متعجب نگاہوں سے دیکھنے لگی +

"بیسویں صدی" میں ۲۰۴ اور بوگس ٹائپ کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے، جن کا مقصد محض خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ قارئینِ "بیسویں صدی" سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ ریڈنگ میٹر پیش کرنے کے لئے پانچ سو روپیہ ماہوار یعنی چھ ہزار روپیہ سالانہ کے اشتہار گذشتہ چھ سال سے بند کر رکھے ہیں۔ "بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہارات کا پلندہ نہیں بنایا۔ باوجودیکہ اشتہارات کی آمدنی ایسا ٹھوس منافع ہے، جس سے اخبارات و رسائل مالا مال ہو رہے ہیں۔ مگر ہمارے پیشِ نظر ذاتی اغراض سے زیادہ ہمیشہ ناظرین کا مفاد ہے۔ "بیسویں صدی" کی اس جسارت کو دیکھتے ہوئے ہمارے سرپرستوں کا بھی فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنی خریداری کو جاری رکھیں، بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں "بیسویں صدی" کی توسیع اشاعت کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ یہ حقیقت آپ سے پوشیدہ نہیں کہ "بیسویں صدی" میں آٹھ آٹھ روپے سالانہ چندہ والے رسائل سے بھی زیادہ مضامین ہوتے ہیں (مینیجر)

تشنۂ تمنا

محترمہ نسیمہ سوز

برسات کی یہ کتنی مسرور گھٹائیں ہیں
کوئل کی صدائیں ہیں، بلبل کی نوائیں ہیں
اور نکہتِ شادانی سے معمور ہوائیں ہیں
میں ہوں دلِ محزوں ہے اور لب پہ دعائیں ہیں
دنیا کی تمنائیں، سب دل میں سمٹ آئیں

مہتاب سرِ گردوں جس وقت نکلتا ہے
جب ساری فضاؤں پر اک نور برستا ہے
اُس وقت مسرت سے ہر ذرہ چمکتا ہے
ارمان مچلتے ہیں، اور لب پہ یہ ہوتا ہے
دنیا کی تمنائیں، سب دل میں سمٹ آئیں

اک وادیٔ رنگیں کی پُرکیف فضائیں ہیں
فردوسِ بریں کی یاں شاید کہ ہوائیں ہیں
اک خوگرِ ارماں ہے، اور اُس کی دعائیں ہیں
صحرا کی خموشی میں بے تاب صدائیں ہیں
دنیا کی تمنائیں، سب دل میں سمٹ آئیں

ڈارلنگ کا تخاطب سُن کر اِیوا کے ذہنی تار جھنجھنا گئے، اور برَن بولتی رہی۔ —

"بہت شریر ہو گئے ہو — دیکھو بہت دِق نہ کرو۔ Please!

— ہاں شام کو Her seek کرنے ضرور آؤں گی — کیا؟ ہاں بہتر تو تھا کہ تم صرف دو دِن کے لئے رُک جاتے — ہاں حسرت تو دل میں رہ جائے گی۔ اِس میں کیا شک ہے — ہاں ڈیئر — میں جانتی ہوں کہ تم مجبور ہو۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں بھی تو مجبور ہوں — کیا وہاں نہیں ملی؟"

برَن ہنس پڑی — "نہیں ڈیئر میں آج کوئی انتظام نہیں کر سکتی — ارے گھبرانے کیوں لگے؟ کیا میں تمہیں جانتی نہیں ہوں؟"

وہ پھر ہنسی اور شوخ نگاہوں سے اِیوا کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اچانک مُڑی اور رچینگے پر جھک گئی — "ارے سنو! ہیلو — ہیلو!

— Gone"

وہ پونڈ پر نمبر ملاتے ہوئے اِیوا کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اِیوا — ! ایک کام کرو گی؟"

"کیا؟"

اتنے میں اُسے نمبر مِل گیا اور وہ بولی — "ہیلو! ہاں میں بول رہی ہوں — برَن! — کہو تو نہیں بلاتی —؟" وہ ہنس پڑی۔ "ابھی کچھ دیر انتظار کرو — ہاں پھر بلاؤں گی — دیکھو کچھ تو کرتی ہوں — ہاں بالکل بالکل — اوہ — No mention — میں پوچھتی ہوں —"

وہ ٹیلیفون چھوڑ کر اِیوا کی طرف گھوم گئی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "میرا ایک دوست — بہت گہرا دوست! آج شام کو براذیل جا رہا ہے۔ وہ وہاں جانے والے Embassy کے سٹاف میں منتخب ہوا ہے۔ چونکہ سمندر پار جانے کا اُس کا پہلا موقعہ ہے، اِس لئے وہ بہت خوش ہے۔ اِس قدر خوش کہ اُس کی مسرت کا صحیح اندازہ ہم آپ دُور بیٹھ کر نہیں کر سکتے۔ لیکن میں اُس کی خوشیوں میں مجبوراً حصّہ نہیں لے سکتی۔ کیونکہ —" وہ یک لخت سنجیدہ اور دوسرے لمحے پھر شوخ ہو گئی۔ "کیا کروں آج صبح آگرہ سے وکٹ آیا ہوا ہے۔ جوزف کے پاس آج کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں ہی۔ وہ کئی جگہ گیا ہے۔ لیکن کام کہیں نہیں بنا۔ اگر تم وہاں میری جگہ جا سکو، تو اُس کا ہندوستان سے روانگی کا دن بہت ہی رنگین کٹ جائے گا۔ بہت ہی شاندار — ! بہت ہی دلچسپ! وہ خود بہت دلچسپ ہے۔ اُس کی ہر بات دلچسپ اور پیاری ہے۔ تم اُسے دیکھتے ہی شاد ہو جاؤ گی اور اُمید ہے ہندوستان سے جانے سے پہلے وہ اپنے بہترین تحائف تمہاری نذر کر جائے گا۔ کہو تو اُسے ٹیلیفون پر اطلاع دے دوں کہ تم اُس کے پاس آ رہی ہو — یا وہ ہی خود آ کر تمہیں یہاں سے لے جائے؟"

اِیوا کا دل دھڑکنے لگا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ گھبرا کر بولی "لیکن میں اُسے جانتی بھی نہیں، اور پاپا نے سخت تاکید کر رکھی ہے۔ میں کسی سے نہیں ملا کرتی۔ تم جانتی تو ہو —!"

"او ڈیئر اِیوا — میں سب کچھ جانتی ہوں اور نادم ہوں کہ تم سے تمہارا اصول تڑوا رہی ہوں۔ لیکن میری خاطر — وہ میرا بہترین دوست ہے! یقیناً وہ بہت خوش ہو گا۔ تمہارا دوست بن جائے گا۔ پھر ہندوستان میں جب بھی آئے گا تمہیں ضرور ملے گا۔ شاید تمہیں وہاں اپنے پاس بھی بُلا لے۔ قسمت کی بات ہے ڈیئر! چانس بڑی چیز ہے۔ میری وکٹ کے ساتھ Engagement نہ ہوتی تو میں اُس کے پاس ضرور چلی جاتی، اور وکٹ میرا منگیتر ہے۔ تم جانتی ہو!"

اِیوا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں زور سے چٹخائیں۔ پھر جیسے کوئی فیصلہ نہ کر سکتے ہوئے اُس کی طرف پھیکی ہنسی ہنس کر دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک بیچارگی سی ٹپک رہی تھی۔

"اچھا تو میں اُسے اطلاع دیئے دیتی ہوں۔"

اِیوا نے ہاں یا نہ کہنے کی بجائے محض مسکرا دینے پر ہی اکتفا کی۔ اور جب برَن اطلاع دینے کے بعد اُسے میری اچھی اِیوا کہہ کر — پھر ٹیلیفون پر جھک گئی۔ تو وہ برَن کا ہینڈ بیگ اُٹھا کر شیشے میں سے اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ بالوں کو درست کیا۔ گالوں پر پاؤڈر کی ہلکی سی ایک لال تہ بٹھا دی اور ہونٹوں کو تازہ زخم کی طرح سرخ کر لیا، اور پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اُس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ برَن تھوڑی سی فرصت بھی پاتی تو کہنے لگتی۔ "کوئی لڑکی آج تک اُس سے مایوس نہیں ہوئی —"

"تحائف سے وہ لڑکیوں کو لاد دیتا ہے —!"

"میرے پاس اُس کی یادگار کے طور پر اُس کی دی ہوئی ایک سنہری دست واچ ہے —"

"اور یہ پارکر قلم بھی اُسی کا دیا ہوا ہے —"

"میری بہن کو اُس نے پار سال سائیکل لے دیا تھا —"

اُس کی ماں اور پاپا اُس کی کتنی خبرداری اور احتیاط رکھتے تھے:
کسی ہندوستانی چھوکرے کی طرف بڑھنے کی اُس کو اجازت نہیں تھی۔
داڑھی والے بنگالی کلدیپ سے صرف ایک بار ملنے کے بعد ہی اُس سے جُدا
ہوگئی تھی۔ اور جوزف: جیسے ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا، ایسی بات کی تو
تہذیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ تہذیب جس میں بیسویں صدی کی
روح گھلی ہوئی تھی، اور ایسی آزادی جس میں چھبیسویں صدی کی آمد کے آثار
تھے، اِسے کو برداشت کرنے کو ہرگز تیار نہ تھی۔ عورت کا احترام! آہ ایک
نوجوان عورت کا احترام!——کس قدر تحقیر آمیز! ذلّت آمیز! نفرت ہی
نفرت! جیسے ایک بھرپور طمانچہ! گویا ایک غلیظ تھوک!! آف——
چلتے ہوئے اُس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ بلک بلک کر رو رہا تھا، چیخ
رہا تھا، احتجاج کر رہا تھا۔ آنکھوں میں غم واندوہ کا ایک بے پایاں
سمندر موجزن تھا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹ گہری چوٹ کی غمازی کرتے تھے۔
بسورتی ہوئی آنکھیں کرب ناک سسکیوں کی ترجمانی کرتی تھیں اور اُس کے
بے دلی سے پڑتے ہوئے پاؤں ایک شدید بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ جوزف
کی سرد مہری نے اُس کے دل پر اس قدر گہرا چرکا لگایا تھا کہ وہ ایک ٹھوکر میں
ہر اُس شخص کو فنا کر دینے کی آرزو کر رہی تھی جو اُس کی طرف دیکھتے ہوئے گزر
رہا تھا اور اُس کو بھی جو اُس کی طرف نہیں دیکھتا جا رہا تھا۔ اسے ہر شخص
سے نفرت ہوگئی تھی۔ اپنے آپ سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے
جسم کو کسی کار کے آگے ڈال کر کچل دے۔ یونہی سڑک پر پھینک دے——
اس جسم کو جو نفرت کی ایک بے پناہ آگ میں سُلگ رہا تھا۔ جل رہا تھا جس
میں کوئی خوبی نہ تھی۔ کوئی کشش نہ رکھتا تھا، جسے جوزف نے ساتھ لے
جانا گوارا نہ کیا تھا—— کمینہ!—— رذیل!! اُس نے اپنی ٹانگوں پر نظر
ڈالی تو ایک عجیب بے ڈھنگے پن کا احساس ہوا۔ مریل سی ٹانگوں پر اُس
نے ریشمی جرابوں کا غلاف سا چڑھا رکھا تھا۔ اُبھرے ہوئے سینے کو——
بٹھا جاتا دونوں ہاتھوں سے پیٹ لے۔ ہندوستانی عورتوں کی طرح۔
—— جب کوئی مر جاتا ہے۔ تو وہ کس شدّت سے سینہ کوبی
کرتی ہیں۔ اُس کے اندر کی عورت جو تھوڑی دیر پہلے تک زندہ تھی ہیجان تھی
اور خوبصورت تھی، اور ابھی ابھی مر گئی تھی، اُسے پہاڑ سے اُٹھا کر بہت
نیچے پتھریلی چٹانوں پر پٹخ دیا گیا تھا۔ پٹڑی پولیٹی اور کراہتی ہوئی نیم عریاں
بھکارن کو دیکھ کر اُس کا جی اُس کے ساتھ لیٹ جانے کو چاہا۔ اُس بھکارن
کا بے رونق اُبھرا ہوا سینہ سڑے ہوئے پھلوں کی طرح خاموش اور
داغدار تھا۔ آنکھیں بجھی ہوئی قندیلوں کی مانند ٹمٹما رہی تھیں جن میں
سے تیل ختم ہوگیا ہو۔ ہونٹ پرانے پھوڑوں کی طرح پک گئے تھے۔ اُس
کے جسم میں انسانی ذہن کے لئے کوئی کشش نہ تھی، کوئی خوبی نہ تھی۔ وہ
بھی اپنے کپڑے نوچ کر پڑھاتے جسم کو ننگا ہو جانے دے، تاکہ لوگوں کی
نگاہیں پڑ پڑ کر ایک دن اُس کے خوبصورت سینے کے ابھار—— گداز
جسم۔ سرخ ہونٹوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں میں کشش اور جاذبیت کی
کوئی قدر زندہ نہ رہے گی۔ ایک ایک کر کے سب مر جائیں گی! سب ختم
ہو جائیں گی۔

چلتے چلتے تمام راستہ اُس کا دل کراہتا ہی رہا۔ اندر ہی اندر
گھٹتا ہوا۔ دبا اور سہما ہوا—— جنرل پوسٹ آفس کے قریب پہنچ
کر اُس نے بس پکڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور دشوانا تھ بھوپندرا ناتھ روڈ
کو عبور کر کے وہ ٹیلی فون گھر میں جا گھسی۔ وہاں اُس کی ایک دوست مس
برَن کام کرتی تھی۔ اُس کے پاس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذارنے کے خیال سے
ادھر چلی آئی۔ اتنی دیر تک پاپا بھی ورکشاپ جا چکے ہوں گے اور پھر وہ
گھر چلی جائے گی۔

حسب توقع برَن ڈیوٹی پر تھی۔ سرخ رنگ کے گون میں وہ آج بہت
بھلی اور شوخ معلوم ہو رہی تھی۔ کتنی دیر تک وہ چپ چاپ اُس کے پاس
سٹول پر بیٹھی رہی۔ برَن ٹیلیفون کا چونگا کانوں اور منہ سے لگائے
ہر طرف سے آنے والی آوازوں کا جواب دینے میں مصروف تھی۔ اُس
نے یہ خاموشی مشکل برداشت کی۔ دل برداشتہ تو وہ پہلے سے ہی تھی۔
اب برَن کی مصروفیت دیکھ کر اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے یہاں
آکر غلطی کی۔ جی چاہتا تھا کہ اُٹھ کر چلی جائے۔ برَن اُس کے چہرے کے
آثار بھانپ گئی۔ اور ذرا سی مہلت پا کر سانپ کے پھن کی طرح رکھے
ہوئے منہ کو ٹیلیفون پر سے اُٹھایا اور مسکرا کر بولی "معاف کرنا ایلا! ابھی
دس منٹ میں میری ڈیوٹی تمام ہوا چاہتی ہے۔ پھر میں تمام دن تمہارے
لئے خالی ہوں"!

یہ کہہ کر اُس نے پھر منہ گھمایا اور چونگے پر بولنے لگی—— "ہیلو!
—— نمبر فائیو تھری!—— یس! یس!! ہیلو wrong number
—— ہیلو!—— یس —— 7459 —— یس 7134 —— یس
ہیلو—— Sorry Engaged —— ہیلو —— Shut up!
ہیلو!—— ہیلو!! ڈارلنگ تم ہو کیا کہا؟—— اچھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اُس شام کو ٹہلتے ٹہلتے ہم کافی دُور چلے گئے تھے۔ تھک کر ندی کے کنارے پڑی ہوئی چٹان پر بیٹھ گئے۔

ہلکے نیلے بادل روپہلی کناریاں چمکاتے آسمان پر تیر رہے تھے۔ اُن کے سائے ندی کے شفاف پانی پر تھرکتے پھر رہے تھے۔ اور میں پریما کی آنکھوں میں عمر خیام کا جام، شراب، ساقی، غرض پورا میخانہ دیکھ رہا تھا۔ وہ ہلکی گلابی رنگ کی شلوار، سبز رنگ کی چست قمیص اور باریک فیروزی اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھی۔ اُس کی کمان سی بھوئیں، کانوں میں جھولتے ہوئے نیلے بُندے، اُس پر جمی ہوئی میری نظر کسی طرح ہٹنا نہیں چاہتی تھی، جیسے کسی فن کار نے کوئی ماڈل سجا کر رکھ دیا ہو۔

یکایک ہوا چلی۔ بادلوں کی ٹولیاں حرکت میں آئیں اور پھواریں پڑنے لگیں۔ ہم اُٹھ کر گھر کی طرف چل پڑے۔ بارش زور پکڑ گئی۔ آس پاس بچاؤ کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ہم لوگ بھاگتے بھاگتے بھی چند ہی قدم چل کر بُری طرح بھیگ گئے۔ پریما تو اپنی چپکی ہوئی ریشمی شلوار اور چست قمیص میں قریب قریب ننگی سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جھنجھلا رہی تھی، اور مجھ پر مدہوش کُن نشہ سا طاری تھا۔

راستے میں ایک نالی پڑتی تھی، جو پانی کے تیز بہاؤ سے کٹ کر اب اور چوڑی ہوگئی تھی۔ میں تو اُسے پھاند گیا۔ پریما کو اُس کی بھیگی ہوئی شلوار نے اُسے پھاندنے کی کوششوں میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ ایک مرتبہ میری طرف دیکھ کر ہنسی اور پھر بھیگے ہوئے کپڑوں میں سے اپنے اعضا کا جھلکنا دیکھ کر جھینپ مٹانے کے لئے بالوں سے گال پر بہتا ہوا پانی پونچھتی ہوئی ٹھٹک کر بولی: "ہوں اوں۔ خود تو پھاند گئے اور مجھے ——!"

میں نے ہنسی دبا کر کہا: "ایک کوشش اور کر دیکھو۔ پار ہو گئیں تو بہتر ورنہ میں نالی میں سے نکال لوں گا۔"

"ہٹئے آپ تو ہر وقت مذاق کرتے ہیں ——!" وہ سینے پر چپکی ہوئی قمیص کو ہٹانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی تنک کر بولی۔

"تو کیا حکم ہے ——؟ گود میں اُٹھا کر پار کر دوں ——؟" میں نے اُس کی حالت اور بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"معاف کیجئے، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔" وہ جھینپتی ہوئی بولی۔ "آپ زحمت نہ کریں، میں کسی نہ کسی طرح آ ہی جاؤں گی ——!"

بہت کچھ سمجھانے پر وہ اس قدر رضا مند ہوگئی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ پکڑ لوں اور وہ کود کر اس پار آ جائے۔ اوّل تو زمین چکنی تھی۔ دوسرے میرے ہاتھ میں ہاتھ آتے ہی اُس کا سارا جسم بید کی طرح لرزنے لگا تھا۔ گھبراہٹ کی حالت میں اُس نے قدم جمائے بغیر ہی چھلانگ لگا دی۔ ساتھ ہی اُس کا پاؤں پھسلا اور ہم دونوں کے ہاتھ بیک وقت ایک دوسرے کے کندھوں پر جا پڑے۔ ایک لمحہ کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے میں پیوست سے ہو گئے۔ اور وہی لمحات میری زندگی کا حاصل بن کر رہ گئے۔ جھم جھم برسات۔ بھیگے بھیگے ریشمی کپڑے۔ ستار کے تاروں کی طرح لرزتی ہوئی پریما۔ اور میری تشنہ آغوش۔ بس یوں سمجھئے کہ "جوانی کی آغوش میں تھی جوانی"۔ میں اپنے اور پریما کے سوا سب کچھ بھول گیا تھا۔ پریما بھی جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ لیکن یکایک جیسے کسی نے چٹکی بھری ہو، وہ بجلی کی طرح تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے قدموں پر نگاہیں گاڑے شدتِ احساس سے کانپتے رہے۔ اُس وقت شاید پاس سے گذرنے والا بھی ہم دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں صاف سُن اور سمجھ سکتا تھا۔ پھر جیسے وہ گہرے نشے سے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل پڑی۔ میں بھی خاموش اُس کے ساتھ ساتھ لڑھکنے لگا۔ گھر پہنچ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ہماری جھینپی ہوئی نگاہیں رخصتی پیغام دینے کے لئے ایک دوسرے کی طرف نہ اُٹھ سکیں۔

سُکھ کے دن مُشکل سے آتے ہیں اور آسانی سے چلے جاتے ہیں۔ رات بھر رنگین خواب نظر آتے رہے۔ صبح میں خوشی کی آغوش میں جھولتا ہوا بیدار ہوا۔ در و دیوار سے مجھے سہانے گیت سُنائی دے رہے تھے۔ اُس وقت بھی جیسے میری باہوں سے پریما کی دوشیزگی کی مخمور کُن خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ لیکن ڈاکئے نے صرف ایک لفافہ دے کر میرا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ اور میری بسی بسائی رنگین خوابوں کی دُنیا اُجاڑ کر رکھ دی۔ مجھے فوراً جالندھر چھاؤنی پہنچ جانے کا حکم ملا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا دماغ سُن ہو گیا ہے۔ اُس وقت مجھے پریما کی جدائی سے موت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

قبل اِس کے ہوا بازی، دیس دیس کی سیر، بمباری کا کھیل اور آفیسری ہی میری ساری خوشیوں کا مرکز تھی۔ لیکن اب تو سارے حوصلے اور شوق اور ساری آرزوئیں اور تمنّائیں پریما کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ مگر میں بے بس تھا۔ پانی بھر چکا تھا۔

اپنے اندر ایک خاص قسم کی کشش محسوس کرنے لگا۔

نہ جانے پہاڑی نوکر اور جاہل بادرچی سے سرمارتے مارتے یا کسی اور وجہ سے بھابی نے دو منٹ دو گھنٹے بنا دیئے۔ میں پریما سے باتیں کرنے لگا۔ یعنی باتیں کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنے لگا۔ پہلے وہ خاموشی میں جواب دیتی رہی۔ پھر سر ہلا کر، اور پھر دبے دبے ایک دو لفظوں میں یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اُس کی شرم کا گھونگھٹ سرکنے لگا۔ حیا سے جھکی ہوئی پلکیں آہستہ آہستہ اُٹھنے لگیں۔ گالوں پر چھایا گہرا گلابی رنگ ہلکا ہونے لگا۔ اور ایک ہونٹوں کے بیچ میں دبی ہوئی مسکراہٹ اور آواز باہر آنے لگی جیسے آدھ کھلا کنول نسیم صبح کی گدگدیوں سے دھیرے دھیرے پنکھڑیاں پھیلانے لگا ہو۔

کبھی کبھی اُس کی میٹھی مسکراہٹ اس طرح نقرئی کھنکھناہٹ بن کر پھوٹ پڑتی جیسے چاندنی رات میں دور آنے والے قافلے کی گھنٹیاں بج رہی ہوں یا جیسے کھول کر رکھے ہوئے ستار کے تار جھٹکے سے آنے والے ہوا کے جھونکے کے ساتھ آہستہ سے گنگنا اُٹھے ہوں۔

یکایک اپنی سُریلی کھلکھلاہٹ سے ہمیں دانستہ ہوشیار کرتی ہوئی بھابی کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں "معاف کرنا بھئی مجھے ذرا دیر ہوگئی" پھر اپنی فطرت کے مطابق چُٹکی لیتی ہوئی بولیں "اور تم لوگوں کو تو شاید یہ بھی یقین نہ ہو کہ دس بج گئے ہیں۔ اور پریما کی بھابی کا بھیجا ہوا نوکر دوبارہ آکر واپس جا چکا ہے۔ کیونکہ تم لوگ اس لوک میں تو تھے نہیں ــــ!"

پریما گھبرائی اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بھابی نے جانے کس خیال سے کہا۔ "دیور بابو! اپنے اخلاق سے تو کام لو کر ان کو اپنے باغ کے گیٹ تک رخصت کر آؤ ــــ!"

مجھ کو اس خوشگوار فرض کی ادائگی میں کیا تامل ہو سکتا تھا؟ پریما بھی کچھ نہیں بولی۔ جیسے بھابی نے اُس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رخصت ہونے لگی تو ایک ملتجیانہ نگاہ مجھ پر ڈال کر جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ بولی۔ آج شام کی چائے میرے ہاں پیجئے گا۔ پاپا آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ دیکھئے آپ نے گا منز....... پھر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے گھنی پلکیں ایک بار پھر اُٹھیں۔ اور بولی۔ "نمستے"!

میں نے بھی ہاتھ جوڑتے ہوئے نمستے کا جواب دے کر کہا: "آپ کے ہاں حاضری میری عین خوش قسمتی ہوگی"۔

میں پریما کو دل و دماغ میں لئے اور اُسی کے تصور میں کھویا ہوا کمرے میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ بھابی نے پوچھا۔ "کہئے دیور بابو! میری سہیلی پسند آئی آپ کو ــــ؟"

"جی ہاں ــــ آئیں ــــ؟ جی نہیں ــــ!" خود فراموشی کے عالم میں میرے منہ سے نکل گیا۔

"اوہو ــــ یہ از خود رفتگی؟" بھابی نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی اُن کے زوردار قہقہے سے کمرہ گونج اُٹھا۔ میں جھینپ گیا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُس دن میرا سب کچھ پریما کا ہو کر رہ گیا۔ دوستوں سے خط و کتابت، ملنا جلنا، سیر و تفریح۔ سب کچھ میں بھول سا گیا۔ رنگین سپنے، رُوح پرور تصورات، زندگی بخش و سرور انگیز خیالات، سُنہری امیدیں سب کا مرکز پریما اور صرف پریما ہی بن گئی تھی۔ اُس سے علیحدہ ہوتے ہی جیسے میں خود سے بھی دُور جا پڑتا تھا۔ غرض میری ساری دُنیا سمٹ کر پریما بن گئی تھی۔

اکثر محسوس ہوتا جیسے دن بہت چھوٹے اور راتیں حد سے زیادہ لمبی ہوتی جارہی ہیں۔ کیونکہ راتیں صبح کے انتظار میں پہاڑ ہو جاتیں، اور دن کبھی اپنی اور کبھی پریما کی کوٹھی کے باغ میں کسی سایہ دار درخت کی چھاؤں یا کسی گھنی جھاڑی اور کنج میں بیٹھ کر پریما کے ساتھ نہ ختم ہونے والی باتوں میں ختم ہو جاتا۔ شام کو ساتھ ساتھ ندی کے کنارے کنارے دُور تک ٹہلتے چلے جاتے۔ یا چھوٹی سی کشتی لے کر آہستہ آہستہ ہلکی ہلکی لہروں پر جھولتے رہتے۔ کبھی کبھی سینما کا کوئی شو بھی دیکھ آتے۔ ہماری ضد پر کبھی بھابی بھی ساتھ ہو لیتیں، ورنہ زیادہ تر گھر گرہستی کی آڑ لے کر ہم سے معافی ہی مانگ لیتیں۔

بھائی صاحب ابھی دورے سے واپس نہیں آئے تھے اور ہم اس آزادی کا پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ جھیل کے پُرسکون پانی کی طرح دن گذرتے رہے۔

پریما نے میری زندگی میں داخل ہو کر ایک حیات پرور انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ میرے ارد گرد ہر آن دل گداز آرزوؤں اور جذبات آفرین خوابوں کی نرم لہریں تیرتی اور اٹھلاتی رہتیں۔ میں مسکراہٹ آمیز خواب لئے سوتا اور خمار آلود بیداری لئے جاگتا۔ ہر آن پریما میری آنکھوں میں رہتی۔

بنا رکھئے، لیکن ٹوسٹ پر مکھن میں لگا دوں گا۔ آپ میرے ساتھ ہمیشہ بلیک مارکیٹنگ کرتی ہیں۔۔۔!"

"کنٹرولنگ آفیسر کی بیوی جو ہوں۔۔۔!" بھابی نے فوراً جواب دیا۔
میں تولیے سے منہ پونچھتا۔ گنگناتا ہوا باہر نکل رہا تھا کہ ؎

تھک گئے ہم کرتے کرتے انتظار
اک قیامت تیرا آنا ہو گیا!

"آئیے آئیے۔۔۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ تھکن دور ہو جائے گی۔ دیکھئے وہ آ گئیں جن کا انتظار کرتے کرتے آپ تھک گئے ہیں۔ شب فرقت تو گذر گئی، صبح امید مبارک ہو۔۔۔!" کہہ کر بھابی نے ایک قہقہہ جھاڑ دیا۔

بھابی کے قہقہے میں ملی جلی ایک باریک اور دبی دبی نقرئی کھلکھلاہٹ سن کر میں نے منہ پر سے تولیہ ہٹایا تو ایک لمحہ کے لئے سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ دوسرے لمحے میری چھچھلتی ہوئی سی نظریں ایک اجنبی چہرے پر جا گریں جس کی گرمیٔ شباب سے دل دھڑدھڑ کرنے لگا اور اعضا کانپ اٹھے۔ انگارے کا سا رنگ۔ چودھویں کے چاند سی نورانی پیشانی، کمان سی گھنی بھنویں۔ جوانی کے نشے سے مخمور آنکھیں۔ میری نگاہوں کی اچانک چوٹ سے تلملائے ہوئے سرخ گال، ان پر گھونگھریالے بالوں کی لٹوں کا قربان ہونا اُف.....
سینے پر پڑی ہوئی ریشم کی گلابی اوڑھنی کے نیچے دبے دبے دو ابھار، جن کا زیر و بم سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی موٹی موٹی دو سیاہ زلفوں کی نگرانی میں میری بے باک نگاہی پر حس بنا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے کی ہر چیز پر حسن اور جوانی چھا گئی ہو۔

بھابی نے میری محویت توڑی "بس بھی کرو۔۔۔ کیا میری سہیلی کو آنکھوں میں ہی جذب کر کے دم لو گے۔۔۔؟" پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "اچھا۔۔۔ تم تو ایسی سہمی جا رہی ہو جیسے پہلی رات میں تمہارا دولہا کمرے میں داخل ہوا ہو۔ ارے ان سے کیا شرمانا۔ یہ تو۔۔۔!" پھر سنبھل کر بیٹھتی ہوئی بولیں "نہیں۔۔۔ ٹھہرو۔ باقاعدہ تعارف ہی کرا دوں۔ یہ ہیں مسٹر اشوک، ہمارے دیور بابو۔ جو تصور کی اڑان بھرتے بھرتے تھک کر اب ہوا میں اڑنے کا خواب دیکھنے لگے ہیں۔ اور آپ ہیں مس پریما ماتھر۔ فی الحال پڑوس کے بیرسٹر صاحب کی نور نظر اور جلد ہی کسی نہ کسی کی ہونے والی سکون قلب و جگر۔ اس سال میٹرک کا امتحان پاس کر کے نئے جھگڑے میں پڑ گئی ہیں۔ ان کو شوق ہے کہ کالج میں داخل ہو کر حسن میں علم سے مزید چار چاند لگاتے جائیں، اور ماتا پتا جی کو فکر ہے کہ اس حسن د
شباب کی دیوی کو کسی سچے پرستار کے حوالے کر کے مطمئن ہو جائیں۔!" اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"تو میں ماتا جی سے کب اور کہاں ملوں۔۔؟" میں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ساتھ ہی "دھت" کی آواز کے ساتھ پریما لجا کر چھوئی موئی کی طرح سکڑ گئی اور بھابی ہنستی ہنستی اسی کے اوپر لوٹ گئیں۔

بھابی کی ہی بنائی ہوئی چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "لیجئے بھابی جان نوش فرمائیے۔ اور یہ لیجئے مس ماتھر! شکریہ پیچھے ادا کیجئے اور معافی کم ہو تو بعد میں مانگ لیجئے گا۔ صرف رشتے ہی کی مٹھائی پر اکتفا نہ کیجئے گا۔۔۔!"

پیالی تھامتے ہوئے اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ ساتھ ہی جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ وہ کانپ گئی۔ چائے چھلک پڑی۔

"ارے پریما۔۔۔ یہ کیا۔۔۔؟ تو تو اس طرح چونک پڑی جیسے انہوں نے ڈنک مار دیا ہو۔ دیکھو تو چائے چھلک گئی۔" بھابی نے چٹکی لی

"چھلکنے والی چیز چھلک ہی پڑتی ہے بھابی۔ اور۔۔۔ خاص کر جب لبریز ہو۔۔" پھر بات کا رخ بدلنے کے لئے میں نے تاسف آمیز انداز میں کہا۔ "مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ مس ماتھر کی ساری داغدار ہو گئی۔"

"خیر۔۔۔ تم ان سے باقاعدہ معافی مانگ لو۔ اور میں دو منٹ میں نوکر کو بازار کا کام سمجھا آؤں۔۔۔!" کہہ کر بھابی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی ہو گئیں

ساتھ ہی پریما کو بھی اٹھتے دیکھ کر بھابی پھر بول پڑیں۔ "ارے پریما، تم کہاں چلیں۔۔؟ تم اس قدر شرماتی کیوں ہو؟ میں تو دیکھتی ہوں کہ نہ تو تم اپنے خیال کے مطابق ابھی کالج ہی کے داخلے کے قابل ہو نہ ماتا جی کی تجویز کے مطابق شادی ہی کے لائق۔ دونوں کے لئے شرم تو تمہیں پہلے چھوڑنی ہی پڑے گی، اور میرے خیال میں اشوک بابو تمہیں دونوں کے متعلق مناسب رائے دے سکیں گے۔۔۔!" بھابی ہم پر آخری وار کرتی ہوئی کمرے سے باہر ہو گئیں اور پریما جھجک کر پھر بیٹھ گئی۔

میرے دل میں ایک لذت انگیز گدگدی سی ہونے لگی۔ حالانکہ اب تک لڑکیاں میرے لئے ہمیشہ ایک پہیلی رہیں۔ مکڑی کے جالے کی طرح الجھی ہوئی ان کی فطرت کبھی میری سمجھ میں نہ آسکی۔ لیکن اب تک جتنی لڑکیاں میری زندگی میں آچکی تھیں، ان سب سے پریما مجھے مختلف معلوم ہوئی اور میں اس کے لئے

دُور دیس

افسانہ

از

جناب رام چندر چیٹی بی۔ اے

جس طرح ساز پر اچانک کوئی وزنی چیز گر کر ایک بھیانک جھنکار کے ساتھ اکثر تاروں کو توڑ دیتی ہے جس کے بعد بچے ہوئے تاروں میں لرزش کی وجہ سے دیر تک جھنجھناہٹ ہوتی رہتی ہے۔ اُسی طرح غیر محسوس طور پر اچانک حادثہ رونما ہو کر ساری زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور پھر عمر بھر سکون خاطر نصیب نہیں ہوتا۔

کالی اور سنسان راتوں میں جب کیمپ کے باہر ٹہلتے ہوئے دماغ ماضی کی گُلپوشس اور رنگا رنگ وادیوں میں بھٹکنے لگتا تھا تو آنکھوں کے سامنے ایسے دلکش اور نظر فریب مناظر خاموش فلم کی طرح متحرک نظر آتے کہ کوشش کے باوجود میں اپنے کو اُس سہانے ماحول سے باہر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ اور نہ قریب ہی کے مورچوں پر گرجتی ہوئی توپوں اور بندوقوں کی چنگھاڑ اور سر کے اوپر منڈلاتے ہوئے طیاروں کی گھڑگھڑاہٹ اُس بیداری کے خواب میں مخل ہو سکتی تھی۔

اُس رات بھی تخیل کی پرواز پردۂ دماغ پر ماضی کی وہی شباب آور فلم پیش کر رہی تھی۔ آنکھیں اُس کی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی تھیں اور کان اُس کی سامعہ نواز نغمہ باریوں میں گم تھے۔ اتنے میں جیسے بہت دُور سے اردلی کی آواز سنائی دی "حضور! چائے رکھے ہی رکھے ٹھنڈی ہو گئی آپ نے اب تک ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کیا دوبارہ بنا کر لاؤں؟"

"اوہ —— تم چائے رکھ گئے تھے کیا——؟" میں نے چونک کر پوچھا

"جی ہاں —— دیر ہوئی۔ بلکہ اب تو کھانے کا وقت ہو گیا ——!"

نوکر نے ہاتھ باندھے ہوئے کہا "میں تو یہ بتانے حضور کو اطلاع کرنے آیا تھا ——!"

میں نے دیکھا، واقعی رات کافی جا چکی ہے اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ کچھ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اچھا..... چلو کھانا ہی لے آؤ..... بھوک تو ایسی کچھ ہے نہیں۔"

نوکر کے جاتے ہی گزرتے ہوئے دنوں اور بیتی ہوئی باتوں کی یاد نے مجھے پھر آ گھیرا۔ میں سوچنے لگا۔ کیا اس موت اور زندگی کی رزم گاہ اور آگ اور لوہے کی بارش میں بھی اُسے بھول نہ سکوں گا؟ اور ساتھ ہی ایک چہرہ آنکھوں کے سامنے اُبھرتا ہوا نظر آنے لگا۔ بھولا بھالا۔ چاند سا گول مول بڑی بڑی کنول سی آنکھیں، پھیلی پھیلی اور شوخ شوخ۔ کانوں میں جھولتے ہوئے بُندے، لمبی گردن اور سیب سے رخساروں پر بکھری ہوئی دو کالی کالی زلفیں پنکھڑی کی طرح نرم و نازک ہونٹوں پر برق آسا کھیلتی ہوئی مسکراہٹ لئے۔

اُترتے ہوئے ہوائی جہازوں کی گھڑگھڑاہٹ سے ایک ثانئے کے لئے خیالات کسی قدر منتشر ہو جاتے تھے لیکن مشتعل ہجوم کی طرح دوسرے ہی لمحے وہ پھر سمٹ آتے تھے۔ جانے کب نوکر کھانا رکھ کر کھڑا کھڑا چلا گیا۔ اور کھانے کا بھی وہی حشر ہوا جو چائے کا——

وسوخ اور قسمت نے کام کیا۔ کالج سے ڈگری حاصل کر کے نکلتے ہی ہوائی فوج میں کمیشن مل گیا۔ پوسٹنگ کا حکم آنے میں دیر تھی۔ خیال ہوا معلوم نہیں کہاں بھیج دیا جاؤں، اور پھر جانے کب موقع مل سکے۔ اس لئے بھائی صاحب کے ہاں چلا گیا۔ وہ دورے پر گئے ہوئے تھے۔ بنگلے میں تنہا بھابی تھیں میں رات گئے اُن کے یہاں پہنچا تھا۔ اس لئے کھانے کے بعد کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے جلد سو رہا۔ صبح میری چادر کھینچتے ہوئے ہنستے ہنستے گدگدی کر کے بھابی بولیں "اُٹھو بھی —— صبح ہو گئی۔ کیا کالج کی کوئی تیزی آنکھوں میں بند کئے پڑے ہو۔ جس کے اُڑ جانے کے ڈر سے آنکھیں کھولنا نہیں چاہتے؟"

"ناحق تنگ کرتی ہو بھابی —— ابھی صبح کہاں ہوئی؟" کہہ کر میں نے منہ کھول کر دیکھا، واقعی کافی دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کر کہا "مجھے کیا معلوم تھا کہ میری بھابی کے یہاں کی راتیں بھی میری بھابی ہی جیسی ننھی منی سی ہوتی ہیں۔ ابھی رات آئی تھی کہ صبح ہو گئی ——!"

"اچھا اچھا ——!" بھابی نے منہ چڑاتے ہوئے کہا "ہاتھ منہ دھو لو فقرے بازیاں کرنا" اور چائے بنانے لگیں۔

غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں ایک جملہ کہتا گیا۔ چائے تو خیر

نذرانہ

از جناب شمیم رائے بریلوی

اب کیا کہیئے کر بیٹھے ہیں کیوں ترکِ حرم و بتخانہ ہم
جس دن سے کسی نے اپنایا دنیا سے ہوئے بیگانہ ہم

پینے کا مزہ تھا اے ساقی، ہاتھوں سے ترے نظروں سے تری
جب تو ہی نہیں ہے پاس تو پھر کیا ہاتھ میں لیں پیمانہ ہم

جلتا نہیں دل اپنا ہی فقط، وہ بھی یونہی گھلتے رہتے ہیں
ہے سوزِ محبت دونوں طرف، وہ شمع ہیں اور پروانہ ہم

اک حسنِ مکمل کے جلوے آنکھوں میں ہیں اپنی نور افشاں
مڑ کر تری جانب کیا دیکھیں اے شمعِ درِ بت خانہ ہم

داغوں کے قمر پارے دل میں اشکوں کے ستارے آنکھوں میں
اے جانِ محبت اس کے سوا کیا لائیں ترا نذرانہ ہم

اے بادِ بہاری چھیڑ نہ کر مستی کا ہمیں پیغام نہ دے
بیٹھے ہیں غمِ ساقی میں لئے اشکوں سے بھرا پیمانہ ہم

دنیا کی کہانی کیا کہیئے دنیا کی حقیقت کچھ بھی نہیں
جس بزم کی زینت تھے کل تک ہیں آج وہیں افسانہ ہم

گلشن کے نظارے آہ شمیم اک وضع پہ قائم رہ نہ سکے
سنتے ہیں زبانِ غنچہ و گل سے روز نیا افسانہ ہم

آنچل

از جناب فرحت بہاری

بکھری ہوئی زلفوں سے سرکتا ہوا آنچل
اور مرمریں باہوں پہ ڈھلکتا ہوا آنچل

وہ وقتِ سحر آنکھوں میں پھیلی ہوئی کاجل
انگڑائیوں کے ساتھ وہ گرتا ہوا آنچل

بل کھائے ہوئے جسم پہ وہ ریشمی ململ
سینے کے زیر و بم سے پھسلتا ہوا آنچل

کنگن کی صداؤں میں کھنکتا ہوا پائل!
یا شیشۂ رنگیں سے چھلکتا ہوا آنچل

میں کیا کہوں اُف کس طرح کر دیتا ہے گھائل
پنگھٹ پہ وہ شوخی سے مچلتا ہوا آنچل

یہ عکسِ شفق اور یہ پانی کی روانی
یا بھیگی ہوئی ساری کا اُڑتا ہوا آنچل

مخمور نگاہوں میں یہ اٹھلاتی جوانی
اُبھرے ہوئے سینے پہ یہ گرتا ہوا آنچل

اُمڈے ہوئے جذبات سے تنتے ہوئے جل تھل
ارمانوں کی دنیا میں مچاتے ہوئے ہلچل!

رہتی تھی کہ میں آپ کے علاوہ اور کسی سے محبت نہیں کرتی ہوں ——
آخر ایک دن جب میں گھر آیا تو معلوم ہوا کہ ملکہ بیمار ہو گئی ہے۔ آثار بھی یہی تھے —— میں نے ملکہ کی پیشانی چھوئی تو وہ جل رہی تھی۔ ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ صرف بخار ہے، سفر سے تکان کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ بخار روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ ملکہ کی بیماری میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا، لیکن افاقہ کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میں ڈرتا تھا کہیں ملکہ مجھے تنہا نہ چھوڑ جائے —— گھر والوں کو ملکہ کی بیماری کی اطلاع دے دی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قیدی، ملکہ کو جانتا تھا اور ملکہ قیدی کو۔ یہ ایک راز ہے ایک لڑکی کا راز —— شاید ناکام محبت کا ایک راز ——
لیکن ملکہ مجھ سے بتا دیتی تو میں ناراض نہ ہوتا۔ وہ دل کا بوجھ کیوں نہیں ہلکا کر دیتی ہے؟ اپنی جان کیوں خطرے میں ڈال رہی ہے۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتے تھے کہ کوئی روحانی اور دلی صدمہ ہے، صدمہ پرانا معلوم ہوتا ہے جو ایک دم سے شدت کے ساتھ ابھر آیا ہے —— تین ماہ گذر گئے —— ملکہ اب اچھی ہو رہی تھی۔ ایک دن میں نے ملکہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا:۔

"ملکہ، تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ مجھے اس کا رنج ہے، تمہارا راز میرا راز ہے ملکہ! اگر تمہارے دل میں کوئی راز چھپا تھا تو مجھ سے کہا ہوتا۔ میں تمہاری مدد کرتا، لیکن تم دل میں لئے رہیں اور اندر ہی اندر گھلتی رہیں۔ میں تین مہینے سے پریشان ہوں۔ تم نے مجھے بہت اداس کر دیا ہے۔"

ملکہ ہنستی رہی، پھر چھت کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "میں معافی چاہتی ہوں ....."

"اب اور اداس نہ کرو، جو کچھ ہو چکا، جانے دو۔"

"لیکن میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہوئی۔"

"پروا نہ کرو۔ تمہارا دیا ہوا دکھ بھی میرے لئے سکھ ہے۔"

"آپ کتنے اچھے ہیں۔"

"کاش میں واقعی اچھا ہوتا۔"

اب ملکہ پہلے جیسی ہو گئی ہے۔ لیکن وہ بات جس نے اسے موت سے ہمکنار کر دیا تھا ملکہ کے دل میں ہے یا نہیں؟ یہ مجھے نہیں معلوم اور نہ میں وہ بات، وہ راز، وہ معمہ پوچھنا چاہتا ہوں

ایک دن اس طرف اشارہ کیا تھا تو ملکہ نے یہ جواب دیا تھا:۔

"کھوئی ہوئی چیز جو پاتا ہے وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہے اور جو کھوتا ہے وہ روتا ہے ——" بہت دور کی بات کہی تھی ملکہ نے ——
بہت گہری بات —— ! یہ تو مجھے یقین ہو گیا کہ ملکہ نے مجھ سے پہلے ایک مرتبہ اور بھی محبت کی تھی۔ کسی اور سے، شاید اسی قیدی سے —— ؟ لیکن ملکہ نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ کہا تھا —— وہ ایک پھول تھی جو اپنا دل چیر دیتا ہے لیکن اس پر بھی اپنا راز چمن میں کسی کو نہیں بتاتا —— ملکہ بھی ایک پھول تھی —— اور اس بات سے کبھی کبھی مجھے دکھ ہوتا ہے، پھول کو سونگھنے والا کانٹے کو بھول جاتا ہے، لیکن پھول کا بوسہ لیتے ہوئے کانٹا بھی چبھ جاتا ہے —— لیکن پھر دل کو یوں تسلی دیتا ہوں کہ جہاں پھول ہوتا ہے، وہیں کانٹا بھی ہوتا ہے۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں پھول سے محبت کرتا ہوں تو مجھے کانٹے کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ کانٹا اگر چبھتا ہے تو چبھنے دو، میں پھول کا بوسہ ضرور لوں گا —— ——
ملکہ میری زندگی کا پھول ہے —— مجھے کانٹے کا خیال نہیں کرنا چاہئے —— !

(طبع زاد)

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے ۱۔ حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمہ پر لفظ غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں اور یہ بے حد نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں، کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمہ پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔
۲۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انہیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کریں۔ پتہ ایڈیٹر رسالہ "بیسویں صدی" دہلی کافی ہے۔

افسانہ

پھول اور کانٹا

از

جناب اختر ملیح آبادی بی اے

گاڑی نے چیخ کر مجھے چونکا دیا تھا —— تیزی کے ساتھ گاڑی ایک طرف کو گھوم رہی تھی —— موڑ پر —— موڑ —— خطرناک — بھیانک —— ہر موڑ خطرناک اور ڈراؤنا ہوتا ہے —— اسی خطرے کے احساس سے شاید انجن چیختا تھا —— شاید ——؟

زندگی کے سفر میں بہت سے موڑ پڑتے ہیں۔ جگہ جگہ پر، قدم قدم پر، ہر لمحہ، ہر لحظہ —— زندگی شاید گھماؤ، موڑ اور پُرخطر راستوں کا دوسرا نام ہے —— ہر انسان کو ان موڑوں اور گھماؤ سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ بیچارہ مجبور ہے، بے بس ہے، لاچار ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اِن موڑوں سے بچ بچا کر منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں —— میری زندگی جو آج حسین ہے، کل تک اس میں نام کو بھی حسن نہ تھا۔ میں بھی زندگی کے سفر میں کئی خطرناک راستوں اور بہت سے نشیب و فراز سے گذر چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں کئی اور نشیب آئیں، بہت سے فراز آئیں۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی؟ یہ کون جانتا ہے؟ مجھے بھی نہیں معلوم۔ برساتی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور چلا گیا۔ گاڑی برابر بھاگ رہی تھی، دوڑ رہی تھی —— زندگی کی گاڑی کی طرح —— میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا —— موسم بہت پیارا اور شاعرانہ تھا، برکھا کے دن اور ساون کا مہینہ تھا، کالے، اُودے بادل اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ رہے تھے، پانی سے بھیگی ہوئی ہوائیں ناچتی پھر رہی تھیں اور ہرے ہرے گھنے پیڑ چپ چاپ سر جھکائے کھڑے تھے۔ اِدھر اُدھر جانور چر رہے تھے اور نالوں کے کنارے بگلے سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے —— پانی کے آثار تھے —— یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب بھولی بسری باتیں یاد آیا کرتی ہیں۔ جب کوئل کوکتی ہے، بگلے لمبی لمبی قطار بنا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑا کرتے ہیں، جب پانی برستا ہے، بجلی کوندتی اور گرجتی ہے، جب ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، جب گاؤں گاؤں جھولے پڑتے ہیں، جواں لڑکیاں لہک لہک کر ساون گاتی ہیں، جب عاشق کی آنکھیں ہر وقت آنسو بہاتی رہتی ہیں اور جب شاعر میٹھے میٹھے گیت لکھتے اور گاتے ہیں، جب لڑکیاں، ناریاں اپنے پریمیوں کو یاد کرکے کُڑھتی اور چھپ چھپ کر رویا کرتی ہیں —— وہی دن تھے —— مجھے بھی ایک بات یاد آرہی تھی، اپنی زندگی کی ایک ایسی بات جس کو میں کبھی نہ بھول سکوں گا —— ہاں کبھی نہیں۔ لوگ اپنی زندگی کا حسین واقعہ یا حادثہ کبھی نہیں بھولتے —— میری زندگی کا ایک حسین حادثہ ہے —— ایک خوبصورت سا واقعہ —— میری اُجاڑ اور سپاٹ زندگی کا ایک رنگین پس منظر —— میری زندگی کا ایک سدا بہار مسکراتا ہوا پھول —— بیٹھے بیٹھے میں نے ایک لمبی سانس لی اور سگرٹ پینے میں مشغول ہو گیا۔ گذرے ہوئے واقعات دماغ میں رقص کر رہے تھے اور ملکہ —— میرے پاس والی برتھ پر لیٹی سو رہی تھی —— حسنِ خوابیدہ۔ دوپٹہ ڈھلک کر نیچے گرنے کے قریب تھا، ہوا کے بار بار آنے سے ملکہ کے بال منتشر ہو گئے تھے۔ اور وہ بہت دھیرے دھیرے نرمی کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ سینے کا اُتار چڑھاؤ دریا کی ہلکی ہلکی موجوں سے مشابہ تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرا کھڑکی کے پاس۔ وہ سو رہی تھی۔ ابھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی، لیکن پھر اُسے نیند آگئی۔ اس معاملہ میں وہ بچہ ہے۔ ملکہ جتنی پیاری ہے اُس کی نیند بھی اتنی ہی پیاری ہے —— وہ خود ایک مجسّم پیار ہے —— زندگی کا ایک پیار —— ایک بوسہ —— ؟ میری نظریں ملکہ کا جائزہ لے رہی تھیں کہ یکایک اُس نے ایک لمبی سانس لی اور ایک ادھوری انگڑائی لے کر کروٹ لے لی۔ نہ جانے میں کیوں ہنسنے لگا —— اگر ملکہ مجھے اس طرح گھورتے ہوئے دیکھ لے تو بہت شرمائے گی، وہ بہت شرمیلی ہے۔ جب بھی میں نے اُسے گھورا وہ ہنس کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی اور کہتی ہے۔

آچار یہ جی کا اردو نشا دسر آنکھوں پر۔ لیکن اب کیا کیا جائے؟ حکومت ہماری اپنی ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی یہ کرے وہ گویا ہم کرتے ہیں۔ پس الجبرا، ریاضی، حساب، فلسفہ، منطق، غرض ہر چیز کی رو سے ثابت ہوا کہ اگر لوگ مصیبت میں ہیں تو قصور خود اُن کا ہے۔ اگر شرنارتھی بھوکے ننگے، بے سر و سامان ہیں تو یہ اُن کی خطا ہے۔ اگر بلند بانگ دعوؤں کے باوجود خویش نوازی، کنبہ پروری اور رشوت ستانی کا دور دورہ ہے تو غلطی ہم لوگوں کی ہے۔ اگر سرمایہ داروں کو چور بازار میں روپیہ کمانے کی کھلی آزادی ہے تو ایرادھی خود جنتا ہے، کیونکہ حکومت اپنی ہے۔ پس ما بخیر شما بسلامت۔ آگے حدِ ادب!

حیدرآباد کے "پولیس ایکشن" کے بعد جب نظام نے ہتھیار ڈال دیئے تو یوپی کی گورنر صاحبہ بلبلِ ہند شریمتی سروجنی نیڈو کو رضا کاروں کے لیڈر قاسم رضوی سے بھی زیادہ تکلیف ہوئی۔ اُنہوں نے اس بات پر بڑے ہی افسوس کا اظہار کیا کہ اُن کے مُلک یعنی حیدرآباد نے ہتھیار ڈال دیئے۔ گویا اُن کی خواہش یہ تھی کہ ہندوستانی فوجیں لیڈروں کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

جب آپ سے کہا گیا کہ آپ کا وطن ہندوستان ہے تو آپ نے فرمایا کہ میرا وطن سب سے پہلے حیدرآباد ہے پھر ہندوستان۔ مگر گذارش یہ ہے کہ جب حیدرآباد میں قیامت برپا تھی تو آپ یوپی کے گورنمنٹ ہاؤس میں کیوں بیٹھی رہیں؟ حیدرآباد جا کر اپنے پیارے ہم وطن رضا کاروں کے ہاتھوں اپنا خاص قسم کا استقبال کیوں نہ کرایا؟

ایک اور بیان میں شریمتی جی نے نظام کو عید مبارک کہتے ہوئے جبلیا کو ڈومینین کا درجہ بھی دے دیا۔ گویا آپ کے خیال میں لائق علی وزارت اور قاسم رضوی کا آزادیٔ حیدرآباد کا دعوےٰ درست تھا اور پنڈت نہرو کی حکومت جھک مار رہی تھی۔ اب اس سے آگے کوئی کیا کہے ـــ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ مگر ذرا عقل اور تمیز سے بات کیا کریں ورنہ دُنیا یہی کہے گی کہ اُونٹ بڈھا ہو گیا مُوتنا نہ آیا۔

خوشتر گرامی کے نام!

از

جناب ایم اسلم

ملک کے نامور افسانہ نگار حضرت ایم اسلم دُنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ایک مسلّمہ ادیب کی حیثیت میں پاکستان اور ہندوستان کو آپ کی ذات پر بجا طور پر فخر و ناز ہے۔ آپ بہت دردمند اور پُر خلوص انسان ہیں۔ ذیل کی نظم موصوف ہی کے پروازِ تخیّل نے خاکسار مدیر "بیسویں صدی" کے نام خط کی شکل میں پیش کی ہے۔ اس میں بے تکلّفی اور بے ساختگی تو ہے ہی، نظم کا ایک ایک شعر آپ کے دِلی جذبات و تاثرات کا آئینہ دار بھی ہے۔

زندگانی کا کیا مزا ہے اگر دِل نہیں درد آشنا اے دوست!

اس شعر میں آپ نے وہ فلسفۂ حیات پیش کیا ہے جس پر ہر بنی نوعِ انسان کو کاربند ہونا چاہیئے۔ اے کاش اہلِ وطن اس زرّیں نظریہ کو سمجھیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ (ایڈیٹر)

یہ گھٹائیں یہ بدلیاں غم کی — مجھ کو تیرا ہے آسرا اے دوست!
لُوٹتے ہیں چمن چمن والے — کیا کہوں تجھ سے ماجرا اے دوست!
سارے عالم کا رنگ ہے پھیکا — صرف تجھ سے نہیں گِلا اے دوست!
زندگانی کا کیا مزا ہے اگر — دِل نہیں درد آشنا اے دوست!
دوریٔ راہ کا گِلہ کیسا — دِل سے دِل تو نہیں جدا اے دوست!

ایک تو ہی نہیں ہے وقفِ فغاں
میں بھی ہوں تیرا ہمنوا اے دوست!

تیر و نشتر

از خوشتر گرامی

پوربی پنجاب کی اسمبلی میں سرکاری اعداد و شمار سے انکشاف ہوا کہ وزیر صاحبان کے لئے شملہ کی کوٹھیوں میں جو فرنیچر مہیا کیا گیا اُس پر ۶۵ ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ اور چار ماہ کے عرصے میں ان حضرات کا سفر خرچ ۳۵۰۱۵ روپے بنا۔

کیوں نہ ہو۔ سب کے سب گاندھی بھگت ہیں! بالکل تیاگ مورتی! پرماتما ہمارے ملک کو ان پاکھنڈی کانگرسیوں سے محفوظ رکھے۔ پھر انہیں پبلک جلسوں میں یہ کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی کہ ہم تو ملک اور قوم کے نشکام سیوک ہیں۔

ایک جنتری کے اشتہار کا عنوان ہے "۱۹۴۹ء میں کیا ہوگا؟" لو سنو ہم بتائے دیتے ہیں۔ شرنارتھی بالکل تباہ ہو جائیں گے اور اس طرح شرنارتھیوں کی بحالی کے وزیر صاحب کو بڑے فخر سے یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ہم نے شرنارتھیوں کا مسئلہ حل کر ڈالا۔ ملک میں بے کاری اور بے چینی کا دور دورہ ہوگا۔ کنبہ پروری اور رشوت ستانی اور بھی بڑھ جائے گی۔ سرمایہ داروں کو کانگرسی وزرا کے زیر سایہ بلیک مارکیٹ کی کھلی چھٹی ہوگی۔ اکثر وزیر گاندھی جی کے اصولوں کی رٹ لگائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عمل سے ان اصولوں کی مٹی پلید کرتے جائیں گے۔ وزارتوں کے لئے رسہ کشی، مختلف بہانوں سے بڑی بڑی تنخواہوں کی وصولی، عوام الناس کی تباہی، اہل حکومت اور ان کے منظور نظر لوگوں کے وارے نیارے ——— ہندوستان میں تو یہی کچھ ہوگا۔ باقی ملکوں کی خدا جانے۔

پوربی پنجاب کے پردھان منتری نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مغربی پنجاب کے ساتھ قیدیوں کا تبادلہ تو ختم ہو گیا اب صرف پاگلوں کا تبادلہ باقی ہے جو لاہور کے پاگل خانے میں پڑے ہیں۔

خدا جانے ان کی تعداد کیا ہے؟ ہمارے حصے میں کتنے پاگل آئیں گے۔ لیکن حالات و واقعات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حصے میں پہلے ہی بے شمار پاگل آچکے ہیں۔ پوربی پنجاب کی وزارت کے کارناموں کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے یا انفرادی حیثیت سے۔ بہرصورت ایں [illegible] تمام آفتاب است کا معاملہ نظر آتا ہے۔ خدا کرے لاہور کے پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر احمد شفیع صاحب پی سی ایم ایس ہی ترس کھا کر پوربی پنجاب کو پاگلوں کی زیادہ تعداد عطا نہ فرمائیں۔ ورنہ سارا صوبہ پاگل خانہ ہو کے رہ جائے گا

حیدرآباد میں مسٹر شعیب اللہ ایڈیٹر "امروز" کے قتل کے مقدمہ کی سماعت کے دوران وعدہ معاف گواہ عبد النعیم خان نے انکشاف کیا کہ [illegible] انجمن اتحاد المسلمین نے ہلاک کروایا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک دن مجھے رضاکاروں کے ہیڈ کوارٹر میں بلا کر ہاتھ میں قرآن دیا گیا اور یہ حلف لی گئی کہ میں اسے قتل کروں۔

گویا کہ

شریفوں کو شیطان بہکا رہا تھا
محمد کے پیغام کا نام لے کر

خدا جانے فرقہ پرست بدمعاشوں نے کتنے موقعوں پر وید مقدس قرآن شریف اور گرنتھ صاحب سے یہی کام لیا۔

بنارس کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے آچاریہ کرپلانی نے فرمایا: "جب تک گاندھی جی کے اصولوں پر مکمل طور پر عمل نہ ہوگا، کوئی بھی حکومت لوگوں کے مصائب کم نہیں کر سکتی۔ آزادی ملنے پر بھی ہمارے ملک کی حالت اس قیدی کی سی ہے جس کی بیڑیاں اتار دی گئی ہوں، لیکن وہ جسمانی کمزوری کے باعث جیل سے باہر نہ جا سکتا ہو۔"

"بیسویں صدی" دہلی کا افسانہ نمبر اور سالنامہ ۱۹۴۹ء

بالکل مُفت حاصل کیجئے

جو خریدار سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپیہ بھیجتے وقت سوا دو روپیہ رجسٹری خرچ (سال بھر کے بارہ پرچوں کے لئے بحساب تین آنے فی پرچہ) بھیج دیں گے یا رسالہ بذریعہ وی پی بھیجنے کی اجازت دیں گے، انہیں افسانہ نمبر ۱۹۴۸ء قیمتی ایک روپیہ بالکل مفت دیا جائے گا اور اسے ہم اپنے خرچ پر بذریعہ رجسٹری بھیجیں گے اور سالنامہ ۱۹۴۹ء قیمتی ڈیڑھ روپیہ بھی اِسی قیمت میں دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر ڈھائی روپیہ قیمت کے خاص نمبر تو آپ کو اسی وقت مل جائیں گے اور بقیہ ڈھائی روپیہ میں سال بھر کے عام نمبر ملیں گے۔ آج ہی سوا سات روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر یا وی پی بھیجنے کی اجازت دے کر اِس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں۔

خط وکتابت کرنے یا منی آرڈر بھیجنے کا پتہ:۔ رسالہ "بیسویں صدی" دہلی

رجسٹری خرچ بھیجنے میں آپ کا فائدہ ہے رسالہ ڈاک کے ڈاکوؤں سے محفوظ رہے گا

سال بھر کے عام پرچوں کے علاوہ دو خاص نمبر بھی آپ کو صحیح سلامت ملیں گے

ہندوستان بھر کے رسائل میں "بیسویں صدی" کو غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ بلاشبہ "بیسویں صدی" سب سے زیادہ چھپتا ہے اور سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اِس مقبولیت کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ڈاک خانہ کے بددیانت کارکن ہر مہینے "بیسویں صدی" کی سینکڑوں کاپیاں چوری کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے خریداروں کو شدید پریشانی ہوتی ہے۔ اگر آپ سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپیہ کے ساتھ سوا دو روپے رجسٹری خرچ (سال بھر کے بارہ پرچوں کے لئے بحساب تین آنے فی پرچہ باوجودیکہ محکمہ ڈاک چار آنہ فی پرچہ چارج کرتا ہے) بھیج دیں گے تو آپ کو ہمیشہ رسالہ بذریعہ رجسٹری پہنچا کرے گا۔ اور ڈاک کے ڈاکو راستے میں آپ کا پرچہ ہضم نہیں کر سکیں گے۔ آپ سوا دو روپیہ رجسٹری خرچ ضرور بھیجئے۔ اس میں آپ کا سراسر فائدہ ہے۔ رسالہ نہ پہنچنے کی آپ کو کبھی شکایت نہ ہوگی۔ سال بھر کے عام پرچوں کے علاوہ خاص نمبر بھی آپ کو صحیح سلامت ملیں گے۔ آپ کی ذاتِ گرامی سے توقع ہے کہ آپ سوا سات روپیہ (سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپے، رجسٹری خرچ سوا دو روپیہ) بذریعہ منی آرڈر بھیج کر یا رسالہ بذریعہ وی پی بھیجنے کی اجازت دے کر رسالہ کی سرپرستی قبول فرمائیں گے +

خط وکتابت کرنے یا منی آرڈر بھیجنے کا پتہ —— رسالہ "بیسویں صدی" دہلی